دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

سب رنگ

ڈائجسٹ

A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم
PakistaniPoint
Aik Rabta Apnon Sey

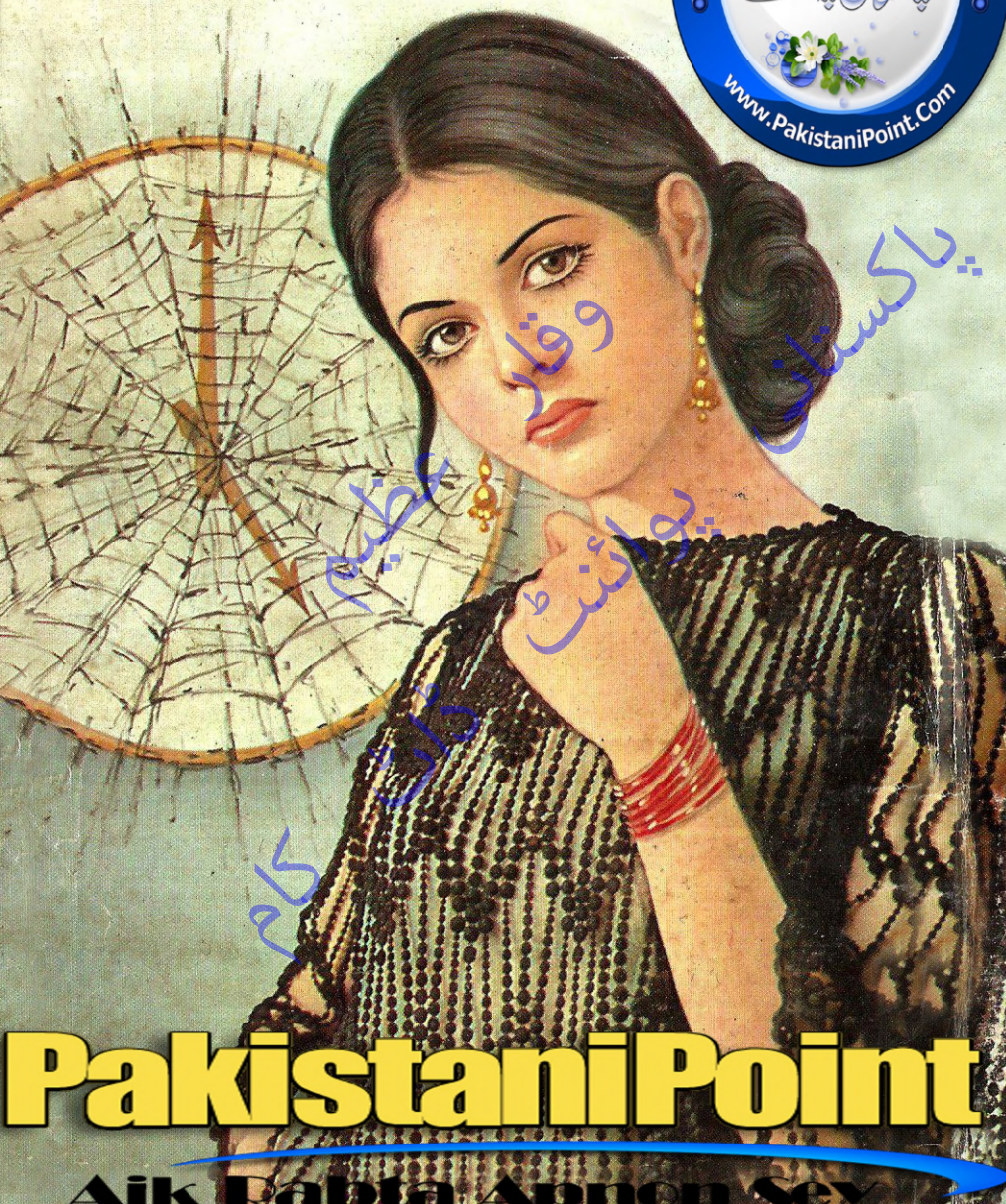

پاکستانی وقار عظیم ڈاٹ کام

صفحہ	مصنف	عنوان	تعارف
۹	ادارہ	التجا	
۱۱	شکیل عادل زادہ	ذاتی صفحہ	
۱۲	قمر اجنالوی	بیاہی بدیس	ایک دوشیزہ کی عبرت انگیز سرگزشت، تاریخ کی کہانی، کتابوں کی زبانی اُسے بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر اُس کے حُسن کا شہرہ دُور دُور تھا
۳۰	احمد ندیم قاسمی	چور	سب رنگ کی منتخب کہانیاں اُردو ادب کا عطر ہیں اِس ماہ کے لیے اُردو کی یادگار کہانی اُردو کے مایۂ ناز افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی ایک نشتر تحریر
۳۶	ش۔ م۔ جمیل	در معقولات	ایک دیدہ دلیر شخص کی کہانی، شوخ، شگفتہ اس موضوع پر آپ نے جتنی تحریریں پڑھی ہیں، یہ اُن میں سب سے مختلف ہے
۴۷	ابوالمنصور سرمدی	حضرت صاحب	کالی دُنیا کی سفید باتیں آغا محمدؒ سوانح، کرامتیں
۵۸	جابر زمان خان	بازی گر	سب رنگ کی تمام روایتوں کے ساتھ ایک نیا سلسلہ آپ بیتی جگ بیتی
۸۳	اظہر کلیم	شام ڈھلے	دُنیا بھر سے اِدھر اُدھر سے پانچ مختصر، نیم مختصر کہانیاں چوری کا دلچسپ واقعہ، مغرب سے تازہ تر، ایک جادو اثر ایجاد کی کہانی
۸۶	وسیلہ خاتون	برسرِ زمیں	اُس شخص کا دل بہت کمزور تھا مسٹر کونٹ کی رُوداد جن سے آپ کی روز ملاقات ہوتی ہے
۹۱	نرگس جمیل	چھو منتر	جادو کی نئی داستان، ایک تحریری کارٹون ازراہِ کرم اس بدنصیب شوہر کی مدد کیجیے
۹۳	ایم تسنیم اختر	ہمّتِ پیراں	نوجوانوں کے لیے ایک بوڑھی عورت کا فسانۂ عبرت اس کہانی میں بہت سوں کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے
۹۵	تفسیر فاروقی	شہر کا رُخ	ایک عورت کی کہانی، عیب جُوئی جس کا مشغلہ تھا عالمی شہرت یافتہ ادیب سی بی گلفورڈ کے قلم سے
۱۰۲	منیر جمشید عالم	امبر بیل	سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ ایک نوجوان کی زندگی کے عجیب غریب واقعات
۱۳۶	ابوالفضل صدیقی	خونی	خوش ذوق قارئین کے لیے اس ماہ کی خاص کہانی

پبلشر ایڈیٹر شکیل عادل زادہ نے حسین زبیری کے اہتمام میں پاکستان ہیرالڈ پریس سے چھپوا کر (؟) سے شائع کیا۔ پتہ: ۴۷-۴۰ پریس چیمبرز، آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ دہلی دفتر: لطیف ہاؤس
کرشن پروڈکشن، شمارہ ۰، جلد ۰، فی پرچہ تین روپے۔ زرِ سالانہ ۳۶ روپے۔ سرورق ... فون نمبر ۲۱۱۹۴۴-۲۱۱۹۶۱ تار کا پتہ سب رنگ • رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

Jamalco

عوامی رعایتی سیل

KARIMPLENE

Sofeene

جمالکو

آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

نئے عہد کا نیا لباس

ڈبل نیٹ کریپلین

سوفینی

نہایت مناسب قیمتوں میں

ہر جمعہ کو ایک بجے تک سوفینی کٹ پیس کی سیل رعایتی داموں پر ہوتی ہے

Jamalco

کراچی میں سوفینی کی رعایتی سیل کا واحد مرکز

جمالکو

عیدگاہ کلاتھ مارکیٹ

ایم اے جناح روڈ کراچی

فون
212659

پاکستانی وقار عظیم پوائنٹ ڈاٹ کام

التجا

کوئی کالا ہے، کوئی گورا ہے، کوئی پیلا ہے، کوئی چھوٹا ہے، کوئی لمبا ہے، کوئی اندھا ہے، کوئی لولا ہے۔ کسی کے چہرے پر داغ ہیں، کوئی اتنا مہ جمال ہے کہ آنکھوں کے لیے سُرمہ بنا ہوا ہے، کوئی گل بدن ہے، کوئی پیل تن، کسی کے پسینے سے خوشبو آتی ہے، کسی کے پاس بیٹھا نہیں جاتا، کوئی توانا ہے، کوئی ناتواں، کوئی عورت ہے، کوئی مرد، کوئی بوڑھا ہے، کوئی جوان، کوئی سُست ہے، کوئی تیز، کوئی ذہین ہے، کسی کی سمجھ میں سامنے کی بات نہیں آتی۔ رنگ مختلف ہیں، پھول مختلف۔ کائنات رنگا رنگ مظاہر کا عجائب خانہ ہے۔ کسی کو نیلا رنگ پسند ہے، کسی کو سرخ، کسی کو ہرا، کسی کو کالا۔ کسی کو گلاب کا پھول مستانہ کر دیتا ہے، کسی کو چنبیلی کی بو مدہوش کر دیتی ہے، کوئی جوہی کی نازکی کا دیوانہ ہے، کوئی نرگس کا عاشق۔ کسی کو میر کے تراشے ہوئے ہونٹ پسند ہیں، کوئی جدید عہد کے گداز ہونٹوں پر فریفتہ ہے کہ وہ محسوس تو ہوتے ہیں۔ کسی کو کتابی چہرہ پسند ہے، کسی کو بیضوی، کسی کی نظروں کو شہابی، کسی کو گلابی، کسی کو سرمئی، کسی کو گندمی رنگ کے بدن بھاتے ہیں، جسے دیکھیے اپنا پیمانہ ساتھ لیے پھرتا ہے۔

اعتراض یہ ہے کہ طبعی طور پر اتنے مختلف لوگوں کے درمیان مساوات کیسے قائم ہو؟ ہمیشہ خوب صورت، بلند قامت، توانا لوگ آگے آجائیں گے، جو کم زور ہیں وہ زندگی کی دوڑ میں اتنی سرگرمی سے حصہ نہیں لے سکتے جتنے توانا لوگ۔ جسمانی توانائی ہجوم میں نمایاں کرتی ہے اور یہی دولت کا سبب بن جاتی ہے اور دولت ایک ایسا سود ہے جو مزید سود کھینچ کے لاتی ہے۔ سود در سود توانائی کے اس عمل نے ایسی ترقی کی کہ سرمائے نے طبعی توانائی پر فوقیت حاصل کر لی کیونکہ طبعی توانائی محدود ہے، سرمائے کی لامحدود۔ ورزش، احتیاط، علم اور اچھی غذا سے طبعی توانائی ضرور بڑھائی جا سکتی ہے مگر ایک حد تک۔ سرمایہ ایک بار ہاتھ آجائے اور ذرا سی شطرنج کھیل لی جائے تو توانائی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ اس لیے ناتوانوں نے ایک نعرہ ایجاد کیا، مساوات کا، اور دُنیا دو خانوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک نعرہ لگانے والے، ایک نعرہ سننے والے۔ اس نعرے نے ایسا زور باندھا کہ دنیا کو لرزا کے رکھ دیا۔ اکثریت نعرہ لگانے والوں کی تھی تاہم مساوات قائم نہیں ہوئی کیونکہ سرمائے نے منطق کی بہت سی کتابیں بنا لی تھیں۔ دلیلوں کی ایک دیوار کھڑی کر دی گئی۔ کہا گیا کہ مقابلہ زندگی کی رفتار تیز کرتا ہے اور جو بلند و بالا ہے، جس کے پیروں میں طاقت، آنکھوں میں تیز بینائی اور سر میں عمدہ مغز موجود ہے، وہ اس خرابے میں خود ابھر کے سامنے آجاتا ہے، کسی کو کسی نے نہیں روکا، ہر شخص اپنے فیصلے خود کرنے کا مختار ہے۔ مثالیں موجود ہیں، کل جو لوگ دانے دانے کو ترستے تھے، آج وہ عالی شان ایوانوں میں جلوہ افروز ہیں۔ اُن میں کالے بھی ہیں، ناٹے بھی اور بدصورت بھی۔

تمام باتیں تسلیم، بلاشبہ جو لوگ آگے بڑھ گئے ہیں، اُن میں دوسروں سے مختلف کوئی خوبی ضرور ہو گی۔ باغ میں ثمر بار درخت سب سے زیادہ توجہ مبذول کر لیتا ہے، اُس کی قیمت بھی زیادہ لگتی ہے۔ ثمر بار انسان بھی دنیا کے باغ کی آبرو ہیں۔ انھیں مناسب وقت پہ پانی دینے اور اُن کا ہر طرح خیال رکھنے کی ضرورت ہے مگر درختوں اور انسانوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ معاشرہ درختوں کا نہیں، انسانوں کا ہے۔ جو ناتواں ہیں انھیں ناتوانی کی اذیت ناک سزا دینے کے بجائے ختم ہی کیوں نہ کر دیا جائے؟ جیسا کہ اگلے وقتوں میں ہوتا تھا۔ ایک معمولی سے انصاف کی درخواست ہے کہ اس فیصلے کا اطلاق اُن پر بھی ہونا چاہیے جو اپنی جسمانی توانائی کھو چکے ہیں اور زندگی کی گاڑی سرمائے کے گھوڑے سے چلا رہے ہیں۔ بات صاف ہے، شاید واضح ہو گئی ہو گی۔ مدعا یہ تھا کہ کس کے پاس وہ ترازو چھپی ہوئی ہے جس نے طبعی صلاحیتیں اور خوبیاں تول کے سرمائے کی تقسیم کی۔ حسین لوگوں کے دل کش منظر اور ذہین لوگوں کی پرستش سے کون کافر انکاری ہے تاہم انسانوں انسانوں کے درمیان جو تضاد ہے، کیا سرمائے میں بھی اس توازن سے تضاد ہے؟ اصل میں مساوات کی اصطلاح کا وہ مقصد نہیں جس پہ دلیلیں تراش لی گئی ہیں، اس کا مطلب ہے: توازن، تناسب، سماجی انصاف۔ ایک رحم دل معاشرہ جس میں ناتوانوں کی پرورش بھی اسی انداز میں ہو جس طرح بچوں کی گھر میں کی جاتی ہے حالانکہ وہ مقابلے کی طاقت سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔ اس سے مراد وہ ضمانت ہے جو کمزوروں کو زندہ رہنے کے لیے گزر اوقات کے لیے دے دی جائے چاہے اُن پر حکم طاقت وروں کا نافذ ہوتا ہے۔ زیادہ بڑا مطالبہ نہیں ہے۔ مراتب اور حفظ مراتب کے معاملات میں دخل نہیں دیا جا رہا ہے۔ جو سر بلند ہیں، وہ دور سے نظر آئیں گے۔ اتنی سی بات ہے، جو چہرے اچھے ہیں اُن کے دل بھی اچھے ہونے کی توقع ہے۔ پسند اپنی اپنی جگہ ہے۔ نیلا رنگ پسند کیجیے، پیلا کیجیے۔ مگر سرخ سے نفرت تو نہ کیجیے۔

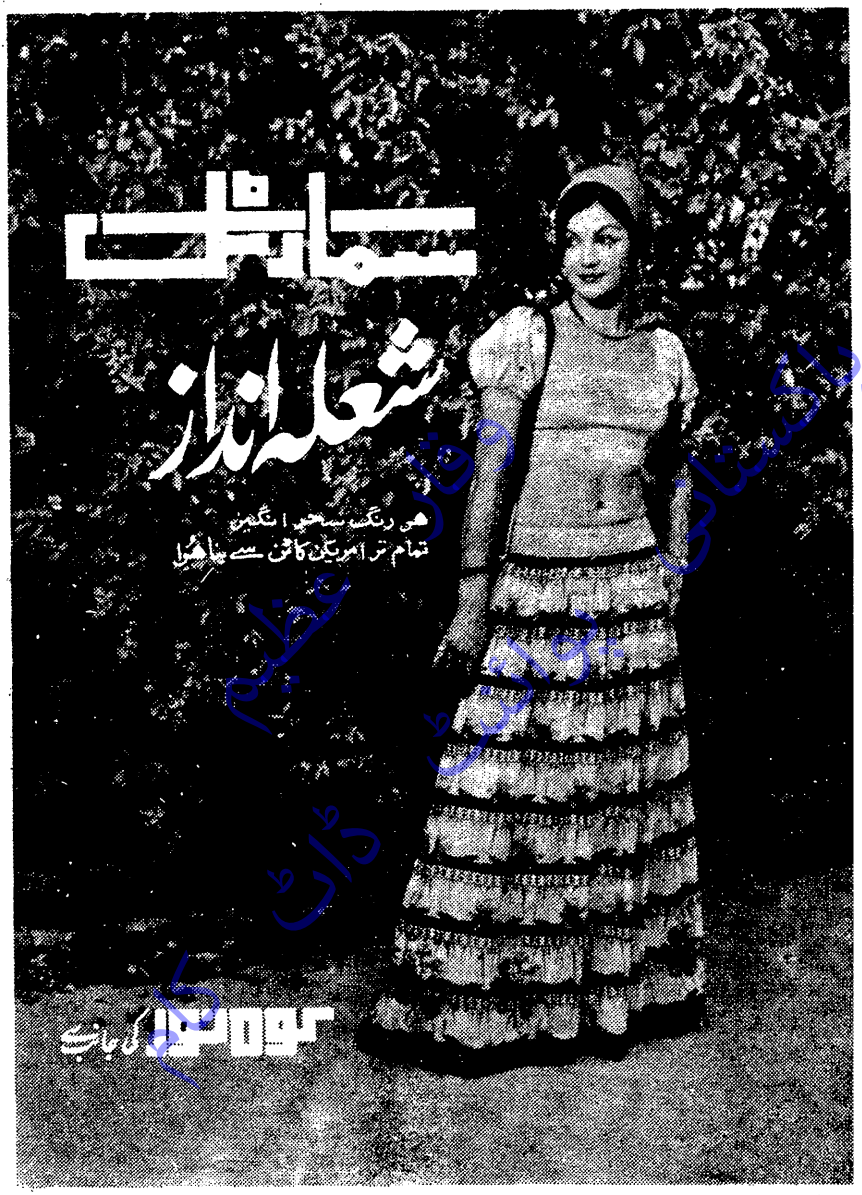

KIL (S) 2 75

SCOM

لیجیے، ٹھیک ایک ماہ بعد میں آپ کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں۔ یہ تاخیر نہیں ہے، میں نے عرض کیا تھا کہ تاخیر تو تین چار ماہ پہلے ہوئی تھی اس کے بعد سے تو میں تواتر سے آرہا ہوں، وہ پُرانا قرض ہے جس کی ادائی بتدریج ممکن ہے۔ ایمان داری کی کمائی سے یک مشت یہ واجبات ادا نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے درخواست ہے کہ جہاں اتنے دنوں صبر کیا ہے، وہاں کچھ اور توقف فرمائیے، جیسے ہی حالات بہتر ہوئے اور کچھ پس انداز کرنے پر قادر ہوگیا تو شکایت کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ آپ کو میری ابتری اور دیوانگی کا پورا علم ہے، کوئی پردہ تو درمیان میں نہیں ہے۔ جب بہت عسرت کا زمانہ تھا تو بھی آپ کو سب معلوم تھا۔ پہلے بھی میرا یہی مشغلہ، یہی شب و روز اور دن کے یہی چوبیس گھنٹے تھے لیکن تب اور اب میں زمین و آسمان کا فرق ہے، تب ذمے داریاں اتنی محسوس نہیں ہوتی تھیں۔ وہ شروع کے دن تھے، یہ تھوڑے بہت آداب بھی نہیں آتے تھے، نہ آپ سے اس قدر ربط کا یقین حاصل تھا اور نہ آپ کی کبیدگی کا اتنا خوف۔ ساڑھے پانچ سال کی مدت ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب آنے کے لیے خاصی ہوتی ہے، اب دونوں کو ایک دوسرے سے غیر معمولی تعلقِ خاطر کا اعتماد ضرور حاصل ہے۔ یہ اسی اعتماد کا نتیجہ ہے کہ مجھے دیر سے آنے پر آپ کی ناراضی کا خوف نہیں ہوتا، یہ خیال آتا ہے کہ پہنچیں گے تو منا ہی لیں گے، کہہ دیں گے کہ آپ ہی کے کام میں دیر ہوگئی۔ اب ایسا بھی کیا ہے، ورنہ کون محبتوں کا نقصان کرتا ہے۔ تعلق قائم کرنے میں ایک عمر لگ جاتی ہے اور ایک ذرا سی لغزش سے ساری عمر کا ریاض دھواں ہو جاتا ہے، لوگ آپ کے خوف سے بھاگم بھاگ آتے ہیں، مجھے ایک دوسرا ہی خوف ستاتا رہتا ہے کہ حاضری لگانے کی رسم تو ادا ہو جائے گی، تنخواہ بھی مل جائے گی مگر خوش دلی کی ایک کیفیت میرے آپ کے درمیان نہیں رہے گی۔ وہ کیفیت جس کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک بات ہوتی ہے، پتہ نہیں اُسے کیا کہتے ہیں۔

بہر حال آپ سمجھ رہے ہوں گے، مجھے یہی فکر کھائے رہتی ہے۔ ساڑھے پانچ برسوں میں میرے خلاف کیا کیا شکایتیں آپ سے نہیں کی گئیں۔ خوب کان بھرے گئے لیکن کوئی بھی میرا اور آپ کے رابطۂ خاص میں رخنہ انداز نہیں ہوسکا۔ قتل کی سزا چونکہ موت ہوتی ہے اس لیے لوگوں نے ایک یہی کام نہیں کیا۔ اِدھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ حرفِ ملامت تو دُور کی بات ہے، حرفِ شکایت بھی شاذ ہی لبِ زبان پر آیا۔ میں نے اپنا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا تھا اور چھوڑ دیا ہے۔

میرے اور آپ کے قاصد، نامہ بر، ایجنٹ حضرات کچھ کہ لگاتے ہیں کہ دیر سے آنے میں آپ کا التفات متاثر ہوگا، کوئی کہتا ہے کہ یہ ناقابلِ برداشت غفلت ہے، کسی کا کہنا ہے کہ عُذر بہت دنوں تک نہیں چلیں گے، کسی کا ارشاد ہے کہ اب مزاج کچھ نازک ہوگیا ہے، چھینکیں آنے لگی ہیں۔ اِن میں کتنی خواہشیں ہیں، کتنی حسرتیں ہیں، کتنی دردمندی ہے، انھیں آسانی سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے مگر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ لوگ اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ تاخیر کوئی بنیادی کوتاہی نہیں ہے، انتظار اتنا بڑا کرب نہیں جتنا بڑا کرب محبوب کی بدلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ہوتا ہے، اُس کے چہرے پر زردی، اُس کے اظہار میں جھجک، اُس کے تیوروں میں اجنبیت دیکھ کے ہوتا ہے۔ یہاں تو خدا ہی سپردگی کا ہے، عشق کا ہے اور بَرملا ہے، سرِ عام ہے، اس میں کوئی زردی، جھجک اور آلودگی نہیں۔

اور جب یہ معاملہ ہو تو کون اِدھر اُدھر کی سنتا ہے، کون اندیشہ ہائے دُور دراز کی فکر کرتا ہے، عشق سے بڑی طمانیت کوئی نہیں کہ اس سے بڑی صداقت کوئی نہیں۔ سارا اثر اسی کا، سارا کرشمہ اسی جادو کا ہے، کیسے دلچسپ ہیں وہ لوگ جو اپنی زبان اور اپنا وقت خراب کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مجھے اُن کے پتھر شمار کرنے کی فرصت ہوگی۔ عشق تو ہر جانب سے ایک مکمل انقطاع اور ایک نقطے پر مکمل ارتکاز ہے۔ عاشق کو تو اُس کے گھر میں برداشت نہیں کیا جاتا، جسے اپنی سماجی وابستگیوں کی فکر رہتی ہے، وہ شخص سماج کو بہت مرغوب ہوتا ہے، عشق تو ہمیشہ سے ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ پس مجھے کیا شکایت ہوگی کہ میرا نمبر تو بہت بعد میں آتا ہے۔ مجھ سے پہلے لہولہان لوگوں کی ایک بڑی تاریخ ہے اور آئندہ لکھی جانے والی تاریخ میں میرا ذکر بھی نہیں ہوگا کہ میں تو ایک پرچھائیں ہوں۔ کاش مجھ میں تمام صفات جمع ہوجائیں۔

ایسی باتیں کرنے کے بعد کچھ اور باتیں اچھی نہیں لگتیں حالانکہ بہت کچھ کہنے کا ارادہ تھا، ارادہ تھا کہ سب رنگ کے انتخاب کی کدو کاوش کا ذکر کروں گا۔ اس یادگار نشست کا حال سناؤں گا جو جناب احمد ندیم قاسمی کے اعزاز میں غریب خانے پر منعقد ہوئی تھی اور اُس میں ایک طرح دار شاعرہ نے سب کو چونکا دیا تھا۔ بہت دلچسپ نوک جھونک ہوئی تھی۔ پھر حکومت کے سمندر کا شکوہ کروں گا کہ ہمیں تو قطرہ بھی نہیں ملتا۔ گزشتہ مہینے مدیر اور قاری کے درمیان فاصلے کی جو اہم بات ادھوری رہ گئی تھی، اُس کی وضاحت کروں گا، کچھ اُردو صحافت اور ادب کی چار دیواری پر گفتگو کرنے کو جی چاہتا تھا، تاہم ابھی تو میری عمر خاصی پڑی ہے، ممکن ہے اگلے مہینے جلد ملاقات ہوجائے، غیب کا علم صرف خدا کو ہے۔ عاشق کا کام صرف جستجو کرنا ہے، یہ جستجو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

نیا شمارہ اسی جستجو کا غماز ہے، سمندر سے جو کچھ دریافت ہوا، نذر ہے، شاید پسندِ خاطر ہو۔

احقر العباد شکیل عادل زادہ عفی عنہ

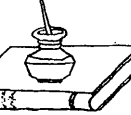

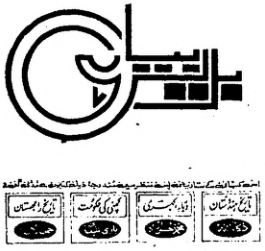

قمر اجنالوی

پیاسی روح

تاریخ ہندوستان | دیارِ ہندی | کمپنی کی حکومت | تاریخ راجستان

راجپوتانے کا آسمان آفتاب کی تمازت سے گرم اور گرد و غبار سے گدلا رہتا تھا۔ آفتاب غروب ہونے کا منظر بھی عجیب دل فریب تھا۔ شفق کے ایسے خوں رنگ نظارے پنجاب یا اودھ میں نظر آیا کرتے ہیں۔

سورج افق پر سرخیاں بکھیرتا ہوا رخصت ہو رہا تھا۔ شام بہت حسین اور رنگین تھی۔ خوب رو اور تنومند نوجوان بلرام کے دل میں بھی شفق کا سماں تھا۔ محبت اُس کے سینے میں شعلے بھڑکائے ہوئے تھی۔

وہ راج کماری کرشنو سے ملنے کے لیے راج پوری سے اُدے پور آتا تھا۔ گل بدن کرشنو کی منگنی جودھ پور کے ادھیڑ عمر راجا بھیم سین سے ہو چکی تھی اور اُس کا حسن پورے راجستھان میں چاندنی کی طرح چھٹکا ہوا تھا۔ بلرام کو خوب معلوم تھا کہ وہ ایک خطرناک بازی کھیل رہا ہے اور اگر یہ راز افشا ہو گیا تو اُدے پور کی بے شمار تلواریں اُسے چھلنی کر کے رکھ دیں گی۔ وہ اس انجام کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ محبت نے ڈرنا نہیں سیکھا، صرف زندہ رہنا یا مرنا سیکھا ہے۔

راج کماری کرشنو راجستھان کا سب سے دمکتا ہوا ستارہ اور سب سے مہکتا ہوا پھول تھی۔ اُسے رجواڑوں کے پرانے دستور اور اُن کی سیاسی اغراض کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ پھٹ پڑنے والی جوانی کی ابتدا تھی مگر اُس پر مصلحت کا خول منڈھ دیا گیا تھا۔ اُس کا بے مثال حسن مجبوریوں اور خاندانی روایات کی اونچی دیواروں میں محصور کر دیا گیا تھا۔ کوئی نامحرم اُس کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن کرشنو یہ دیواریں پھاند کر چند لمحوں کے لیے سہی، اپنے محبوب، اپنے پاگل سے ملنے ضرور آ جاتی تھی۔ پاگل نے اپنی تلوار بلند کر کے قسم کھائی تھی کہ وہ اُسے راجا بھیم سین کی ہوس کا شکار نہیں ہونے دے گا حالانکہ راجا نے منگنی کے موقع پر کرشنو کو سُرخ یاقوت کی انگوٹھی پہنائی تھی۔

کرشنو اور بلرام ایک حسین و رنگین خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ خواب جودھ پور کے راجا کو خون میں غسل دیے بغیر معرضِ تعبیر میں نہیں آ سکتا تھا مگر محبت مستقبل کے خطروں سے بے نیاز تھی۔ بلرام ہر پہلی تاریخ کو پہاڑی گھاٹیوں اور ندی نالوں کی سرزمین اُدے پور میں داخل ہوتا تھا۔ اُس کے سرکش اور برق رفتار گھوڑے کی ٹاپیں راج کماری کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتی تھیں۔ وہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے وادی میں پہنچ جاتی تھی۔ اگرچہ اُن کی ہر ملاقات میں مستقبل کے خطرے دھڑکتے تھے لیکن آج کی ملاقات ایک مختلف ماحول میں ہو رہی تھی۔ بلرام معمول سے کہیں زیادہ مسرور تھا کیونکہ اُس کی مطلوب کا طالب اُس کے راستے سے خود بخود ہٹ گیا تھا۔ راجا بھیم سین اچانک مر گیا تھا۔ شفق کی سرخیوں میں بھی تمناؤں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ بلرام نے اپنی کرشنو، اپنی گلاب پر ایک نظر ڈالی پھر افق کی طرف ہاتھ لہرایا۔ "کرشنو! دیکھو۔ زمین آکاش سے گلے مل رہی ہے۔"

راج کماری کے عارضوں پر آگ دہکی ہوئی تھی۔ اُس کے سر پر سیاہ دوپٹا تھا۔ اُس نے آسمان کی سرخیوں اور سیاہیوں کا امتزاج دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔ "بلرام! جب زمین اور آکاش گلے ملتے ہیں تو شام ہو جاتی ہے۔"

"گویا راج کماری آج بھی اُداس ہیں؟" بلرام افسردگی سے بولا۔ اُس نے کرشنو کا سیاہ دوپٹا دیکھا۔ "راج کماری نے ماتمی لباس زیب تن فرمایا ہے۔ خوب! غالباً جودھ پور کے ظالم راجا کا سوگ منایا جا رہا ہے؟"

راج کماری کے ہونٹ کپکپائے۔ "بلرام! ہمیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ کاش ہم ایک عام لڑکی ہوتے۔" اُس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"ارے ارے یہ کیا؟ تم رو رہی ہو؟" بلرام گھبرا گیا۔ "راج کماری رو رہی ہے، تمھیں خوش ہونا چاہیے کرشنو!" اُس نے پیار سے کرشنو کا چہرہ کھولا۔ "راجا بھیم سین مر چکا ہے کرشنو! راجا بھیم سین مر گیا ہے۔ تمھاری آرزو پوری ہو گئی۔ اب تم ایک عام لڑکی ہو اور میں ایک راج کمار ہوں۔ اب میرے اور تمھارے درمیان کوئی تخت حائل نہیں رہا۔"

راج کماری کے یاقوتی ہونٹوں پر تبسم نے رقص شروع کیا۔ "بلرام! دیکھو، ہم نے منگنی کی انگوٹھی اُتار دی ہے۔ تم ہمارے لباس پر نہ جاؤ، ہمارے دل کی آواز سنو۔ یہ دل صرف تمھارے لیے دھڑکتا ہے۔"

"کرشنو! بلرام جانتا ہے کہ تمھارا دل صرف اُس کے لیے محفوظ ہے مگر تمھاری آنکھوں میں یہ گھٹائیں کیوں ہے؟ یہ تو تمھارے لہلہانے کا وقت ہے۔ میں جھومتا

WILAYAT

چاہتا ہوں، ناچنا چاہتا ہوں کرشنو!"

راج کماری خلا میں گھور رہی تھی۔ وہ زیرِ لب بولی "آج راجا کے سوگ کا ساتواں دن ہے، آخری دن۔ کل ہم یہ ماتمی لباس اُتار دیں گے اور ہمیں ایک نئی زندگی مل جائے گی۔"

"کرشنو!" بلرام جوش میں آگیا۔ اُس نے اپنی میان تھپ تھپائی، میان میں جے پور کی ڈھلی ہوئی خم دار تلوار آراستہ تھی۔ وہ راج کماری سے اور قریب ہوگیا۔ "بھیم سین کو مرنا تھا اگر وہ اپنی موت نہ مرتا تو یہ تلوار اُس کا خاتمہ کر دیتی۔"

کرشنو کی بڑی بڑی آنکھیں آسمان کو گھور رہی تھیں "ہم سوچ رہے ہیں بلرام کہ اگر راجا سے ہماری شادی ہو چکی ہوتی تو ہم آج بیوہ ہوتے یا اُس کی ارتھی کے ساتھ ہمیں بھی ستی ہونا پڑتا۔"

کرشنو!" بلرام نے کھینچ کے اُسے سینے سے لگا لیا "میری روح! میری موجودگی میں راجا زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردہ تھا۔" اُس نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا "یہ تلوار ایک راجا اور ایک فقیر کی گردن میں تمیز نہیں کرتی۔ تمھارے ابروؤں کی قسم کرشنو! اس کی کاٹ بہت تیز ہے۔" کرشنو کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

کچھ فاصلے پر ایک پتھریلا راستہ تھا۔ وہ اچانک گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج اُٹھا۔ کرشنو اور بلرام الگ الگ ہوگئے، پہاڑیوں اور چٹانوں پر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سُرخیاں سیاہیوں میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ وہ راستہ جے پور کی طرف نکلتا تھا۔ کرشنو اور بلرام نے دُور سے ایک سوار کا ہیولا دیکھا۔ وہ بہت عجلت میں معلوم ہو رہا تھا۔ دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے سے وہ شہر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ٹاپیں بتدریج معدوم ہوگئیں۔ کرشنو اور بلرام نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کچھ سوچ رہے تھے۔ کرشنو دفعتہً بولی "اندھیرا ہو رہا ہے بلرام! اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

بلرام نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھوں آنکھوں میں اُس سے بہت کچھ کہا پھر پوچھا "کرشنو! تم نے راج کماری چندا بائی سے میرا ذکر کر دیا ہے نا؟ وہ مہاراج کی مزاج آشنا ہیں اگر انھوں نے مناسب سمجھا تو ہمیں لازوال مسرتوں سے نواز سکتی ہیں۔" چندا بائی کرشنو کی پھوپھی تھی اور کرشنو کا باپ اُس کا بے حد لحاظ کرتا تھا۔

"یہ سوگ کے دن ہیں بلرام!" کرشنو نے آہستگی سے کہا "ان دنوں میں ہم پھوپھی ماں سے یہ ذکر کیسے چھیڑتے؟"

بلرام بولا "کماری! خیال رہے، تمھارا بلرام کسی ریاست کا راج کمار نہیں ہے، محض ایک سردار کا بیٹا ہے۔ کیا تمھارے پتا مہاراج کسی زبردست سفارش کے بغیر اسے قبول کر سکتے ہیں؟"

کرشنو بولی "یاد ہے تم نے کہا تھا کہ جے پور کے مہاراج اس سلسلے میں تم سے تعاون کریں گے؟"

"بے شک میں نے کہا تھا مہاراج مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے ہیں مگر ابھی تک میں بھی اُن سے یہ ذکر نہیں کر سکا ہوں۔ اب وقت نے کروٹ لی ہے ممکن ہوا تو بہت جلد یہ معاملہ اُن کے گوش گزار کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے، وہ تمھارے پتا کے دربار میں میرا باقاعدہ پیام بھجوائیں گے ہم ہزار راج پوت ہیں میرا پیام راج پوتوں کے دستور کے مطابق ہوگا اور اُسے ہزار سردار لے کے آئیں گے اگر مہاراج نے پیام قبول نہ کیا تو تم جانتی ہو فیصلہ تلوار کی نوک پر آجائے گا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم راج کماری چندا بائی کو اعتماد میں لے کے پہلے ہی حالات گرفت میں لے لو۔"

کرشنو کے بھرے بھرے سُرخ ہونٹوں پر معنی خیز تبسم نمودار ہوا۔ اُس نے اثبات میں گردن ہلا کے اپنے محبوب کو اطمینان دلایا۔ بلرام نے اُس کے رخسار تھپ تھپائے "پیام چند روز میں پہنچ جائے گا۔"

"تم خود بھی آؤ گے نا؟"

"کیا راج کماری حکم دے رہی ہیں؟"

"نہیں، یہ ایک التجا ہے۔"

"حُسن کی التجا حکم سے بڑھ کر ہوتی ہے کماری!" بلرام نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن پیام کے ساتھ میں خود نہیں آسکوں گا۔ البتہ جس روز ہزار سردار اُدے پور پہنچیں تم سمجھ لینا کہ میں بھی پہنچ گیا ہوں۔"

کرشنو شاخِ گل کی طرح لہرائی پھر اُس نے پُرجوش انداز میں بلرام کا ہاتھ تھام لیا "سنو رام! اگر پتا مہاراج نے ہزار سرداروں کو مایوس واپس کیا تو میں اسی جگہ تمھارا انتظار کروں گی۔ تیار ہو کر آنا۔ آج تک اُدے پور کی کسی راج کماری نے ایسا فیصلہ نہیں کیا ہوگا اور یہ فیصلہ بھی کوئی راج کماری نہیں بلکہ ایک لڑکی کر رہی ہے جس کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل موجود ہے۔"

کرشنو اُدے پور کے رانا خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ راجپوتانے کے مقتدر اور زور آور راجے مہاراجے رانا خاندان کی کسی دوشیزہ کو حاصل کرنا نہایت فخر کی بات سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ یہ خاندان راج پوتوں کی روایتی آن بان اور قدیم رسموں کا مظہر تھا۔ اُدے پور کے والی رانا پرتاپ نے مغل شہنشاہ اکبر کی اطاعت کرنے اور مغلوں کو اپنی بیٹی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ رانا پرتاپ نے مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کرنے کے ساتھ ساتھ اکبر کی مہارانی جودھا بائی کے بھائی رانا مان سنگھ کو یہ طعنہ بھی دیا تھا کہ اُس نے ایک مغل کو اپنی بہن دے کے راج پوتوں کو ذلیل کر دیا ہے۔ ایک بار راجا مان سنگھ راجپوتانے سے گزر رہا تھا۔ اس نے رانا پرتاپ سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ رانا نے اُس کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام تو ضرور کیا مگر اُس سے ملنے اور اُس کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ یہ توہین رانا مان سنگھ کو کھا گئی۔ وہ بھی ایک غیرت مند راج پوت تھا۔ اس لیے رانا کی دعوت ٹھکرا کے آگرے لوٹ گیا اور اُس نے یہ واقعہ اکبر کے گوش گزار کیا۔ اکبر نے رانا پرتاپ کی سرکشی فرو کرنے کے لیے ایک فوجی مہم تیار کی مغلوں کا جو خاص دستہ صرف

شہنشاہ کی قیادت میں لڑتا تھا اور جو اپنی سپاہیانہ ترک تازیوں کے باعث بہت شہرت رکھتا تھا، وہ بھی اس مہم کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ اکبر نے صرف شاہی فوج پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے ولی عہد اور جودھا بائی کے بیٹے شہزادہ سلیم کو بھی اُدے پور کی مہم سَر کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ صریحًا اس بات کا اشارہ تھا کہ جو مغلوں کے قریب آتے ہیں مغل اُن کی عزت و ناموس کی خاطر کہاں تک جا سکتے ہیں۔ شہزادہ سلیم اور راجا مان سنگھ مغلوں اور راج پوتوں کے لشکر لے کے اُدے پور کی طرف بڑھے۔ ہلدی گھاٹ میں قیامت کا رن پڑا۔ چتوڑ گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ رانا پرتاپ کو شکست ہوئی اور مان سنگھ کی تلوار کا زخم کھا کے بھاگ نکلا لیکن اُس نے شکست تسلیم نہیں کی اور زندگی بھر مغلوں سے نبرد آزما رہا مگر ناکامی اُس کا مقدر رہی۔ آخر اپنے دل پر ناکامی کا داغ لیے ہوئے دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

راج پوتوں نے رانا پرتاپ کو اپنا ہیرو بنا لیا تھا کیونکہ اُس نے مغل سلطنت کی اطاعت قبول کرنے کے بجائے اُس سے بغاوت کرنے کو ترجیح دی تھی اور مغلوں کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جنگ ضرور ہاری تھی لیکن عزت نہیں ہاری۔ اُدے پور نے اکبر کے خلاف بغاوت کر کے تاریخی اہمیت حاصل کر لی تھی اس لیے راجستھان کی ہر ریاست کا والی رانا خاندان کی کسی دوشیزہ کا رشتہ حاصل کرنا باعثِ عزت سمجھتا تھا۔ رانا پرتاپ کے واقعے کو تین صدیاں گزر چکی تھیں۔ اب مغل سلطنت کے ملبے پر نئی حکومتوں کے محل تعمیر ہونے لگے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی تقسیم کرو جیسی مکاری اور ہوشیاری سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا شکار کھیلنے میں مصروف تھی۔ شہنشاہِ دہلی کی برائے نام حکومت، نظامِ دکن، مرہٹوں اور میسور کی خانہ جنگی نیز ریاستی حکمرانوں کی ناچاقیاں، یہ سب انگریزی اقتدار کو خود آواز دے رہے تھے۔ سراج الدولہ اور ٹیپو شکست کھا چکے تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی سیاست نے سندھیا اور ہلکر کا زور بھی توڑ دیا تھا۔ اُدھر وسطی ہند اور پنجاب میں سیاسی طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ برِصغیر ایشیا کی ایک بہت بڑی شکارگاہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک طرف والیانِ ریاست باہمی جنگ و جدل میں مصروف تھے، دوسری طرف بعض طالع آزما ایک دوسرے پر لشکر کشی کرتے رہتے تھے اور تیسری طرف کمپنی سرکار زور آزمائی کر رہی تھی۔

راجپوتانے کی ریاستیں بھی مرہٹوں کی دست بُرد کا شکار ہو رہی تھیں ہر طرف عدمِ تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا تھا چنانچہ جودھ پور کے راجا بھیم سین کو اُدے پور کے ساتھ سیاسی اور فوجی اشتراک قائم کرنے کا خیال آیا اور اُس نے دونوں ریاستوں میں رشتے اور تعلق کا پیوند لگانے کی غرض سے راج کماری کرشنو کے لیے پیام بھیج دیا۔ بھیم سین بظاہر جودھ پور اور اُدے پور کے درمیان سیاسی تعلقات مضبوط کرنا چاہتا تھا تاکہ کسی بیرونی حملے کی صورت میں دونوں ریاستیں متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کر سکیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ رانا خاندان کی دامادی کا فخر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کرشنو کے بے پناہ حسن و جمال کے چرچوں نے اُسے دیوانہ کر دیا تھا۔ دونوں کی عمروں میں اگرچہ بہت فرق تھا۔ بھیم سین کی جوانی رخصت ہو چکی تھی اور حسین کرشنو ابھی جوانی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی لیکن رجواڑوں میں لڑکی اور لڑکے کی عمروں کا فرق ثانوی امر تھا۔ وہ خاندانی مصلحتوں اور سیاسی ضرورتوں کو ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ سولہ سولہ سال کی لڑکیاں ساٹھ ساٹھ برس کے بوڑھوں کے ساتھ باندھ دی جاتی تھیں۔ راج پوت لڑکیوں کی زندگی کا مقصد خاندانی ناموس اور والدین کی سیاسی مصلحتوں پر قربان ہونے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انھیں اس جبر کے خلاف احتجاج کرنے کی نہ اجازت تھی نہ عادت، چنانچہ کرشنو کی منگنی راجا بھیم سین سے کر دی گئی مگر اس سے پہلے کہ شادی ہوتی، بھیم سین مر گیا۔ اب کرشنو اور بلرام کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں رہی تھی۔

کرشنو کو یقین تھا کہ اگر جے پور کے مہاراجا نے بلرام کی مدد کی تو اُس کے باپ کو اُس کا رشتہ دینے سے انکار نہیں ہو گا کیونکہ بلرام کا باپ جے پور کے دربار کا ایک معتمد سردار تھا نیز جے پور اور جودھ پور میں قدیم مخاصمت چلی آ رہی تھی۔ اس لیے جودھ پور کے آں جہانی راجا کی منسوبہ اپنے ایک سردار کے بیٹے کے لیے بیاہ لانا والیِ جے پور کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ یہ چتوڑ کا قلعہ فتح کرنے سے کم کارنامہ نہیں تھا۔

رات نے اُدے پور پر اپنی زلفیں کھول دی تھیں۔ کرشنو کو شام کی سیر میں آج پھر دیر ہو گئی تھی۔ اُسے اپنی رازدار خادمہ پر اعتماد تھا کہ وہ اُس کی سیر کا راز فاش نہیں کرے گی لیکن رانا کا حکم تھا کہ اُسے ہمیشہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے محل لوٹ آنا چاہیے۔ کرشنو دھڑکتے دل اور نرم قدموں سے محل میں داخل ہوئی۔ قندیلیں روشن ہو چکی تھیں۔ قندیلوں کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ اُس کی پھوپھی راج کماری چندا بائی باوقار انداز میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اُس کی طرف آ رہی ہے۔ وہ بہت مضطرب نظر آ رہی تھی۔ کرشنو سمجھ گئی کہ یقینًا کوئی خبر اُس کی منتظر ہے۔ پھر معًا وہ یہ سوچ کے پریشان ہو گئی کہ کہیں اُس کا اور بلرام کا بھید تو نہیں کھل گیا؟ چندا بائی ایک زریں چوکی پر بیٹھ گئی۔

"کرشنو! ہم دیر سے تمھارے منتظر تھے۔"

"حاضر ہوں پھوپھی ماں!" کرشنو نے اُس سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

چندا بائی نے اُسے چوکی پر اپنے پاس بٹھا لیا۔ "کچھ دیر قبل مہاراج نے تمھیں یاد فرمایا تھا۔" کرشنو مجسم سوال بن گئی۔ چندا بائی نے کہا: "آج تمھارے سوگ کا ساتواں دن ہے۔ معلوم ہوتا ہے سات کا عدد تمھارے حق میں مبارک نہیں ہے۔ آں جہانی بھیم سین سے تمھاری منگنی بھی سات تاریخ کو ہوئی تھی اور آج پھر ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

کرشنو نے بے قراری سے پوچھا: "تاؤ مہاراج نے ہمیں کیوں یاد فرمایا تھا پھوپھی ماں؟"

"جے پور کا معاملہ ہے" چندا بائی نے آہستہ سے کہا۔

جے پور کا نام سنتے ہی کرشنو کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی۔ چندا بائی نے اپنی بات جاری رکھی "مہاراج بے حد پریشان ہیں۔ سُنا ہے جے پور کے راجا جگت سنگھ نے تمھارا رشتہ طلب کیا ہے"۔

کرشنو کی آنکھیں مسرت سے چمک اُٹھیں۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا مگر اپنا اشتیاق نہ چھپا سکی "کس کے لیے پھوپھی ماں؟"

"اپنے لیے" چندا بائی نے زیرِ لب جواب دیا۔

یہ دو لفظ کرشنو کے دل پر بجلی بن کے گرے۔ چندا بائی کا جواب نہایت مایوس کن اور تعجب خیز تھا۔ کرشنو کو اپنے محبوب کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے کہا تھا جے پور کا مہاراجا اُسے بیٹے کی طرح عزیز رکھتا ہے اور وہ اس سلسلے میں اُس کی مدد کرے گا۔ کرشنو کو چندا بائی کے الفاظ کی صحت پر شبہ تھا "پھوپھی ماں!" اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا "یہ پیام لے کے کون آیا ہے؟"

"ابھی پیام نہیں آیا ہے" چندا بائی نے کہا "صرف خبر آئی ہے کہ جے پور کے راجا جگت سنگھ نے تم سے شادی رچانے کا فیصلہ کیا ہے اور سب تیاریاں مکمل کر لی ہیں اور قسم کھائی ہے کہ تمھاری ڈولی اُسی کے محل میں اُترے گی۔ ایک وفد بہت جلد پیام لے کے آنے والا ہے اور تم یہ سن کے حیران ہو گی کہ اُس وفد کے ساتھ جے پور کا سپہ سالار چاند سنگھ بھی ایک لشکر لے کے آ رہا ہے تاکہ پیام منظور نہ کیا جائے تو وہ اُدے پور پر چڑھائی کر دے۔ اگر جنگ چھڑ گئی تو شاید اُدے پور اُس کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ مرہٹے اور روہیلے اُس کا ساتھ دیں گے"۔ چندا بائی کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

کرشنو اضطراب میں چوکی سے کھڑی ہو گئی۔ اُس کے رُخسار انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اُس کا دل غم کی شدت سے دو نیم ہوا جا رہا تھا۔ کیسی دلچسپ کتنی عجیب بات تھی۔ بلرام جس قوت کے بل بوتے پر راجا بھیم سین تک سے ٹکرا جانے کی باتیں کرتا تھا، اب وہی قوت اُس کی رقیب بن کے سامنے آئی ہے۔ بلرام راجا مان سنگھ سے بھڑ سکتا تھا مگر وہ جگت سنگھ کے سامنے سر تک نہیں اُٹھا سکتا۔ چندا بائی نے اُس کا غیر معمولی اضطراب محسوس کر لیا اور کھڑے ہو کے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا "حوصلہ رکھو کرشنو!"

کرشنو نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا "اب کیا ہو گا پھوپھی ماں؟ پتا مہاراج کیا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"مہاراج نے ٹھاکر اجے سنگھ سے رائے لی تھی۔ ٹھاکر کا خیال ہے کہ ہمیں جودھ پور کے نئے مہاراج مان سنگھ سے مدد لینی چاہیے تاکہ راجا بھیم سین کے دور میں جودھ پور اور اُدے پور میں جو ربط پیدا ہوا تھا، وہ قائم رہے"۔ کرشنو تڑپ کر رہ گئی۔ بلرام کا سراپا اُس کے تصور میں گھوم رہا تھا اور وہ بدقت اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی تھی۔ چندا بائی کہہ رہی تھی "غالباً مہاراج کو ٹھاکر کی رائے پسند نہیں آئی اس لیے انھوں نے کوئی قاصد جودھ پور نہیں بھیجا"۔

کرشنو کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اُس نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ چندا بائی نے تھکی تھکی آواز میں کہا "کرشنو! تم اپنے غیرت مند باپ کی پریشانیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ مہاراج کا ایک ہاتھ بیٹی کے آنچل پر اور دوسرا تلوار کے دستے پر ہے۔ اگر کسی نے ہماری عزت کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جسارت کی تو اُدے پور کی ایک ایک تلوار بے نیام ہو جائے گی"۔ چندا بائی کی نظر کرشنو کی بھیگی ہوئی پلکوں پر پڑ گئی "ارے؟ یہ تمھاری آنکھوں میں موتی کیوں جھل ملا رہے ہیں کرشنو!"

کرشنو یک بارگی اُس کے سینے سے چمٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ چندا بائی شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ جب کرشنو کی حالت کچھ معتدل ہوئی تو اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "پھوپھی ماں! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ راجا جگت سنگھ کا پیام آنے سے پہلے پتا مہاراج اپنی بیٹی کے لیے کوئی تیسری جگہ منتخب کر دیں؟"

"تیسری جگہ؟" چندا بائی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ "وضاحت سے بات کرو کرشنو! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

کرشنو کا سر جھک گیا۔ اُس نے چندا بائی کو سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ "پھوپھی ماں! گستاخی معاف، وہ کوئی راجا نہیں ہے، راج کمار نہیں ہے، صرف ایک سردار کا بیٹا ہے لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اگر آپ کی کرشنو کسی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے تو وہ صرف وہی ہے"۔

"کرشنو!" چندا بائی چیخ پڑی اور اس طرح کانپنے لگی جیسے اُدے پور کے محل میں بھونچال آ گیا ہو۔ "ہوش میں آؤ کرشنو! یہ نہ بھولو کہ تم کون ہو اور جس سے تم مخاطب ہو، وہ کون ہے۔ یاد رکھو اُدے پور کی راج کماریوں کے لیے محبت زہر کا پیالہ ہے، موت کا پیغام ہے۔ اگر زندگی چاہتی ہو تو اُسے بھول جاؤ، صرف خود کو یاد رکھو۔ اس دیس کی راج کماریوں کو محبت وغیرہ کا کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اُن کی زندگی کی ڈور ہمیشہ کسی نہ کسی تخت کے پائے سے بندھی رہتی ہے"۔

کرشنو کا چہرہ فق اور رنگ سفید ہو گیا۔ چندا بائی نے اُس پر ایک گہری نظر ڈالی اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ کرشنو چوکی پر اوندھی گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اُس کا ذہن تہہ در تہہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

جے پور کا وفد سپہ سالار چاند سنگھ کی کمان میں تین ہزار کا لشکر لے کے اُدے پور کی طرف روانہ ہوا۔ وفد میں دوسری اہم شخصیتوں کے علاوہ جے پور کا راج گرو بھی شامل تھا۔ اُس کا انتخاب راجا جگت سنگھ نے اس لیے کیا تھا کہ کرشنو کا باپ اس وفد کی فوجی، سیاسی اور مذہبی حیثیت کے سامنے سرنگوں ہو جائے اور بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار نہ کر سکے۔

کوہستانِ اراولی کا سلسلہ اُدے پور سے جے پور کے شمال تک چلا گیا ہے۔ یہ علاقہ زیادہ تر خشک اور بنجر ہے۔ پہاڑیاں دونوں ریاستوں کے

جغرافیے میں یکسانی پیدا کرتی ہیں۔ ان کی بلندی سمندر کی سطح سے تین ہزار فٹ تک پہنچتی ہے۔ اُودے پور کے علاقے ہیں ان کی سطح کہیں کہیں چھ ہزار فٹ تک چلی گئی ہے۔ وہاں بلند گھاٹیوں، عمودی چٹانوں، دشوار گزار راستوں ندی نالوں اور جنگلوں نے اُدے پور کو باقی ریاستوں سے الگ کر دیا تھا۔ جے پور اور اُدے پور کا درمیانی فاصلہ دو سو میل سے زیادہ ہے، دریائے چنبل کی ایک شاخ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی اُن کے درمیان حائل ہے۔

چاند سنگھ ایسی شان و شوکت سے روانہ ہوا جیسے وہ صرف پیام لے کے نہیں بلکہ برات لے کے جا رہا ہو۔ روانگی کا منظر بہت پُرجلال اور پُرشکوہ تھا۔ جے پور میں یہ بات عام ہو گئی تھی کہ مہاراجا جگت سنگھ کی شادی اُودے پور کی حسین و جمیل نوخیز راج کماری کرشنو سے ہونے والی ہے اور اگر رانا نے بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کیا تو چاند سنگھ کو اختیار ہوگا کہ وہ اُدے پور کے ساتھ جو سلوک چاہے وہ کرے۔ چاند سنگھ جس فوجی دبدبے سے روانہ ہوا تھا اُس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہر صورت میں کامیاب لوٹے گا۔

راجستھان کے لوگ عموماً کھیتی باڑی کرتے تھے، مویشی پالتے تھے یا سپہ گر تھے۔ سپہ گری راج پوتوں کا آبائی پیشہ تھا۔ آمد و رفت کا ذریعہ گھوڑے اور خچر تھے یا بیل گاڑیاں تھیں جنھیں گڈبیلیں کہا جاتا تھا مگر جب کہیں سے کوئی لشکر گزرتا تھا تو فوراً جنگ کی افواہیں گشت کرنے لگتی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں راجستھان کی بیشتر ریاستوں کو روہیلوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی تباہ کُن مہمات سے اکثر واسطہ پڑتا تھا۔ بالخصوص مرہٹوں نے یہ ریاستیں خوب پامال کی تھیں۔ مرہٹے چوتھ وصول کرنے کے لیے کئی کئی مہینے ڈیرے ڈالے رہتے تھے۔ کبھی مرہٹے مغلوں کے تعاقب میں ہوتے، کبھی انگریز مرہٹوں کا پیچھا کرتے۔ اس طرح راجستھان مختلف لشکروں کی گزرگاہ بن گیا تھا۔

چاند سنگھ جے پور کے خاص برچھیوں کے سائے میں لشکر کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اچانک دُور سے گرد اُڑتی ہوئی نظر آئی پھر دیکھتے دیکھتے جودھ پور کا رسالہ اور اُس کے پیدل دستے نمودار ہوئے جو آندھی اور طوفان کی طرح بڑھتے آ رہے تھے۔ چاند سنگھ نے اپنے لشکر کو رُکنے اور مرتب ہونے کا حکم دیا لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ ناگہانی بلا کی طرح نمودار ہونے والی سپاہ نہ صرف تعداد میں زیادہ تھی بلکہ اُس نے جے پوری لشکر کو بہت ہوشیاری سے نرغے میں لے لیا تھا۔ چاند سنگھ اس اچانک اُفتاد سے بے حد پریشان ہوا۔ اب وہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ جودھ پوری سواروں اور پیادوں کے دستے بدستور آگے بڑھ رہے تھے۔ تصادم ناگزیر تھا۔ آخر دونوں لشکر بادلوں کی طرح ٹکرائے اور میدان میں بجلیاں لپکنے لگیں لیکن پلا حملہ آوروں کا بھاری تھا۔ اُس کی پہلی ہی ضرب بہت کارگر ثابت ہوئی۔ جے پور کے سپاہی خاک و خون میں لوٹ گئے۔ بندوقوں کی زبان کئی بہادروں کو چاٹ گئی۔ دھوئیں، بارود کی بُو اور خون کی سُرخی نے راجستھان کی تاریخ میں ایک نئے خطرے کا دروازہ کھول دیا۔

چاند سنگھ بہت سے سپاہی کٹوانے کے بعد پسپا ہو رہا تھا۔ اُس نے جودھ پور کے سپہ سالار کا اعلان سُنا: "راج کماری کرشنو جودھ پور کی امانت ہے۔ راجا بھیم سین کے بعد اب اُس پر راجا مان سنگھ کا حق ہے۔ جے پور کے راجا سے کہہ دو کہ وہ اُودے پور پیام بھیجنے سے پہلے جودھ پور کی تلوار سے نمٹ لے۔"

چاند سنگھ بچے کھچے سپاہیوں کو لے کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

جودھ پور کے راجا مان سنگھ نے عجب قدم اُٹھایا تھا۔ جے پور کے لیے ایک چیلنج تھا، ایک راج پوت کی غیرت کا امتحان تھا، ایک جنگ کا اعلان تھا۔ جنگ جو راج کماری کرشنو کے لیے چھڑنے والی تھی۔ کاش راج کماری کچھ کم حسین ہوتی!

بلرام اُودے پور سے راج پوری آ گیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ کرشنو نے اُسے اشارہ دے دیا تھا کہ اگر اُس کے باپ نے بلرام کا پیام ٹھکرا دیا تو اُودے پور کی تاریخ ایک نیا ورق اُلٹے گی اور بلرام کا ساتھ دے کے اپنی محبت کو زندۂ جاوید بنا دے گی۔ بلرام بے حد خوش تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ مہاراجا جگت سنگھ کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر اُسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ جس گلِ بہار کا تمنائی ہے، راجا جگت سنگھ اُسی کو شاخ سے توڑنے کے لیے ہاتھ دراز کر چکا ہے۔ بلرام نے راج پوری میں ایک دن سے زیادہ قیام نہیں کیا۔ وہ مہاراجا سے اجازت لے کے نئے سرداروں کو جلد از جلد اُودے پور بھیج دینا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ جے پور کی طرف موڑ دی۔

شکست خوردہ چاند سنگھ اور اپنے خوابوں میں بدمست بلرام صرف ایک پہر کے وقفے سے آگے پیچھے شہر میں داخل ہوئے۔ چاند سنگھ اپنا لُٹا پٹا قافلہ لے کے پہلے پہنچ گیا۔ شکست و ناکامی کا سانحہ راجا جگت سنگھ کو مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ دشمن نے اُس کے خواب راستے ہی میں بکھیر دیے تھے اور اُدے پور کے محل میں اُس کے پیام کے بجائے اُس کی شکست کی خبر پہنچی تھی۔ جگت سنگھ زخمی چیتے کی طرح تڑپ رہا تھا۔

بلرام شکست کی خبر سُن کے چونک گیا اور اس خبر نے خاص طور پر اُس کا سینہ چھلنی کیا کہ یہ سب کچھ کرشنو کی خاطر ہوا ہے۔ اُس کے دل پر گویا آسمانی بجلی ٹوٹ پڑی۔ اب اُس کے جے پور آنے کا مقصد فوت ہو چکا تھا۔ شہر کے دروازے پر اُس نے ایسا محسوس کیا جیسے کوہستانِ اراولی کا سارا بوجھ اُس کے سر پر آ گرا ہے۔ وقت کے ہاتھ نے اُس کی روح پر ضرب لگائی تھی۔ اُس کے تمام ولولے رقابت کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ وہ مہاراجا جگت سنگھ سے ٹکرانے کی ہمت کیسے کرتا؟ وہ آہستہ آہستہ جے پور کے بازاروں سے گزرتا گیا۔ گھوڑے کی دھیمی ٹاپیں اُس کے دل کی ویرانی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ جب وہ اپنی حویلی کے دروازے پر گھوڑے سے اُترا تو جنگ میں زخمی ہونے

والے سپاہی کی طرح نڈھال اور نیم جاں تھا۔ وہ جسم کے بجائے دل پر زخم کھا کر آیا تھا۔ چوکیدار نے لپک کر گھوڑے کی باگ سنبھالی۔ وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو ملازم خادموں نے اُسے روشنی دکھائی۔ ایک خادم سے معلوم ہوا کہ مہاراجا نے اپنے سرداروں کو کسی ضروری مشورے کے لیے طلب کیا ہے۔ اس لیے اُس کا باپ وہاں گیا ہوا ہے مگر بلرام کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد اُس کا باپ حویلی میں داخل ہوا۔ "بلرام! بہت اچھا ہوا تم راج پوری سے آگئے، مجھے تمھاری ضرورت ہے۔"

بلرام کو معلوم تھا کہ اُس کا باپ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سُنتا اُس نے باپ کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا اور اس طرح اپنا مقدمہ اُس کی عدالت میں پیش کر دیا۔ سردار کے ہوش اُڑ گئے کہ اُس کے نادان بیٹے نے اپنی نگاہ کا مرکز بنایا بھی تو اُسے بنایا جس کے حصول کی خاطر راجستھان کی سلطنتیں ہل رہی تھیں۔ اُس نے بیٹے کو سمجھایا کہ "یہ دیوانگی ہے، ایک آگ ہے۔ یہ آگ راجاؤں کے دلوں میں لگ جائے تو انھیں بھی پھونک دیتی ہے۔ راج کماری کرشنو کی طلب تو مہاراجا کو بھی راس نہیں آئی۔ تمھاری کیا اوقات ہے۔"

"پتاجی!" بلرام نے ادب سے کہا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مہاراجا اُس کا خیال دل سے نکال دیں۔ جہاں تک راجا مان سنگھ کا تعلق ہے اُس سے میں نمٹ لوں گا۔"

"مگر مہاراجا مان سنگھ سے انتقام لینے اور راج کماری کو فتح کرنے کا پختہ فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"اگر فیصلہ ہو چکا ہے پتاجی تو سُن لیجیے کہ جے پور اور جودھ پور کے راجا آپس میں لڑ مر کے ختم ہو جائیں گے لیکن اُن کے ہاتھ راج کماری کے دامن تک نہیں پہنچ سکتے اور اگر پہنچ بھی گئے تو میں انھیں کسی مُروّت، رعایت اور کسی خوف کے بغیر کاٹ کے پھینک دوں گا۔"

"لڑکے!" سردار نے سرزنش کی "تم نے حالات کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ مہاراجا نے جودھ پور کے خلاف مہاراجا سندھیا اور روہیلوں کے سردار امیر خاں سے مدد مانگی ہے۔ ایلچی روانہ ہو چکے ہیں۔ اب جودھ پور اور اُدے پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔"

بلرام دل مسوس کے رہ گیا۔ راجا جگت سنگھ ایک بڑی جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا اور ایک جنگ بلرام کے دل و دماغ میں ہو رہی تھی۔ کیوں نہ وہ مہاراجا جگت سنگھ اور راجا مان سنگھ دونوں کا خاتمہ کر دے؟

"میں جانتا ہوں اس وقت تم کیا سوچ رہے ہو۔" باپ نے کہا۔ "اگر تم نے جان پر کھیل کے اپنے رقیبوں کو ختم بھی کر دیا تو یاد رکھو اُدے پور کا رانا پھر بھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں نہیں دے گا۔"

"پتاجی!" بلرام چیخ اُٹھا۔ "میں دعوا کرتا ہوں کہ اُدے پور کا فیصلہ میرے حق میں ہو گا۔"

"اتنی بڑی بات زبان پر لانے سے پہلے تمھیں اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ تم کسی ریاست کے والی یا راج کمار نہیں ہو، محض ایک سردار کے بیٹے ہو جس کی وفاداریاں جے پور کے دربار سے وابستہ ہیں۔"

بلرام نے مناسب لفظوں میں اپنے اور کرشنو کے تعلق اور رابطے کی تفصیل اپنے باپ کو بتا دی اور کہا کہ راج کماری کرشنو چندا بائی کو ہم راز کرنے کا قول دے چکی ہے۔ بلرام کا باپ حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحوں کے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ بلرام کے کندھوں پر رکھ کے سرگوشی کی۔ "مہاراجا کے لیے کوئی کارنامہ سرانجام دو۔ پھر میں انھیں مجبور کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تمھاری خاطر راج کماری کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔"

بلرام کے چہرے پر خون دوڑنے لگا۔ اُمید کا بجھا ہوا چراغ پھر روشن ہو گیا۔ "اگر مہاراجا میرے حق میں راج کماری سے دست بردار ہو جائیں تو میں اُن کے لیے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا سکتا ہوں۔"

سردار نے بیٹے کو بتایا۔ "مہاراجا مان سنگھ سے انتقام لینے کے لیے سخت بے چین ہیں اور اُسے تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ اُس کی تباہی کا ایک راستہ ناگور کی جاگیر سے نکلتا ہے۔ وہ کیسے؟ سنو، جودھ پور کے آں جہانی راجا بھیم سین کی رانی حاملہ تھی۔ پتی کی موت کے چند روز بعد اُس نے ایک راج کمار کو جنم دیا لیکن مان سنگھ پہلے ہی تخت و تاج پر قبضہ کر چکا تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ بھیم سین کی بیوہ نے ایک راج کمار کو جنم دیا ہے تو وہ بچے کی جان کے درپے ہو گیا۔ رانی نے اُس کے خوف سے بچے کو چھپا دیا اور یہ مشہور کروا دیا کہ اُس کے ہاں کوئی ولادت ہوئی ہی نہیں ہے۔ پھر اُس نے اپنی ایک معتمد خادمہ ناگور کے ٹھاکر سوائی سنگھ کے پاس بھیجی اور اُس سے مدد کی درخواست کی۔ ٹھاکر راجا بھیم سین کا بہترین دوست تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں رانی اور راج کمار کو جودھ پور سے نکال کے ناگور لے گیا۔ سوائی سنگھ جودھ پور کے دربار سے وابستہ تھا لیکن ناگور میں پہنچ کے اُس نے راجا مان سنگھ کی تخت نشینی خلافِ قانون قرار دے دی اور اعلان کیا کہ جودھ پور کے تخت کا اصل وارث نومولود بچہ ہے۔ آج کل راجا مان سنگھ اور ٹھاکر میں ٹھنی ہوئی ہے۔ اگر تم ٹھاکر اور راج کمار کو کسی طرح جے پور لے آؤ تو مہاراجا اسے ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھیں گے۔ پھر جودھ پور کے تخت کا فیصلہ جے پور میں ہو گا۔"

بلرام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں آپ کی اجازت سے ابھی ناگور روانہ ہو جاؤں گا۔"

"ابھی نہیں۔ تمھاری روانگی صبح ہونی چاہیے۔"

"راجستھان میں رات کا سفر آسان ہوتا ہے پتاجی!"

"ہاں مگر میں چاہتا ہوں تم رات یہیں گزارو۔ شاید میں ٹھاکر سوائی سنگھ کے لیے مہاراجا سے کوئی ضمانت نامہ حاصل کر سکوں۔"

سورج طلوع ہونے سے پہلے بلرام کا گھوڑا جے پور سے کئی کوس دور نکل چکا تھا۔

راجا بھیم سین کے بعد راجستھان کے حالات تیزی سے بگڑنے لگے۔ راکھ کی سطح اگرچہ پُرسکون نظر آتی تھی لیکن تہہ میں ایک چنگاری سُلگ رہی تھی۔ جو یک لخت شعلہ بن کر بھڑک اُٹھی۔ یہ راج کماری کرشنو کے حُسن جہاں سوز کا شعلہ تھا۔ اُس نے سب سے پہلے راجا بھیم سین کی متاعِ عقل و ہوش پھونکی۔ اس کے بعد راجا جگت سنگھ اُس کی لپیٹ میں آیا اور اب راجا مان سنگھ بھی اُس کی حدّت سے جل رہا تھا۔ اُس نے جے پور کے لشکر پر حملہ کر کے اور اُسے شکست دے کے اُدے پور کے ساتھ اپنے تعلق کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی اور رانا کو پیغام بھیجا۔

"آں جہانی راجا بھیم سین اور عفت مآب راج کماری کرشنو کی منگنی کا مقصد جودھ پور اور اُدے پور کے تعلقات مضبوط بنانا اور متحد ہو کر بیرونی حملے کا دفاع کرنا تھا۔ دونوں ریاستوں میں اتحاد قائم رہنا چاہیے۔ اس کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معزز راج کماری کرشنو جودھ پور کی مہارانی بنیں"۔

سیاسی ضرورتیں رجواڑوں کی ذاتی عداوتیں اور رقابتیں اُدے پور کے محل کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ رانا ایک ریاست کا والی ہی نہیں ایک خوب صورت دوشیزہ کا باپ بھی تھا اور اُسے بہر حال اپنی خاندانی روایات کا پاس کرتے ہوئے اُس کی ڈولی بھی رخصت کرنی تھی۔ اُدے پور کے راناؤں کی سیاسی مصلحت نے اگرچہ شادی وغیرہ کے معاملے میں ہمیشہ طاقت ور ہاتھ قبول کیے تھے اور اس طرح قوت کا توازن اپنے حق میں قائم رکھا تھا لیکن انھوں نے اپنی راج پوتی آن پر کبھی دھبّا نہیں لگنے دیا تھا۔ جب بھی غیرت کا سوال اُٹھا، اُدے پور نے اُس کا بھرپور جواب دیا اور راج پوتوں کے لیے ہمیشہ ایک مثال قائم کی۔ ۱۸۰۶ء میں وقت کے سیاسی اور تمدّنی دھارے صدیوں پرانی تہذیب کا رُخ بدل رہے تھے۔ شرافت اور غیرت کا مفہوم تبدیل ہو رہا تھا۔ راج پوتی آن اُدے پور کے دروازے پر سوال بن کر کھڑی تھی۔ رانا کو اس سوال کا جواب دینا تھا۔ جے پور اور جودھ پور کے راجا برہنہ شمشیروں اور بندوقوں سے محل کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ محل کی موثر شخصیت، رانا کی بہن راج کماری چندا بائی اپنے بھائی کا فیصلہ سننے کے لیے بے چین تھی مگر رانا نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ جے پور اور جودھ پور میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکا تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ ہر صبح کا سورج ایک نئی پریشان کن خبر کے ساتھ طلوع ہوتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ جے پور اور جودھ پور ایک دوسرے کے خلاف زبردست جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور یہ جنگ صرف راج کماری کرشنو کے لیے لڑی جائے گی۔

ناراض شوہر نے چیختے ہوئے کہا "میں پوچھتا ہوں کہ اس گھر میں کس کا حکم چلتا ہے؟ میرا یا تمھارا؟"
"یہ نہ پوچھو تو اچھا ہے" بیوی نے کہا "یہ بات معلوم کر کے تمھیں خوشی نہیں ہوگی"

کراچی سے قیصر سلطانہ ملک کی ظرافت

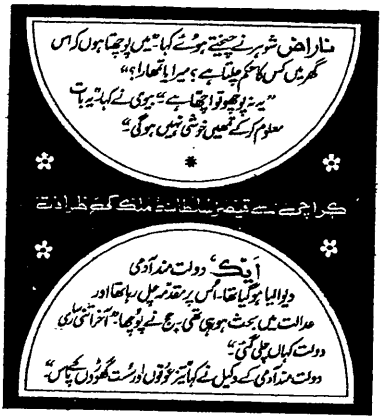

ایک دولت مند آدمی دیوالیہ ہو گیا تھا۔ اُس پر مقدمہ چل رہا تھا اور عدالت میں بحث ہو رہی تھی۔ جج نے پوچھا "آخر اتنی ساری دولت کہاں چلی گئی"
دولت مند آدمی کے وکیل نے کہا "تیز عورتوں اور سست گھوڑوں کے پاس"

اُدے پور کا راج محل ایک خوب صورت جھیل میں واقع تھا اور کسی جل محل کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ آج وہ جل محل اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ محل میں راج کماری کرشنو پنوار سرداروں کے پیام کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئی تھی۔ نہ سردار اُس کے لیے پیام لے کے آئے تھے، نہ اُس کا محبوب بلرام اُس کے پاس پہنچا تھا۔ البتہ راجا جے پور کے پیام اور اُس کے لشکر پر حملے کی خبر اُس نے ضرور سُنی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پنوار سرداروں کے نہ آنے کا سبب یہی ہے لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ بلرام کے بغیر گزرنے والا وقت اُس نے اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اُسی کے تصوّر میں کھوئی ہوئی تھی۔ اچانک چندا بائی وہاں پہنچی۔ کرشنو بظاہر دریچے سے جھیل میں تیرتی ہوئی بطخوں کا نظارہ کر رہی تھی۔ اُسے کسی کے آنے کا احساس نہیں ہوا۔ چندا بائی نے چپکے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک کر مڑی۔ چندا بائی نے کہا "کرشنو! بہت اُداس نظر آ رہی ہو؟ کیا بات ہے؟" اُس کے لہجے میں ہمدردی تھی حالانکہ کرشنو کو اس محل میں کسی سے ہمدردی کی توقع نہیں تھی۔ محل اُس کے لیے قید خانہ ہو کے رہ گیا تھا۔ یہاں ہر فرد راج پوتی آن کا پرستار تھا، رسم و رواج کے بُت پوجتا تھا اور کسی کو یہ ہوش نہیں تھا کہ کرشنو صرف راج کماری ہی نہیں ایک لڑکی بھی ہے اور لڑکی کے سینے میں دل بھی ہوتا ہے اور دل میں کچھ خواہشیں، آرزوئیں اور اُمیدیں ہوتی ہیں۔ چندا بائی بولی۔ "کرشنو! تمھیں اُداس دیکھ کے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ مہاراج نے جو کچھ سوچا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم جو چاہتی ہو شاید وہی ہو جائے"۔

کرشنو کے ہونٹوں پر ایک تلخ تبسّم بکھر گیا۔ "پھوپھی ماں! یہ راج محل ہے، یہاں محبت امرت نہیں زہر کا پیالہ ہے موت کا پیغام ہے"۔

چندا بائی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہم کچھ اور کہنے آئے ہیں کرشنو!" اُس کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔ "مہاراج نے تمھارا فیصلہ تم

پر چھوڑ دیا ہے۔"

کرشنو کا تبسم تلخ ہی رہا۔ "پھوپھی ماں! اس دیس کی راج کماریوں کو محبت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اُن کی زندگی کی ڈور کسی نہ کسی تخت کے پائے سے بندھتی ہے۔"

"درست ہے لیکن وقت اور حالات کے ساتھ خیالات اور رواج بدل جاتے ہیں۔" چندا بائی کی آواز میں ایک درد تھا۔ "ہم پہلے بھی تمھارے ہمدرد تھے اور آج بھی ہیں۔ ہم تم سے تمھارے مطلوب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔"

"آپ کو اُس کے بارے میں جان کے مایوسی ہو گی پھوپھی ماں۔" کرشنو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ کوئی راجا یا راج کمار نہیں ہے۔"

"یہ تم پہلے بھی بتا چکی ہو۔"

"اُس کے پاس کوئی جاگیر بھی نہیں ہے۔"

"کرشنو!" چندا بائی کا لہجہ حکیمہ ہو گیا۔ "ہمیں اُس کا صرف نام اور پتہ درکار ہے۔" کرشنو کے دل میں یکایک شمعیں روشن ہو گئیں۔ وہ فرطِ مسرت میں چندا بائی سے لپٹ گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں اُسے بلرام کے متعلق تفصیلات بتلانے لگی۔ پھر اُس نے کہا۔ "اُس کے دل میں شوق اور بازوؤں میں فولاد بھرا ہوا ہے۔ وہ اپنی محبت کے نام پر دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرا سکتا ہے۔ پنوار قبیلے کے تمام سردار اور سپاہی اُس کے ایک اشارے پر اپنی جانیں نثار کر سکتے ہیں۔" اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ بلرام نے رخصت ہوتے وقت پنوار سرداروں کو جے پور بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

چندا بائی تشویش سے بولی۔ "جے پور کے حالات بگڑ چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے بلرام کسی مصیبت میں گھِر گیا ہو ورنہ ہم جانتے ہیں، پنوار قبیلے کے لوگ اپنا قول کبھی نہیں ہارتے۔ ایک بات اور قابلِ غور ہے۔ جب جے پور کا راجا خود تمھارا اُمیدوار ہے اور اس سلسلے میں جودھ پور کے خلاف جنگ چھیڑنے کی تیاریاں کر رہا ہے تو بھلا بلرام اُس کے انتقام سے کیسے بچ سکے گا؟"

کرشنو نے اچانک چندا بائی کے پاؤں چھو لیے۔ "پھوپھی ماں! وہ آندھیاں روک دیجیے جو یہ چراغ گُل کر دینا چاہتی ہیں۔ اگر بلرام کو کچھ ہو گیا تو آپ اپنی کرشنو کو بھی زندہ نہیں دیکھیں گی۔"

چندا بائی نے اُسے بازوؤں سے تھام کے اُوپر اُٹھایا۔ "کیا تم بلرام کو یہاں بلوا سکتی ہو؟"

کرشنو نے مایوسی سے نفی میں سر کو ہلایا۔ "وہ ہر پہلی تاریخ کو خود بخود آ جاتا تھا مگر اس بار نہیں آیا۔ نہ معلوم وہ کہاں ہو اور کس حال میں ہو۔"

"ہم کسی کو جے پور بھیج کے معلومات حاصل کر لیں گے۔ بلرام سے ہماری ایک ملاقات بے حد ضروری ہے۔"

بلرام کو سفر میں کئی دن لگ گئے لیکن وہ ناگود سے کامیاب لوٹا۔ وہ جب جے پور میں داخل ہوا تو اُس کے ترکش میں مہاراجا جگت سنگھ کے لیے کئی تیر تھے۔ ناگود کا جاگیردار سوائی سنگھ، راجا بھیم سین کی بیوہ، جودھ پور کا نومولود راج کمار کنور اور ناگود کے وہ راج پوت ٹھاکر جو سوائی سنگھ کے حامی تھے اور راجا مان سنگھ کی بجائے جودھ پور کے تخت و تاج کا جائز وارث نومولود کنور کو سمجھتے تھے۔

مہاراجا جگت سنگھ نے اُن سب کا پُرجوش استقبال کیا۔ یہ لوگ راجا مان سنگھ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر جے پور چلے آئے تھے۔ اُنھیں یقین دلایا گیا کہ جودھ پور کا تخت اُس کے جائز وارث کو دلانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جائے گا۔

بلرام نے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ وہ سوائی سنگھ اور کنور کو ناگود سے ایسے وقت میں نکال کے لایا تھا جب جودھ پور کے سپاہی انھیں گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ اگر ایک پہر کی بھی دیر ہو جاتی تو اُن کا بچنا مشکل تھا۔ پنوار سردار نے جو مہم اپنے بیٹے کے سپرد کی تھی، وہ اُس میں کامیاب رہا تھا۔ سردار بے حد خوش تھا۔ اُس نے مہاراجا جگت سنگھ سے اصل مقصد ابھی تک بیان نہیں کیا تھا ورنہ بلرام اور راج کماری کرشنو کے خواب بتلانے کی جرأت کی تھی۔ البتہ اُس نے مہاراجا کے سامنے اپنے بہادر بیٹے کا کارنامہ ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا تھا کہ اُس کی بہادری اور وفاداری کی ساکھ قائم کر دی تھی۔ راجا جگت سنگھ بھی بلرام سے بے حد خوش تھا۔ موقع سے فائدہ اُٹھا کے پنوار سردار نے مہاراجا سے یہ قول لے لیا تھا کہ بلرام کو اس خدمت کے صلے میں منہ مانگا انعام دیا جائے گا اور وہ جے پور کی جو بھی جاگیر پسند کرے گا، اُسے بخش دی جائے گی۔ سردار کا ارادہ تھا کہ وہ کسی مناسب موقع پر مناسب الفاظ میں مہاراجا کو راج کماری کرشنو کا خیال ترک کرنے کا مشورہ بھی دے گا مگر موجودہ حالات میں یہ مشورہ اُسے مشتعل کر سکتا تھا کیونکہ وہ جودھ پور کے خلاف رقابت کی جنگ لڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ سردار نے بیٹے سے کہا۔ "سیاست کی بساط پر تمھاری پہلی چال کامیاب رہی۔ اب انتظار کرو کہ شاہ کب گھوڑے کی زد پہ آتا ہے۔"

راج کماری کرشنو کو فتح کرنے کے لیے راجستھان کے دو طاقت ور رجواڑوں میں بُری طرح ٹھن گئی تھی۔ کوئی بھی تیسرا فریق اس باہمی کشمکش سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ پنوار سردار کے نزدیک کامیابی کا یہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ جے پور میں جنگ کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ جودھ پور کے راجا کے خلاف ملامت کا اشتہار جاری کر دیا گیا تھا۔ ریاست میں جگہ جگہ فوجی بھرتی شروع ہو گئی تھی۔ نوجوانوں کو جنگ کی تربیت دی جا رہی تھی۔ مختلف والیانِ ریاست حمایت کے لیے تیار کیے جا رہے تھے۔ اس معاملے میں بھی پنوار سردار پیش پیش تھا۔ اُس نے مہاراجا سے کہا تھا کہ "مہاراج! جنگ میں فتح پانے کے لیے بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم جس قدر بازو پیدا کریں گے، فتح اسی قدر آسان ہو گی۔" اُس کی کوششوں سے مہاراجا راجستھان کی کئی ریاستوں کی

soni C vision®

سب سے بڑی ٹی وی سکرین

۲۶" سکرین پر زندگی کے ہمہ گیر عکس

حقیقت سے زیادہ بڑے، حقیقت سے زیادہ نمایاں

پاکستان آڈیوٹیکس لمیٹڈ

۱۱۔سی نیو مسلم ٹاؤن، لاہور۔ فون: ۳۵۴۰۶۱/۶۲

PAT- 7/75

sasa lahore

حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ایک روز بلرام کو اچانک راج محل میں طلب کر لیا گیا۔ وہ شاداں و فرحاں مہاراجا کے سامنے پہنچا تو اُس کے ہوش و حواس پر ایک قیامت گزر گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے محل کے ایک خصوصی ایوان میں حاضری دی تھی۔ کورنش کے بعد اُس نے سر اُٹھایا تو وہ مہاراجا کے عقب میں دیوار پر راج کماری کرشنو کی ایک رنگین اور قدِ آدم تصویر دیکھ کے دم بخود رہ گیا۔ اُس کی غیرت پر ایک زبردست کوڑا پڑا، اُس کے راج پوتی خون کی گردش تیز ہو گئی۔ مہاراجا نے اُس کی حیرانی سے یہ اندازہ لگایا کہ تصویر کے حسن و جمال نے اسے مبہوت و مسحور کر دیا ہے۔ وہ خود بھی دیوار کی طرف گھوم گیا اور خیال انگیز انداز میں کہنے لگا: "نوجوان! شاید تمھیں علم نہ ہو، یہی اُودے پور کی راج کماری اور جے پور کی ہونے والی مہارانی کرشنو ہیں۔ یہ تصویر ایک پرتگالی مصور نے ہمارے حکم پر تیار کی ہے۔ مصور نے اُودے پور کے عمل محل میں صرف ایک بار انھیں دیکھا تھا، ہم سوچتے ہیں جب کرشنو کماری کی تصویر اس قدر دل کش ہے تو وہ خود کس قدر دل کش ہوں گی۔ اُن کی خاطر ہم خون کے ہزاروں دریا عبور کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

بلرام کی نگاہ ابھی تک تصویر پر مرکوز تھی۔ مصور نے کرشنو کے حسن و جمال کی ایسی صحیح عکاسی کی تھی کہ صرف گویائی کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ تصویر کے سامنے دو آدمی، دو رقیب کھڑے تھے۔ مہاراجا پلٹا۔ اُس نے محسوس کیا کہ بلرام راج کماری کے جلوۂ حسن میں غیر معمولی طور پر محو ہو گیا ہے۔ اُس کے دل میں فخر و غرور کی ایک لہر اُٹھی: "بلرام! تم راج پوت ہو، ایک نوجوان اور بہادر راج پوت۔ ہمیں بتاؤ اگر راج کماری سے تمھیں اُنس ہو جاتا تو کیا تم راجا مان سنگھ کو زندہ چھوڑ سکتے تھے؟"

بلرام کی محبت کو حالات نے مصلحت سکھا دی تھی۔ وہ مہاراجا کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا مگر خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس نے ایک تیسرا راستہ اختیار کیا: "دل کی طاقت دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے مہاراج!"

مہاراجا نے یہ جواب بہت پسند کیا: "بلرام! ہم چاہتے ہیں کہ تم ہماری نمایندگی کرو اور ہمارے لیے راج کماری کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔"

بلرام نے حیرت سے مہاراجا کی طرف دیکھا۔ ایسی فرمائش آج تک کسی نے اپنے رقیب سے نہ کی ہو گی۔ بلرام کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ مہاراجا کہہ رہا تھا: "بلرام! تم ٹھاکر کنور اور رانی کو یہاں لا کر ایک معرکہ سر کر چکے ہو۔ اب ہم ایک دوسرا معرکہ تمھارے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اسے بھی کامیابی کے ساتھ سر کر سکتے ہو۔" بلرام نے سر جھکا دیا۔ مہاراجا نے کہا: "سنا ہے، راجا مان سنگھ راجستھان کے مختلف راجاؤں کو ہماری مخالفت پر اُکسا رہا ہے۔ اُس نے اُودے پور کے رانا سے بھی مدد مانگی ہے اور درخواست کی ہے کہ جے پور کے خلاف دونوں ریاستوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔ ہم تمھیں معلم رسل اور نمایندے کی حیثیت سے اُودے پور بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ تم رانا کو راجا مان سنگھ سے کنارہ کش رکھ سکو اور اُسے اچھی طرح سمجھا دو کہ ہم جودھ پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ راجستھان کے بہت سے راجا ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیں امیر خاں کے روہیلے جاں بازوں اور مہاراجا سندھیا کے مرہٹہ سپاہیوں کی حمایت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ اُن کے لشکر ہمارے اشارے کے منتظر ہیں۔ راجا مان سنگھ جیسے غاصب اور ظالم حکمران کے خلاف رانا کو بھی ہم سے تعاون کرنا چاہیے اگر اُسے یہ منظور نہیں ہے تو وہ جودھ پور کا ساتھ بھی نہ دے۔"

بلرام نے تمام باتیں توجہ سے سُنیں مگر وہ بات جس نے اسے بے قرار کر رکھا تھا، وہ سارے فسانے میں کہیں نہیں تھی اور وہ اُسی کا منتظر تھا۔ شاید مہاراجا کی تقریر کا ماحصل بھی وہی بات تھی۔ مہاراجا بلرام کے قریب ہو گیا۔ سیاست کی بات ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ دل کی بات چھیڑنے والا تھا لیکن شاید اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آغاز کہاں سے کرے؟ آخر اُس نے جیب سے سرخ یاقوت کی ایک نہایت قیمتی انگوٹھی نکالی اور اسے بلرام کے ہاتھ پر رکھ دی۔ بلرام ایسی ہی ایک انگوٹھی پہلے بھی کرشنو کی انگلی میں دیکھ چکا تھا اور اب جے پور کا مہاراجا سرخ یاقوت کو اپنی زبان بنا رہا تھا۔ بلرام نے کچھ سنے بغیر سب کچھ سمجھ لیا۔ پھر بھی وہ الفاظ کا منتظر تھا۔ مہاراجا نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا: "ہم چاہتے ہیں کہ رانا سے ملاقات کے بعد تم کسی طرح راج کماری سے بھی ملو اور ہماری طرف سے انھیں یہ انگشتری پیش کرو۔ تم یہ انگوٹھی اُن تک کیسے پہنچاؤ گے؟ یہ تمھیں سوچنا ہے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ہماری نشانی ہر صورت میں اُن تک پہنچ جانی چاہیے۔ اُودے پور کی سفارت کے لیے ہم نے تمھارا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تم راج کماری سے ملنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور پیدا کر لو گے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر تم جیسے بہادر نوجوان ہر مشکل سہل کرنا جانتے ہیں۔ راج کماری سے عرض کرنا کہ ہم تمھارے لیے جے پور جنت بنا دیں گے۔"

مہاراجا نے اصرار کر کے بلرام سے یہ عہد لیا کہ وہ اُس کا تحفہ راج کماری تک پہنچائے بغیر لوٹے گا نہیں۔ اُس نے مسرت کے جوش میں دونوں ہاتھ بلرام کے کندھوں پر رکھ دیے: "آج سے تم ہمارے دوست بھی ہو اور راز دار بھی۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں تمھاری ہر آرزو پوری کی جائے گی۔"

"سوچ لیجیے مہاراج! جب ایک راج پوت دوسرے راج پوت سے وعدہ کرتا ہے تو جان کی بازی لگا کے بھی اُسے ایفا کرتا ہے۔"

مہاراجا اُسے کرشنو کی تصویر کے پاس لے گیا: "بلرام! ہم حُسن کی اس شہزادی کے سامنے تمھیں قول دیتے ہیں کہ تمھاری ہر خواہش پوری کی جائے گی۔"

بلرام نے سر جھکا لیا: "غلام علی الصباح اُودے پور کی طرف روانہ ہو جائے گا۔"

اُسی وقت اطلاع آئی کہ روہیلے سردار نواب امیر خاں کا پیغام آیا ہے کہ اُس کا لشکر جے پور کی مدد کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ مہاراجا کا چہرہ کھل اُٹھا۔

اُسے اپنی فتح یقینی معلوم ہونے لگی۔ مہاراجا کی رانی امیر خاں کی منہ بولی بیٹی بنی ہوئی تھی اور امیر خاں کمپنی سرکار کے بعد دوسری فیصلہ کُن طاقت سمجھا جاتا تھا۔ اُس کے لشکر میں روہیل کھنڈ کے بہادر افغان جسونت راؤ ہلکر کے مرہٹے پنڈارے اور بھیل سبھی شامل تھے۔ امیر خاں کی آمد کا پیغام طوفانوں کے آگے آگے اُڑنے والے طائر کی حیثیت رکھتا تھا۔ مہاراجا نے بلرام سے مخاطب ہو کر کہا: "اُدے پور کے دربار میں تمھارا کام اب پہلے سے آسان ہو گیا ہے۔ اُدے پور کا رانا امیر خاں کی طاقت سے واقف ہے۔ اب وہ ہماری دشمنی مول لینے کی ہمت نہیں کرے گا۔ تم اُس کی طرف ہماری دوستی کا ہاتھ بن کر جاؤ۔"

بلرام محل سے نکلا۔ جنوری کا سرد دن شام کے خنک اندھیرے میں تحلیل ہو رہا تھا۔ محل کے دروازے پر روہیلے سواروں کا ایک دستہ موجود تھا۔ یہ دستہ امیر خاں کا پیغام لے کے آیا تھا۔ اُس کے ارد گرد ہجوم اکٹھا تھا۔ امیر خاں کے سواروں کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے جے پور میں پھیل گئی تھی۔ بلرام جہاں جہاں سے گزرا اُس نے لوگوں کو یہی باتیں کرتے سُنا کہ اب جودھ پور کے راجا کو اُس کی خود سری اور گستاخی کا عبرت ناک سبق دیا جائے گا۔ امیر خاں کی ہیبت اور دہشت سے مالوہ ہی نہیں راجستھان بھی کانپتا تھا۔ اُس کا جنگ کے لیے نکلنا راجا مان سنگھ کی بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بلرام اپنی حویلی پہنچا۔ اُس کو باپ نے راستے میں اطلاع دی کہ اُدے پور کا ایک ایلچی اُس سے ملنے آیا ہے اور اُس نے اپنی آمد خفیہ رکھی ہے۔ سردار نے ایلچی کو حویلی کے پچھواڑے ایک ایسے کمرے میں ٹھیرایا تھا جو مدت سے بند پڑا تھا۔ وہ بلرام کو لے کے حویلی کا چکر کاٹتا ہوا وہاں پہنچا۔ اُدے پور کا ایلچی بے چینی سے بلرام کا منتظر تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اُدے پور کی معزز راج کماری چندا بائی کا بلاوا لے کے آیا ہے اور اُسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ چندا بائی نے اُسے کیوں طلب کیا ہے؟ اس کے بارے میں ایلچی کچھ نہیں جانتا تھا۔ البتہ وہ ایک نشانی ساتھ لایا تھا۔ جس سے بلاوے کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ ایلچی نے بلرام کو سونے کی ایک انگوٹھی دی۔ انگوٹھی میں سُرخ یاقوت جڑا ہوا تھا۔ بلرام فوراً سمجھ گیا کہ یہ بلاوا چندا بائی کے بجائے دراصل کرشنو کی طرف سے ہے۔ وہ سُرخ یاقوت کی یہ انگوٹھی اُس کے ہاتھ میں دیکھ چکا تھا۔ یہ انگوٹھی وہی تھی جو جودھ پور کے آں جہانی راجا بھیم سین نے اُسے منگنی کے موقع پر بھیجی تھی اور جسے کرشنو نے اُس کی وفات کے بعد اُنگلی سے اُتار دیا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ ایلچی ٹھیک اُسی روز پہنچا، جب وہ خود مہاراجا کا پیغام لے کے اُدے پور جانے والا تھا۔ حالات نے سنگین موڑ کاٹ کے اچانک ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ بلرام کو اپنی کامیابی یقینی معلوم ہونے لگی۔ کرشنو نے اُسے بلانے کے لیے اپنی انگوٹھی بھیجی تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ مہاراجا نے بھی اُس کے لیے اُسے ویسی ہی انگوٹھی دی تھی۔ دوسری انگوٹھی میں بھی سُرخ یاقوت جڑا ہوا تھا۔

بلرام نے ایلچی سے رخصت ہو کے قندیل کی روشنی میں دونوں انگوٹھیاں اپنے ہاتھ پر رکھ کے دیکھیں، وہ دنگ رہ گیا۔ دونوں انگوٹھیوں میں محض سُرخ یاقوت کی مماثلت نہیں تھی بلکہ وہ ایک ہی ساخت، ایک ہی نقشے اور ایک ہی ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں۔ اُن دونوں میں سرِ مو کوئی فرق نہیں تھا۔ راجا بھیم سین اور مہاراجا جگت سنگھ دونوں اُس کے رقیب تھے، دونوں یاقوت پسند کرتے تھے، دونوں نے کرشنو کے لیے ایک جیسی انگوٹھیاں بھیجی تھیں اور اس وقت دونوں انگوٹھیاں بلرام کے پاس تھیں۔

رانا اُدے پور کے دربار میں حاضری دینے سے پہلے بلرام کو راج کماری چندا بائی کے حضور پیش ہونا پڑا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُسے چندا بائی کے نام سے دراصل کرشنو نے بُلایا ہے لیکن جب راج محل کے پہرے دار اُسے شاہی آداب و ضوابط کے ساتھ رانا کی بہن کے قصر میں لے گئے تو اُس پر پہلی بار یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ بُلاوا چندا بائی ہی کی طرف سے تھا اور بلاوے کے لیے اُس نے کرشنو کی انگوٹھی استعمال کی تھی۔ چندا بائی نے بلرام کو اور بلرام نے چندا بائی کو پہلی دفعہ دیکھا۔ ایک حسن و جمال اور تمکنت کی مالک تھی، دوسرا وجاہت کے علاوہ راج پوتی آن کا مُرقع نظر آتا تھا۔ چندا بائی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی افسانوی نوجوان آکاش سے اُتر کے اُس کے سامنے آ گیا ہو۔ اُس نے کرشنو کا انتخاب پسند کیا۔ بلرام کسی ریاست کا شہزادہ نہیں تھا لیکن وہ ایک شہزادی کا حق دار ضرور تھا۔ چندا بائی نے گفتگو کا آغاز کیا: "نوجوان! ہمارے علم میں ہے کہ تم پہلے بھی اُدے پور آتے رہے ہو مگر اس بار تم ہم سے ملنے آئے ہو۔ تمھیں ہم نے بُلایا ہے تمھاری آمد راج کماری کرشنو کے علم میں نہیں ہے۔"

"یہ میری خوش نصیبی ہے معزز راج کماری کہ آپ نے مجھے طلب کیا۔ میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔"

چندا بائی نے دو چار رسمی جملوں کے بعد اُسے بتایا کہ جے پور اور جودھ پور کے درمیان جو جنگ چھڑنے والی ہے اُدے پور اُس سے الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے مگر سب جانتے ہیں کہ اس لڑائی کی وجہ کرشنو ہے اور جب تک اُس کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہو جاتا راجستھان میں بھڑکنے والی آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ابھی تک رانا نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن وہ چاہتی ہے کہ یہ معاملہ زیادہ طول نہ کھینچے اور جنگ کا الاؤ دہکنے سے پہلے کرشنو کا ہاتھ بلرام کے ہاتھ میں دے دیا جائے لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب مہاراجا جگت سنگھ کرشنو کی اُمیدواری سے دست بردار ہو جائے۔

بلرام نے تمام صورتِ حال بیان کر دی اور بتایا کہ مہاراجا کو اس خیال سے باز رکھنے کی ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے اور وہ اُس کے قاصد کی حیثیت سے اُدے پور آیا ہے لیکن مہاراجا کو جلد اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے گا کہ وہ جودھ پور سے جنگ جیت کر بھی کرشنو کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنے قول کے مطابق اُسے بلرام کی خواہش پوری کرنی ہو گی۔ بلرام نے کہا کہ اگر مہاراجا نے

اپنا قول پورا نہ کیا تو وہ اپنی جان پر کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ چندا بائی نے اُسے مشورہ دیا کہ اگر وہ اس سلسلے میں مہاراجا کے بجائے اُس کی رانی سے رابطہ پیدا کرے اور اُس کے ذریعے روہیلے سردار امیر خاں کی حمایت حاصل کر سکے تو اُس کی کامیابی یقینی ہے۔ آخر جے پور کی مہارانی کو یہ بات کب گوارا ہوگی کہ اُس پر کوئی سوتن آئے۔ وہ اپنے منہ بولے باپ امیر خاں سے کہہ کے مہاراجا کو کرشنو کا خیال ترک کر دینے پر مجبور کر سکتی ہے۔ بلرام کی آنکھیں چمکنے لگیں: "میں مہارانی کی بارگاہ میں ضرور حاضری دوں گا۔" اُس نے جوش میں کہا اور وہ راج کماری چندا بائی کی ذہانت کا معترف ہو گیا۔ اُس نے اشاروں اشاروں میں اُسے ایک نئے پہلو پر سوچنے کی دعوت دی تھی۔

چندا بائی نے وقار سے کہا: "جب تم ہمیں یہ یقین دلادو گے کہ مہاراجا جگت سنگھ راج کماری کرشنو کی اُمیدواری سے دست بردار ہو گئے ہیں تو ہمیں تم جیسے بہادر اور ذہین نوجوان کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں رہے گا۔" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اُس نے کہا: "اب تم مہارانا کی خدمت میں باریاب ہو کے اُدے پور سے چلے جاؤ گے مگر ہم یہ پسند نہیں کریں گے کہ تم راج کماری کرشنو کے درشن کیے بغیر لوٹو۔ ہم نے راج کماری کو بلوایا ہے، وہ تمھیں یہاں دیکھ کے دنگ رہ جائے گی۔"

ایک باندی نے خبر دی کہ راج کماری تشریف لا رہی ہیں۔ چندا بائی وہاں سے اُٹھ کے بہتے ہوئے قدم اٹھاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کرشنو اپنی روایتی شان سے چلتی اور گرم عبا کا دامن لہراتی ہوئی وہاں داخل ہوئی۔ بلرام کو دیکھ کے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس سے پہلے کہ یاقوتی لبوں سے حیرت کی سسکی نکلتی، بلرام اُسے دیکھتا رہ گیا۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ دل کش نظر آ رہی تھی۔ یہ کرشنو تھی۔ اُس نے خواب ناک آواز میں کہا: "اس ملاقات کے لیے ہمیں راج کماری چندا بائی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

راجستھان کا ایک عام نوجوان اُدے پور کے عظیم الشان جل محل میں داخل ہو چکا تھا۔ جل پری کی جھیل جیسی گہری گہری آنکھیں مسرت کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ یہ ملاقات حسین بھی تھی اور دلچسپ بھی۔ جل محل کتنی تاریخی روایات کا امین تھا اور آج ایک نئی روایت کا آغاز ہو رہا تھا۔ طالب و مطلوب نے دل بھر کے ایک دوسرے کو دیکھا اور دنیا جہان کی باتیں کیں۔ دونوں جھرنوں کی طرح بہتے اور ندیوں کی طرح اُبلتے۔ جب طبیعتوں کو کچھ قرار آیا تو بلرام نے اپنے انگرکھے میں ہاتھ ڈال کے سُرخ یاقوت کی انگوٹھی نکالی اور اُسے کرشنو کی طرف بڑھا کے بولا: "میں نے جے پور کے مہاراجا سے عہد کیا تھا کہ یہ انگوٹھی تمھارے ہاتھ تک پہنچا دوں گا۔ مہاراجا کا عزم ہے کہ ہم جے پور تمھارے لیے جنت بنا دیں گے۔" بلرام نے آنکھیں بند کر لیں۔ "راجستھان کی ہواؤ! گواہ رہنا میں اپنا عہد پورا کر رہا ہوں۔" کرشنو حیران تھی۔ بلرام نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کے اُس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ پھر جب وہ اُس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو کرشنو نے چیخ کے اپنا ہاتھ چھڑا لیا: "نہیں۔" پھر اُس نے غور سے انگوٹھی کی طرف دیکھا: "ارے یہ تو آں جہانی راجا بھیم سین کی انگوٹھی ہے؟"

"نہیں۔" بلرام نے دوسری انگوٹھی نکالتے ہوئے کہا: "راجا بھیم سین کی انگوٹھی یہ ہے کماری!"

"بلرام! یہ دونوں انگوٹھیاں جھیل میں پھینک دو۔ انھیں دیکھ کے ہمیں وحشت ہو رہی ہے۔"

اُسی وقت چندا بائی نمودار ہوئی: "یہ انگوٹھیاں ہمیں دے دو۔"

کرشنو اور بلرام احتراماً کھڑے ہو گئے۔ بلرام نے چندا بائی کے حکم کی تعمیل کی۔ چندا بائی نے دونوں انگوٹھیاں ایک چھوٹے سے چرمی بٹوے میں رکھ لیں۔ "بلرام! ہم نے مہارانا سے تمھاری ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے۔ اگر وہ تمھیں ایک دن قیام کے لیے کہیں تو انکار نہ کرنا۔"

اُسی روز بلرام رانا کے دربار میں پیش ہوا۔ ایک شاہی مہمان کی طرح اُس کا خیر مقدم کیا گیا۔ بلرام نے اُدے پور کے ٹھاکروں کے سامنے رانا کو مہاراجا جگت سنگھ کا پیغام سنایا۔ رانا نے جواب دیا: "جے پور اور جودھ پور کی جنگ میں ہم کسی کی طرف داری نہیں کریں گے لیکن کسی نے اُدے پور پر حملہ کیا تو ہم کمپنی سرکار کی مدد سے اُس کا مقابلہ ضرور کریں گے۔" گفتگو خوش گوار ماحول میں ہوئی اور رانا نے بلرام کو ایک دن قیام کے لیے کہا۔ بلرام نے فوراً قبول کر لیا۔

دوسرے دن اُدے ساگر کی جھیل کے کنارے مہمان کے اعزاز میں ایک شان دار ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ اُدے پور کے بڑے بڑے ٹھاکر اور راج پوت سردار ضیافت میں شریک ہوئے۔ یہ دعوت چندا بائی کی ترغیب پر دی گئی تھی۔ دعوت کے اصل مقصد سے شاید رانا بھی واقف نہیں تھا۔ چندا بائی یہ چاہتی تھی کہ بلرام اُدے پور کے ٹھاکروں کے لیے اجنبی نہ رہے تاکہ جب کرشنو کے لیے اُس کے رشتے کا ذکر چھیڑا جائے تو کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ کرشنو کے لیے یہ انتہائی خوشی کا دن تھا۔ وہ جل محل کی جھلملیوں سے جھیل کے کنارے اپنے محبوب کی عزت افزائی کا نظارہ کر رہی تھی۔

امیر خاں کا لشکر آندھی اور طوفان کی طرح جے پور پہنچ گیا۔ مہاراجا سندھیا نے بھی دو مرہٹہ سرداروں کی قیادت میں مدد بھیج دی تھی۔ اب مہاراجا جگت سنگھ کی فوج ایک لاکھ کا ہندسہ چھو رہی تھی۔ اُس میں روہیلے، افغان، مرہٹے، پنڈارے، بھیل اور راجپوت شامل تھے۔ راجا مان سنگھ نے مقابلے کی تیاریوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ راجستھان کے ٹھاکروں کے علاوہ رن کچھ اور صحرائے تھر پارکر کے کئی قبیلے بھی اُس کے ساتھ تھے۔

جے پور اور جودھ پور کی باہمی کشمکش نے پورا راجستھان دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کوئی راجا، کوئی ٹھاکر اور کوئی سردار ایسا نہیں تھا جو کسی فریق کے ساتھ شریک نہ ہو۔ دونوں نے یہ کشمکش راج پوتوں کی غیرت کا سوال بنا لی تھی۔

راجستھان کی سرزمین پر تاریخ کی ایک ہولناک جنگ ہونے والی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا اس کا انجام کیا ہوگا۔ راج پوتوں نے بیشتر جنگیں انجام سے بے پروا ہو کر لڑی تھیں لیکن اگر جنگ کا کوئی اصول اور طاقت کا کوئی نتیجہ ہو سکتا ہے تو مہاراجا جے پور نصف جنگ میدان میں جائے بغیر جیت چکا تھا۔ امیر خاں کے طاقت ور لشکر کے علاوہ راجپوتانے کے بیشتر راجے اور ٹھاکر اسی کے ساتھ تھے۔ اس نے جودھ پور کے اصل وارثِ تخت، اس کی بیوہ ماں اور ٹھاکر سوائی سنگھ کی حمایت حاصل کر کے راجا مان سنگھ کو ظالم اور غاصب حکمراں مشہور کر دیا تھا۔ دریائے نربدا کے جنوب اور شمال میں امیر خاں ایک فیصلہ کن طاقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے کئی بار کمپنی سرکار کی فوجوں کو بھی شکستِ فاش دی تھی۔ جے پور نے اس کی مدد حاصل کر کے سیاسی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔

فروری ۱۸۰۷ء میں امیر خاں جے پور پہنچ گیا۔ طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی۔ جے پور کا سپہ سالار چاند سنگھ امیر خاں کے بڑے لڑکے وزیر الدولہ وزیر محمد خاں اور روہیلہ سالار عمر خاں کی ہمراہی میں جودھ پور سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے بڑھا۔ اس کے بعد ٹھاکر سوائی سنگھ نے راج پوتوں کے پیدل دستوں اور مہاراجا سندھیا کے مرہٹہ سواروں کے ساتھ کوچ کیا۔ پھر مہاراجا جگت سنگھ، بیکانیر اور مارواڑ کے راجاؤں اور ٹھاکروں کی معیت میں خود امیر خاں جے پور سے روانہ ہوا۔

راجپوتانے کی تاریخ ایک نیا ورق الٹ رہی تھی۔ راجاؤں کی دھرتی سواروں، پیدل دستوں اور توپ خانے کی گاڑیوں کی دھمک سے لرز رہی تھی۔ راج پوتوں کی غیرت ایک دوسرے کے لہو میں غسل کرنے والی تھی لیکن اُدے پور اس جنگ سے بے تعلق تھا حالانکہ اُسی کی راج کماری بنائے فساد تھی۔

بلرام رانا کا جواب لے کے واپس آ گیا۔ جے پور کے لشکر روانہ ہو چکے تھے۔ مہاراجا جگت سنگھ کی سواری بھی جا چکی تھی اور روہیلوں کی توپیں جودھ پور پر گولا باری کر رہی تھیں۔ پنوار سردار اپنے بیٹے کے لیے یہ پیغام چھوڑ گیا تھا کہ وہ لوٹتے ہی میدانِ جنگ کا رُخ کرے مگر بلرام کے قدم رن بھومی کے بجائے راج محل کی طرف اُٹھنے لگے۔ وہ مہارانی جے پور سے ملے بغیر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا اس لیے محل پر کڑا پہرا لگا ہوا تھا مگر بلرام کو مہارانی سے ملاقات کرنے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مہارانی نے جلد ہی اُسے باریابی کا شرف بخش دیا۔ وہ جانتی تھی، پنوار سردار کا بیٹا بلرام اُدے پور سے کوئی ضروری پیغام لے کے آیا ہوگا۔ بلرام نے اُس کی خدمت میں حاضر ہو کے تخلیے کی درخواست کی۔ مہارانی نے داروغۂ محلات کو رخصت کر دیا۔ داروغہ کچھ فاصلے پر ایک پردے کے پیچھے موجود تھا۔ ”اب کوئی ہماری گفتگو نہیں سن سکتا۔“

بلرام نے بساط پر پہلا مہرہ چلایا۔ ”غلام محترم مہارانی کے لیے اُدے پور کی راج کماری چندا بائی کا ایک پیغام لے کے حاضر ہوا ہے۔“ چندا بائی کا نام سُن کے مہارانی چونکی۔ وہ اُس کا پیغام سننے کے لیے بے چین اور مضطرب نظر آنے لگی۔ بلرام نے کہا۔ ”اُدے پور کی راج کماری کے لیے ایک جنگ میدانوں میں لڑی جا رہی

حضرت اکبر شاہ ثانی

جامِ جہاں نما یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء کی ایک خبر

راگ سنتے اور زنانے بند و بست میں لڑکیوں کے نہانے کا تماشا دیکھتے۔ خواصیں کس کس خوبی سے لڑتیاں جھپٹیاں اور جھنڈ کے جھنڈ باہم لپٹ کر کنارے سے پانی میں گر پڑتیاں۔ کوئی مسکرا کے بالوں کو نچوڑتی۔ کوئی شرما کر انگیا مروڑتی، ایک دوسرے کی کُرتی چاک کرتی۔ دوسری شرم سے دانتوں میں انگلی پکڑتی، کوئی پکارتی، بوا بہا دَ میں نہ جاؤ۔ کوئی للکارتی، دوگانہ چڑھاؤ۔ غرض ان پری پیکروں، عریاں بدنوں کی چھیڑ چھاڑ جنھوں نے دیکھی وہی جانتے ہیں کہ اُن کے دلوں پر کیا گزری؟ لکھنے سے کیا فائدہ؟ سننے والے کب سچ جانیں گے۔

کراچی سے ظہیر اختر بیدری

ہے اور دوسری محلوں میں۔ راج کماری چندا بائی کی خواہش ہے کہ محلوں میں لڑی جانے والی جنگ کا فیصلہ آپ کے حق میں ہو۔“ مہارانی ہمہ تن گوش تھی۔ ”راج کماری چندا بائی کو آپ سے ہمدردی ہے۔ وہ صرف آپ کی خاطر راج کماری کرشنو کا رشتہ مہاراجا جے پور کو دینے کے حق میں نہیں ہیں۔“

مہارانی نے ایک سرد سانس بھری۔ بلرام کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ سوتن عورت کی کمزوری ہوتی ہے، مہارانی بھی ایک عورت تھی۔ وہ دھیمی اور غم زدہ آواز میں بولی۔ ”مگر چندا بائی کو معلوم ہوگا کہ رجواڑوں کی رانیاں اور راج کماریاں بے بس اور مجبور ہوتی ہیں۔ ہم اگر کوشش بھی کریں تو مہاراجا کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ راج کماری کرشنو اور ہماری قسمت کا فیصلہ تو میدانِ جنگ میں ہوگا۔“

”غلام کو کہنے کی اجازت دیجیے کہ مہاراجا یہ جنگ نواب امیر خاں کی مدد سے لڑ رہے ہیں۔ آپ نواب امیر خاں کی منہ بولی بیٹی ہیں۔ راج کماری چندا بائی کو اُمید ہے کہ اگر آپ نواب امیر خاں کو رضامند کر لیں تو مہاراجا جنگ جیت کر بھی راج کماری کرشنو کو نہیں جیت سکتے۔“

مہارانی کے چہرے پر ایک پرچھائیں سی گزر گئی۔ ”چندا بائی کی اُمید غلط نہیں ہے۔ اب ہم پانسا پلٹ دیں گے لیکن کان کھول کے سن لو، یہ راز باہر نہیں نکلنا چاہیے۔“

”مہارانی غلام پر اعتماد کر سکتی ہیں۔“

پہلے ہی معرکے میں جے پور کے لشکروں نے اپنی برتری ثابت کر دی۔ مہاراجا جگت سنگھ کے راج پوت دستے بے جگری سے لڑے۔ دوسری طرف سے امیر خاں کے افغان، روہیلے، مرہٹے، پنڈارے اور بھیل آسمانی قہر بن کر ٹوٹے۔ جودھ پوری فوج حوصلہ ہارنے لگی۔ راجا مان سنگھ نے فوج کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن روہیلوں کا توپ خانہ قیامت کی آگ برسا رہا تھا۔ گولے ٹھیک نشانے پر پھٹتے اور جودھ پور کے سپاہی گرد و غبار اور دھوئیں کے بادلوں میں گم ہو جاتے۔ مرہٹوں، پنڈاروں اور بھیلوں نے الگ تباہی مچائی۔ صرف چند روز میں راجا مان سنگھ کے ٹھاکر اور سردار بے ہمت ہو گئے۔

علامہ شبلیؒ

لکھنے کا کام صرف صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک کرتے تھے۔ دس بجے کے بعد وہ اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھتے یا لوگوں سے ملاقاتیں کرتے تھے۔ آٹھ بجے سے دس بجے تک کے لیے اُن کی یہ ہدایت تھی کہ چاہے کوئی بھی آئے، اُسے میرے پاس نہ آنے دیا جائے اور چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے خبر نہ کی جائے۔ جب وہ دلّی جاتے تھے تو اُن کا قیام حکیم اجمل خاں کے ہاں ہوتا تھا۔ وہاں بھی وہ آٹھ بجے سے دس بجے تک تخلیہ کرتے تھے، اِن اوقات میں پرندہ بھی اُن کے قریب پر نہیں مار سکتا تھا۔ علامہ شبلی کی تمام معرکہ آرا تصانیف صرف دو گھنٹے روزانہ لکھنے کی کرامت ہیں۔ دو گھنٹے سے زیادہ لکھنا اُن کے نزدیک حرام اور دو گھنٹے پابندی سے لکھنا اُن کے نزدیک فرض تھا۔ یہ فرض وہ سفر و حضر دونوں میں نباہتے تھے۔

دونوں لشکروں کے درمیان آگ اور خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ جودھپور کی مدافعت کے خطوط سمٹنے لگے۔ ایک ٹھاکر دوسرے سردار راجا مان سنگھ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ارکانِ حکومت بھی بھاگے اور اُن کے پیچھے پیچھے راجا بھی بھاگا۔ جودھپور ہار گیا لیکن راجا مان سنگھ نے ہمت نہیں ہاری۔ ہزاروں سپاہی کٹوانے کے بعد وہ اپنے مضبوط قلعے میں جا چھپا۔ امیر خاں، راجا جگت سنگھ اور ٹھاکر سوائی سنگھ اُس کے تعاقب میں تھے۔ قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔

مہاراجا جگت سنگھ نے جنگ جیت لی تھی۔ دوسری طرف بلرام نے بھی محل کا مورچا سر کر لیا تھا۔ مہارانی جے پور نے نواب امیر خاں پر واضح کر دیا تھا کہ وہ راج محل میں اُدے پور کی راج کماری کا داخلہ پسند نہیں کرتی۔ امیر خاں نے بلرام کے باپ پنوار سردار کو اپنی زبان بنایا اور مہاراجا کو پیغام بھیجا کہ اُس نے راجا مان سنگھ سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا ہے اب اُسے راج کماری کرشنو کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔ اُدے پور نے اِس جنگ میں حصّہ نہیں لیا۔ اس لیے اُس پر حملہ کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔

مہاراجا جگت سنگھ یہ پیغام سُن کے بہت جز بز ہوا۔ پنوار سردار نے اسے بتایا کہ اُدے پور کی راج کماری کسی اور کو چاہتی ہے چنانچہ وہ جنگ جیت سکتا ہے مگر راج کماری کا دل نہیں جیت سکتا۔ مہاراجا کے دل پہ ایک اور کوڑا پڑا۔ اُس نے گرج کے کہا۔ ”کیا بکتے ہو؟“

”غلام درست عرض کر رہا ہے مہاراج!“

مہاراجا چند لمحوں تک اُسے خوں خوار نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”آخر وہ کون بدنصیب ہے جسے ہمارا رقیب بننے کا اعزاز حاصل ہوا ہے؟“

بلرام کے باپ نے ہمت کی۔ ”جواب دینے سے پہلے میں اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے جان کی امان چاہتا ہوں۔“

”امان دی گئی۔“

بلرام کے باپ نے سر جھکا لیا۔ ”اُدے پور کی راج کماری آپ کے غلام زادے بلرام پر ملتفت ہیں۔“

مہاراجا نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ بلرام کے باپ نے جودھپور کی فتح پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا تھا جو مہاراجا کا دل کاٹتا ہوا گزر گیا۔ لوہا گرم تھا۔ بلرام کے باپ نے فوراً کہا۔ ”مہاراج نے قول دیا تھا کہ بلرام کی ہر آرزو پوری کی جائے گی۔ وہ درخواست گزار ہے کہ اُسے راج پوری کا قلعہ بخش دیا جائے اور سرکار کی سرپرستی میں راج کماری کے لیے اُس کا پیام جائے۔“

مہاراجا کے چہرے پر کرب و کشمکش کے آثار تھے۔ اُسے بلرام پر، بلرام کے باپ پر اور امیر خاں پر بہت اعتماد تھا۔ یہ لوگ اُس کے دست و بازو تھے۔ انھی کی مدد سے اُس نے جنگ جیتی تھی لیکن یہی لوگ اب اُسے راج کماری کو فراموش کر دینے کا مشورہ دے رہے تھے۔ امیر خاں کا پیغام اور پنوار سردار کی باتیں ناقابلِ فہم نہیں تھیں، حالات رُخ بدل رہے تھے اور وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ بھی بدل جائے۔ اُس نے تذبذب کے ساتھ بلرام اور کرشنو کے روابط کی تفصیل پوچھی اور اُسے سُننے کے بعد تردّد اور انتشار سے دوچار ہو گیا۔ اُسے اپنا فیصلہ سُنانے میں خاصی دیر لگی۔ ”بلرام کی آرزو ضرور پوری کی جائے گی نیز راج پوری کا قلعہ بھی اُسے بخش دیا جائے گا۔“ اُس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

باپ نے لوٹ کے اپنے بیٹے کو مژدہ سنایا کہ مہاراجا راج کماری کرشنو سے دست بردار ہو گئے ہیں اور راج پوری کا قلعہ اُسے مل جائے گا۔ بلرام کو ساری کائنات ہنستی مسکراتی اور رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔

اسی شام اُس کا گھوڑا اُدے پور کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔

★

راجستھان میں جنگ کی جو آگ بھڑکی تھی، وہ ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی، رجواڑوں کی باہمی رقابتیں اور عداوتیں گیلی لکڑیوں کی طرح اندر اندر سُلگ رہی تھیں۔ امیر خاں اپنے لشکر کے ساتھ جودھپور کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ راجا مان سنگھ ہار کر بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ٹھاکر سوائی سنگھ اپنے بہادروں کے ساتھ ناگور چلا گیا تھا اور جودھپور کے ٹھاکروں کو نومولود کنور کی تخت نشینی کے لیے ہموار کر رہا تھا۔ امیر خاں کے پیغام کے بعد مہاراجا جگت سنگھ بھی دل برداشتہ ہو کر جے پور لوٹ آیا تھا۔ راجا دولت راؤ سندھیا کے مرہٹہ سوار، بھیل اور پنڈارے جودھپور کو تاخت و تاراج کرتے پھر رہے تھے۔ اُن کی کچھ ٹکڑیاں اُدے پور کی سرحدوں پر بھی منڈلا رہی تھیں۔

راجا مان سنگھ چالاک لومڑی کی طرح اپنے بھٹ میں دبکا ہوا تھا۔ مہاراجا جگت سنگھ نے اُس کی طاقت کا مان توڑ دیا تھا اور سوائی سنگھ نے جودھپور کی تخت نشینی کا جھگڑا اکھاڑ کے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ اس پریشانی نے اُس کا سکون لوٹ لیا تھا۔ ریاست کے کئی ٹھاکر اس جھگڑے کی وجہ سے اُس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اب اُسے پریشانیوں سے صرف ایک طاقت، صرف ایک شخصیت نجات دلا سکتی تھی، امیر خاں۔ راجا مان سنگھ نے امیر خاں کو

درخواست بھیجی کہ اگر جودھ پور کا محاصرہ اٹھا لیا جائے تو وہ پچاس لاکھ روپے نقد، جنگ کا تاوان ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

راجستھان کی جنگ میں ایک کروڑ بیس لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے امیر خاں نے اپنے توشے خانے کے لیے چار لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر کا الگ مطالبہ کیا۔ مان سنگھ اس پر بھی تیار ہو گیا لیکن اُس نے یہ شرط رکھی کہ اُسے سوائی سنگھ کی شرانگیزی سے نجات دلائی جائے کیونکہ اُس کی موجودگی میں جودھ پور کے تخت و تاج کا جھگڑا ختم نہیں ہوگا۔

امیر خاں اور راجا مان سنگھ کے درمیان مفاہمت کی بات چیت چل رہی تھی۔ دوسری طرف اُدے پور کے محل میں کرشنو کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ چندا بائی نے اپنے بھائی رانا کو مشورہ دیا کہ اگر کرشنو کی نسبت کسی ریاست کے والی سے طے کی گئی تو ہو سکتا ہے جے پور اور جودھ پور کی رقابتیں پھر بھڑک اٹھیں اور راجستھان میں پھر خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اس لیے کرشنو کا ہاتھ کسی ایسے نوجوان کے ہاتھ میں دے دیا جائے جو غیرت مند ہو اور کرشنو کی حفاظت کر سکے۔ اس سلسلے میں چندا بائی نے بلرام کا نام بھی لے دیا۔ رانا کی آنکھوں میں حیرت کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ رانا بلرام کو صرف مہاراجا جے پور کے نمائندے کی حیثیت سے جانتا تھا۔ چندا بائی نے اُسے بتایا کہ مہاراجا جگت سنگھ نے بلرام کو راج پوری کا قلعہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور اُس کی خاطر کرشنو سے بھی دست بردار ہو گیا ہے۔ رانا نے بہن کا مشورہ قبول کر لیا مگر وہ یہ چاہتا تھا کہ شادی کی رسوم انتہائی خاموشی اور رازداری سے ادا کی جائیں۔ صدیوں سے راجستھان کے راجے مہاراجے رانا خاندان کی دامادی اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے تھے اور اُدے پور کی راج کماریں کی رخصتی نہایت شان و شوکت سے عمل میں آتی تھی۔ ملک کے تمام راجاؤں اور بڑے بڑے ٹھاکروں کو شادی کی تقریبات میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی لیکن ۱۸۰۷ء میں کرشنو کے لیے جو جنگ لڑی گئی تھی، اُس نے حالات بدل دیے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رانا اپنی بیٹی کی شادی خاندانی دستور کے خلاف ایک کم حیثیت گھرانے میں کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اُس نے کشت و خون روکنے کے لیے ہار مان لی تھی اور اب یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی بیٹی کی شادی کا چرچا ہو۔

چندا بائی نے یہ خبر کرشنو کو سنائی کہ بلرام سے اُس کا رشتہ منظور کر لیا گیا ہے۔ کرشنو پر شادی مرگ کی حالت طاری ہو گئی، اگر چندا بائی اُسے تھام نہ لیتی تو شاید وہ خوشی سے غش کھا کے گر پڑتی۔ جودھ پور اور جے پور کے راجا ہار گئے تھے مگر کرشنو جیت گئی تھی۔ وہ اپنی پھوپھی کے قدموں میں گر گئی اور چندا بائی نے اپنے قدموں پر نمی محسوس کی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے کرشنو کو فوراً اُوپر اُٹھایا اور اپنے پلّو سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔ یہ مسرت کے آنسو تھے۔

بلرام کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ کامیابی نے اُسے چُن لیا ہے۔ وہ پنوار سرداروں کے ساتھ آئے اور اپنی خوش نصیبی کی ڈولی اُٹھا کے لے جائے۔ شادی کے لیے دو مہینے بعد کی تاریخ رکھی گئی تھی کیونکہ بلرام کے باپ کو شادی کے لیے بہت کچھ بندوبست کرنا تھا۔ ایک روز اُس نے مہاراجا سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ رانا اُدے پور نے اُس کے بیٹے کا پیام قبول کر لیا ہے لہٰذا اگر مہاراجا بلرام کو راج پوری کا قلعہ سونپ دیں تو راج کماری کرشنو کی ڈولی اُسی قلعے میں اُتاری جائے۔

مہاراجا کو محبت کی بساط پر ایک پیادے نے شہ مات دے دی تھی۔ اُس نے زہرخند سے کہا: "بلرام کو راج پوری کا اختیار نامہ بہت جلد دے دیا جائے گا۔ پہلے ہم راج پوری کے موجودہ منصب دار کا کوئی بندوبست کر لیں۔"

انھی دنوں مہاراجا جگت سنگھ نے اپنے محل میں مہاراجا سندھیا کے ایک سردار سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے صرف چند روز بعد مرہٹوں، بھیلوں اور پنڈاروں کی جو ٹکڑیاں اُدے پور کی سرحدوں پر منڈلا رہی تھیں، وہ ریاست کے اندر گھس کے لُوٹ مار کرنے لگیں۔ اُدے پور کا رانا راجستھان کی جنگ سے الگ تھلگ رہا تھا۔ اُس نے یہ نیا خطرہ محسوس کیا اور فوراً کمپنی سرکار سے مدد کی درخواست کی۔ مرہٹوں اور انگریزوں کی کشمکش میں رانا نے کمپنی کا ساتھ دیا تھا اس لیے اُسے اُمید تھی کہ کمپنی سرکار مہاراجا سندھیا کے خلاف فوراً حرکت میں آجائے گی مگر کمپنی نے اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ کمپنی کے کلکتہ ہیڈ کوارٹر میں رانا کی درخواست پر انتہائی سرد مہری کا اظہار کیا گیا۔ لارڈ کارنوالس کے جانشین گورنر جنرل سر جارج بارلو نے وہ درخواست آر کے حقیر تنکے کی طرح پرے پھینک دی اور راجستھان کے معاملات میں مداخلت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ امیر خاں کی موجودگی میں کمپنی سرکار راجستھان میں کوئی مداخلت کرنے سے بچنا چاہتی تھی۔ اُسے خطرہ تھا کہ اگر روہیلہ سردار غضب ناک ہو گیا تو وہ سندھیا کے ساتھ مل کے برطانوی حکومت کے لیے ایک بڑا خطرہ بن جائے گا۔ اسی سیاسی مصلحت سے کمپنی نے اُدے پور کو مرہٹوں کی تاخت کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ سندھیا کے مرہٹوں کے علاوہ روہیل کھنڈ کے بعض افغان بھی لوٹ مار میں شامل ہو گئے۔ ماضی میں بھی اُن کی لوٹ مار کا حلقہ دریائے نربدا سے دریائے ستلج تک وسیع تھا مگر اُس وقت امیر خاں جودھ پور کے راجا مان سنگھ سے اپنے تعلقات درست کر رہا تھا اس لیے مرہٹوں اور پنڈاروں کا اُدے پور میں گھُس آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رانا نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پُراسرار خطرے کے پیچھے مہاراجا جے پور کے ہاتھ حرکت کر رہے ہوں۔

اُدے پور میں مرہٹوں کی تاخت کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پُراسرار دشمن غالباً اُدے پور پر حملہ کرنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ رانا سخت مضطرب اور پریشان تھا۔ پہلے بیٹی کا غیر معمولی حُسن اُس کے لیے بلائے جاں ثابت ہوا تھا، اب اگر سلطنت ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہو گا؟ اُس کا خاندان صدیوں سے اُدے پور کا دفاع کر رہا تھا۔ رانا کا فرض تھا کہ وہ راج پوتوں کی اس روایتی سرزمین کی

حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے مگر وہ تنہا تھا اور دشمن ہاتھ کی لکیروں کی طرح جمگھٹا کر رہے تھے۔ اس نے بیٹی کے لیے حالات کا فیصلہ قبول کر لیا تھا اور اب اس نے اپنی سلطنت کے لیے پانسا پھینکا تو اسے یہاں بھی امیر خاں کا چہرہ نظر آیا۔ اس آڑے وقت میں وہی اسے پراسرار دشمنوں سے بچا سکتا تھا۔ رانا نے فوراً امیر خاں کی طرف قاصد دوڑایا۔

امیر خاں رانا اُدے پور کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس ریاست سے کچھ تاریخی روایتیں وابستہ تھیں۔ ایک بہادر جرنیل کی طرح امیر خاں وہ روایتیں زندہ و تابندہ رکھنا چاہتا تھا۔ قاصد کے پہنچتے ہی وہ بگولے کے مانند اُڑتا ہوا اُدے پور پہنچا۔ رانا نے اس کا بہترین استقبال کیا اور اُدے پور کے دفاع کی خاطر چوتھائی ریاست امیر خاں کی نذر کر دی۔

امیر خاں اپنا لشکر لے کے اُن مقامات کی طرف لپکا جہاں مہاراجا سندھیا کے مرہٹہ سواروں نے تباہی پھیلا رکھی تھی۔ امیر خاں کا نام سُن کے وہ افغان رسیلے، پنڈارے اور بھیل چھٹنے لگے جو سندھیا کے مرہٹہ سواروں کے ساتھ لوٹ مار میں شامل ہو گئے تھے۔ جے پور کے راج پوت بھی مہاراجا جگت سنگھ کے اشارے پر سرحدی تاخت میں حصہ لے رہے تھے۔ وہ بھی فرار ہو گئے۔ امیر خاں نے صرف چند روز میں بگڑی ہوئی حالت سنبھال لی۔ اُدے پور پر چھائے ہوئے خطرے کے بادل روہیل کھنڈ کی تیز ہوائیں اُڑا کے لے گئیں۔

کرشنو بے حد خوش تھی۔ امیر خاں اس کے باپ ہی کا نہیں، اس کا بھی محسن تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسی نے مہاراجا جگت سنگھ کو اس کا خیال ترک کرنے کا مشورہ دیا تھا اور یہ امیر خاں ہی کے مشورے کا اثر یا خوف تھا کہ جگت سنگھ اس کے اور بلرام کے راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اُدے پور اور امیر خاں کی دوستی کا سب سے بڑا فائدہ کرشنو کو پہنچنے والا تھا کیونکہ اس کا محبوب جے پور سے تعلق رکھتا تھا اور اگرچہ جے پور اور اُدے پور کے درمیان محض اس کی وجہ سے تعلقات استوار نہیں ہو سکے تھے۔ نیز مہاراجا جگت سنگھ نے اپنے دل پر ناکامی کا ایک زخم بھی کھایا تھا لیکن امیر خاں کی طاقت نے دونوں ریاستوں پر بادل کی طرح سایہ کر رکھا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ سایہ اسے راج پوری میں بھی حاصل رہے گا۔ امیر خاں نے اُدے پور کے رانا کو اپنا پگڑی بدل بھائی بنا لیا تھا۔ اس اعتبار سے کرشنو اب اس کی بھتیجی ہو گئی تھی۔

بلرام کی طرف سے اسے متواتر یہ پیغام مل رہے تھے کہ عنقریب مہاراجا جگت سنگھ اسے راج پوری کا اختیار سونپنے والا ہے۔ بلرام کے باپ نے راج پوتوں کے دستور کے مطابق شادی کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور دوسرے ہزار سرداروں کے ساتھ مقررہ تاریخ پر اُدے پور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ راجستھان کی روایات کے پیشِ نظر چاند کی چودھویں رات کو شادی ہونی تھی اور ہزار سردار اسی روز اُدے پور پہنچنے والے تھے۔ جے پور سے آخری خبر یہ آئی تھی کہ بلرام کو راج پوری کا اختیار چاند کی دس تاریخ تک مل جائے گا اور قلعہ کرشنو کے خیر مقدم کے لیے آراستہ کر دیا جائے گا۔

اُدے پور کی روایات کے خلاف راج کماری کو رخصت کرنے کے لیے راجاؤں اور ٹھاکروں کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس شان و شوکت سے بھی اجتناب برتا جا رہا تھا جو رجواڑوں کی تہذیبی زندگی کا حصہ تھی پھر بھی وہ ایک راج کماری کی شادی تھی لہٰذا راج محل میں کئی دن پہلے سے چہل پہل شروع ہو گئی۔ جیسے جیسے چاند کی تاریخیں گزر رہی تھیں، کرشنو کے شہابی عارضوں پر شفق کھلتی جا رہی تھی۔ اس کا حسن اور نکھرتا اور سنورتا جا رہا تھا۔ اس کے متناسب مرمریں بدن پر خوشبوؤں میں بسا ہوا اُبٹن ملا جا رہا تھا تاکہ وہ اور بھی ملائم اور شفاف ہو جائے۔ راج کماری اپنے محبوب کے لیے دلہن بنائی جا رہی تھی۔

چاند کی تیرھویں رات اُدے پور کے قدیم لوک گیتوں اور سنگیت کی مدھر تانوں میں بیت گئی۔ نئے دن کا سورج طلوع ہوا۔ اُدے ساگر جھیل کے کنارے ہزار سرداروں کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہاں ایک آرائشی دروازہ کھڑا کر دیا گیا۔ دولھا کو براتیوں کے آگے آگے اسی دروازے سے گزرنا تھا لیکن اس کے گزرنے کا دروازہ تو دلھن کے دل میں تعمیر ہوا تھا۔ کرشنو نے جل محل کی کھڑکی سے جھیل کے کنارے آراستہ دروازہ دیکھا اور شرما کے اپنا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا لیا۔ یقیناً اس کا بلرام اپنے قبیلے کے سرداروں کے ہمراہ جے پور سے رخصت ہو چکا ہوگا۔ اس کی آمد کسی بھی وقت متوقع ہے۔ کرشنو تصور میں اس کے گھوڑے کی ٹاپیں اور گونجتی ہوئی ٹاپیں سُن رہی تھی جنھیں سنتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں مگر آج وہ ٹاپیں ابھی تک سنائی نہیں دی تھیں۔ کرشنو کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ دل زنجیر کئی دنوں سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اسی لمحے اس کی سہیلی پورنیما نرم قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے جھیل کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑے ہو کے اپنی پُر درد آواز میں گانا چھیڑ دیا۔ "کاہے کو بیاہی بدیس"۔ جھیل کی لہروں پر کرشنو کا دل ڈوبنے لگا۔

آج بابل کے گھر میں اس کا آخری دن تھا۔ پورنیما کے گیت کی لے تھمی تو کرشنو کی بھیگی ہوئی پلکوں سے آنسوؤں کے ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ پورنیما نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ جل محل کے کسی کمرے میں ڈھولک بج رہی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ پر کچھ لڑکیاں یہی گیت گا رہی تھیں۔ "کاہے کو بیاہی بدیس"۔ پورنیما کرشنو کو بازوؤں سے تھام کے وہاں لے گئی جہاں اسے عروسی لباس پہنایا جانے والا تھا۔

جھیل کے کنارے شامیانے آراستہ ہو چکے تھے۔ محل میں کرشنو دلھن بنا دی گئی تھی اور ہزار سرداروں کا انتظار ہو رہا تھا۔ کچھ چوب دار جے پور کے راستے پر کھڑے کر دیے گئے تھے تاکہ وہ جیسے ہی مہمانوں کو دیکھیں، فوراً محل اطلاع بھجوا دیں مگر ابھی تک کوئی سوار نمودار نہیں ہوا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ انتظار میں شدت پیدا ہونے لگی۔ محل میں پریشانی محسوس کی جانے لگی۔ لوگوں کی خاموش نظریں سوال کر رہی تھیں۔ "ہزار سردار

ابھی تک کیوں نہیں آئے؟" انتظار ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ سورج کا سنہرا تھال خوں رنگ شفق میں ڈوبنے لگا۔ اُفق پر آسمان اور زمین گلے مل رہے تھے۔ یکایک جے پور کا راستہ ٹاپوں سے بج اٹھا۔ صرف ایک سوار گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا اُدے پور میں داخل ہوا۔ شور بلند ہوا کہ "راج کماری کا دولہا آگیا۔ راج کماری کا دولہا آگیا۔"

مگر وہ بلرام نہیں تھا بلکہ جے پور کا ایک ایلچی تھا۔ اُس کے گھوڑے کی خرجی میں رانا کے لیے ایک پیغام تھا۔ اُسے فوراً محل میں کرشنو کے باپ رانا کے پاس پہنچا دیا گیا۔ وہاں رانا، چندا بائی اور ٹھاکر اجے سنگھ برات کا انتظار کر رہے تھے۔ راج پوت ایلچی بے خوفی سے اندر داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں گھوڑے کی خرجی تھی۔ وہ براہِ راست رانا سے مخاطب ہوا "راج کماری کی رخصتی پر مہاراجا جے پور نے آپ کے لیے ایک تحفہ بھیجا ہے۔"

ایلچی نے خرجی سے ایک کٹا ہوا انسانی سر نکالا اور اُسے رانا کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ بلرام کا سر تھا۔ کرشنو کا بہادر محبوب جے پور میں قتل کر دیا گیا تھا۔

رانا اور ٹھاکر اجے سنگھ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چندا بائی کے منہ سے ایک جگر خراش چیخ نکلی، وہ تیورا کر گر پڑی۔ راج پوت ایلچی رانا اور اجے سنگھ کے سنبھلنے سے پہلے واپس جا چکا تھا۔

اجے سنگھ نے بلرام کا کٹا ہوا سر اٹھایا اور اُسے پھر خرجی میں ڈال دیا۔ چندا بائی بتدریج ہوش میں آ رہی تھی۔ غم کی شدت سے رانا کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اُس نے دکھ سے کہا "آج کرشنو کا ہونے والا دولہا دوسری بار مرا ہے۔ شاید ہماری بیٹی کی قسمت میں کوئی دولہا نہیں ہے۔"

"اگر راج کماری میری بیٹی ہوتیں" ٹھاکر اجے سنگھ نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا، "تو میں اُن کی شادی موت سے رچا دیتا۔ راجا بھیم سین کے بعد انھیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اگر وہ اپنے منگیتر کے ساتھ ہی مر جاتیں تو راجستھان میں خون کی ندیاں نہ بہتیں۔ مرہٹے، روہیلے اور پنڈارے ہمارے دیس میں اس طرح نہ گھستے اور راج پوتوں کی غیرت بندوقوں کا نشانہ نہ بنتی۔" وہ چندا بائی سے مخاطب ہوا "گستاخی معاف! راج کماری کی دوسری منگنی کر کے اپنے بھائی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا آپ نے لگایا ہے۔ اُدے پور کی آن آپ نے لوٹی ہے، ہماری عزت آپ نے مجروح کی ہے اور اگر آپ چاہتی ہیں کہ اُدے پور کے راج پوت اپنی گردن کبھی اونچی نہ کر سکیں تو جائیے کرشنو کے لیے کوئی تیسرا بر تلاش کر لیجیے۔"

رانا زخمی شیر کے مانند گرج کے بولا "ٹھاکر اجے سنگھ! تم نے ہماری غیرت کا مذاق اُڑایا ہے۔ ہم اُدے پور کی راج پوتی آن کے محافظ ہیں اور ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ اب کرشنو کی شادی موت ہی سے ہو گی اور آج ہی ہو گی۔ چندا بائی! جاؤ بیٹی کے لیے زہر کا پیالہ تیار کرو۔ ہم اُسے اپنے ہاتھ سے امرت پلائیں گے۔" چندا بائی کی آنکھوں سے ایک عزم جھانک رہا تھا۔ وہ پُروقار انداز سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

کرشنو دلھن بنی بیٹھی تھی۔ وہ اس فکر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ بلرام ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ اُس نے تو قول دیا تھا کہ میں اپنی جان پر کھیل کے بھی تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ پھر وہ کیوں نہیں آیا؟ چندا بائی وہاں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک کٹورا تھا اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ کرشنو سمجھی کہ شاید اُس کا دولہا آگیا ہے اور چندا بائی اُسے مطلع کرنے آئی ہے مگر چندا بائی کے پیچھے پیچھے رانا اور ٹھاکر بھی تھے۔ کرشنو چونک سی گئی۔ اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ چندا بائی چاندی کا کٹورا لیے ایک طرف کھڑی تھی۔ رانا بیٹی کے سامنے پہنچ گیا۔ بیٹی نے تمام تر حیا کے باوجود ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا "پتا مہاراج! کیا پنوار سردار ابھی تک نہیں آئے؟"

رانا نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور پُرعزم آواز میں بولا "بیٹی! بے شک پنوار سردار نہیں آئے لیکن تمھارا دولہا ضرور آئے گا، تمھاری ڈولی ضرور اٹھے گی۔ اگر ڈولی نہیں اٹھے گی تو ارتھی اُٹھے گی اور موت تمھیں وداع کر کے لے جائے گی۔ یہ تمھارے غیرت مند باپ کا فیصلہ ہے۔ آج ہم تمھارے خون سے اپنے ماتھے کا داغ دھونا چاہتے ہیں تاکہ ٹھاکر اجے سنگھ کی طرح کوئی راج پوت آیندہ ہمیں بے غیرتی کا طعنہ نہ دے سکے۔"

کرشنو سمجھ گئی کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ اُس نے مضبوط آواز میں کہا "پتا مہاراج! آپ کا سر اُونچا رہنا چاہیے مگر ہم یہ پوچھنے کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ کیا مرنے سے پہلے ہمیں بلرام کی صورت دیکھنے کی اجازت ہے؟"

"تمھاری یہ خواہش پوری کر دی جائے گی۔"

کرشنو نے خود آگے بڑھ کے چندا بائی کے ہاتھ سے زہر کا پیالا لے لیا اور ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی گھونٹ میں اُسے خالی کر دیا۔ چندا بائی بہت تیز زہر لے کے آئی تھی۔ زہر نے فوراً کرشنو کا جگر کاٹنا شروع کر دیا۔ کرشنو کا سر چکرانے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پہ ایک ہی لفظ تھا "بلرام"۔ رانا کے اشارے پر ٹھاکر نے بلرام کا کٹا ہوا سر نکالا اور سنگ مرمر کی گول میز پہ رکھ دیا۔ کرشنو نے کٹا ہوا سر دیکھا اور ایک دل دوز چیخ مار کے گر گئی۔ محل کے کسی کونے سے ڈھولک کی تھاپ پہ آواز آ رہی تھی "کاہے کو بیاہی بدیس۔"

چندا بائی نے سرخ یاقوتوں کی دو انگوٹھیاں کرشنو کی مردہ انگلیوں میں پہنا دیں۔

اس ماہ کے لیے ریاض فرشوری کا انتخاب

سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر ہیں۔

اردو کے مایۂ ناز ادیب احمد ندیم قاسمی کی کہانی

رحمان کا باپ جنگ میں مارا گیا اور ماں امن میں ماری گئی جس کا نسخہ مغربی مدبّروں نے ایشیائی مزاج کے لیے خاص طور سے تجویز کر رکھا تھا۔ باپ رنگون اور امپھال کے درمیان ایک جاپانی بم کی زد پر آ کر بکھر گیا اور ماں گاؤں اور اسپتال کے درمیان چلتے چلتے دم توڑ بیٹھی۔ اسپتال والے کہتے تھے کہ اس کے پیٹ میں درد شدید ہو جائے گا جبھی وہ اسپتال میں داخلے کی حق دار ہو سکے گی۔ ایک دن خوش قسمتی سے شدید درد اٹھا تو وہ رحمان کو ساتھ لے کر اسپتال کی طرف بھاگی مگر راستے ہی میں گر کر لوٹنے اور چیخنے لگی اور مرنے سے پہلے رحمان کا ایک ہاتھ اس زور سے مروڑ ڈالا کہ رحمان غصّے کے مارے "اماں کمّاں، ہٹماں" کہہ کر پیچھے ہٹ گیا اور رونے لگا۔

وہ ایک برس تک یوں ہی روتا رہا۔ اس کے رشتے داروں میں صرف ایک پھوپھی زندہ تھی جو پردیس میں بیاہی گئی تھی۔ وہ اپنی بھابھی کے پرسے کے لیے گاؤں آئی اور واپس جاتے ہوئے اپنے بھائی کی نشانی ساتھ لیتی گئی۔ رحمان کے پھوپھا نے اپنے گاؤں میں کپڑے اور چمڑے کی دکان کھول رکھی تھی۔ وہ روز بہ روز امیر ہو رہا تھا اور شاید اسی لیے کنجوس بھی ہو رہا تھا۔ چند روز بیوی سے کہتا رہا کہ "رحمان کو ایک روٹی سے زیادہ کھانا دینے کی ضرورت ہی کیا ہے، کُل سات آٹھ سال کا تو لونڈا ہے اور ندیدہ اتنا کہ روٹیوں کا ٹوکرا بھی بھر کر رکھ دو تو آن کی آن میں جھاڑ پھیر دے۔ اس سے کہہ دو کہ آپے میں رہے ورنہ اپنے گاؤں کی راہ لے۔ میں دن بھر دکان میں بیٹھا تمہارے بھتیجے کے لیے سر تھوڑا پھوڑتا رہتا ہوں، کبھی میری بھی اولاد ہوگی یا پیرِ دستگیر محبوبِ سبحانی کی برکت سے!"

رحمان نے یہ باتیں سن لی تھیں۔ اس روز وہ دن بھر بھوسے کی کوٹھری میں چھپا روتا رہا۔ شام کو بھوک لگی تو پھوپھی کے پاس یوں سمٹتا ہوا آیا جیسے اب تک وہ اس کی روٹیاں چرا چرا کر کھاتا رہا ہے۔ پھوپھی نے اس کے بالوں سے بھوسے کے تنکے چنے، پیار کیا اور اسے نصیحت کی کہ وہ ایک روٹی سے زیادہ کھانا نہ کھایا کرے ورنہ اس کا ہاضمہ بگڑ جائے گا اور وہ مر جائے گا۔ نصیحت کرنے کے بعد جب اس نے ایک بار پھر رحمان کے ماتھے پر پیار کیا تو رحمان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پھوپھی کے ہونٹ قینچی کے پھل ہیں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ پھوپھی نے اسے تسلیاں دیں مگر وہ یوں روتے جا رہا تھا جیسے پھوپھی کی ہر تسلی اس کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے گالی بن جاتی ہے۔ اس وقت اوپر سے پھوپھا آ گیا اور جب بیوی نے اسے بتایا کہ رحمان دن بھر بھوسے کی کوٹھری میں پڑا اپنی ماں کی یاد میں روتا رہا ہے تو پھوپھا کی آنکھوں

میں خون اُتر آیا"۔ ساٹھ ستر روپے کے بھوسے کا ناس مار دیا ہوگا لونڈے نے۔ میں حیران ہوں یہ تم شیشے کے گھر میں بندر کیوں پال رہی ہو۔ دیکھو رحمو۔ اگر تم نے پھر کبھی بھوسے کی کوٹھری میں قدم رکھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ میرا ہاتھ بہت بھاری ہے سمجھے؟"

رحمان نے ڈر کر ایک ہی روٹی پر اکتفا کر لی اور بھوسے کی کوٹھری کی طرف بھولے سے بھی نہ دیکھا لیکن ایک دن جب وہ شام کو ایک روٹی لینے کے لیے پھوپھی کے پاس آیا تو پھوپھا نے کڑک کر کہا۔ "پوچھ لو اس حرام زادے سے"

رحمان کو اُس کی ماں نے بتایا تھا کہ گالی کے جواب میں گالی دینے والے کی زبان پر پھوڑا نکل آتا ہے اور جو گالی سُن کر بدلہ نہ لے اُس کے لمبی سی دُم نکل آتی ہے اور بدلہ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ گالی دینے والے کا منہ نوچ لو، ڈھیلا کھینچ مارو، لاٹھی چلاؤ، بے شک جان سے مار دو پر گالی کا جواب گالی میں نہ دو۔ ایک بار اُس کے جی میں آئی کر چولہے سے جلتی ہوئی لکڑی اُٹھا کر پھوپھا کے جبڑے پر دے مارے مگر اُسی وقت اُس کی پھوپھی اُٹھی اور اس کے پاس آکر بڑے پیار سے بولی۔ "سچ سچ بتا دو بیٹے! کہاں رکھے ہیں؟"

"کیا؟" رحمان نے حیران ہو کر پوچھا۔

پھوپھا گرجا۔ "تیری ماں کے خصم۔"

"روپے میرے بچے! روپے"۔ اُس کی پھوپھی فوراً بولی۔ "سچ سچ بتا دو میں تمھیں اُن میں سے ایک روپیہ دے دوں گی کہاں رکھے ہیں؟ بھوسے کی کوٹھری میں تو نہیں ہیں کہیں؟"

رحمان کچھ کہنے کے لیے اپنے چپکے ہوئے خشک ہونٹ ابھی کھول ہی رہا تھا کہ اُس کا پھوپھا چارپائی سے اُٹھا اور بیوی کو ہاتھ کے جھٹکے سے دھکیل دیا۔ "یوں گھی مکھن لگانے سے کام نہیں چلے گا۔ سُن بے لونڈے تو نے میری واسکٹ کی اندرونی جیب سے زیادہ نہ کم، پورے پندرہ روپے نکالے ہیں۔ وہ سیدھی طرح یہاں میرے ہاتھ پہ رکھ دے ورنہ یہیں بیٹھ کر تیرا قیمہ بنا ڈالوں گا، بتا۔" اُس نے رحمان کو تھپڑ مارنے کے لیے ایک ہاتھ تان لیا۔

رحمان بگولے میں پھنسا ہوا کاغذ کا پُرزہ ہو رہا تھا۔ پلکیں یوں جھپک رہا تھا جیسے آنکھوں میں مٹی گھُس گئی ہو۔ ہونٹ کھُلے ہوئے تھے، میلے میلے گلابی رنگ سے گلاب غائب ہو گیا تھا صرف میل باقی رہ گیا تھا۔ بس اتنا کہہ سکا 'کون سی واسکٹ؟' پھر ایک دم اُس کی اُجڑی ہوئی آنکھوں میں آنسو پھیل گئے۔ اُس کے نیچے والا ہونٹ ذرا سا لٹک گیا، ٹھوڑی میں چند شکنیں پیدا ہوئیں، نتھنے پھڑکے اور وہ زار زار رونے لگا۔

"کون سی واسکٹ!" پھوپھا یوں آگے بڑھا جیسے اُسے روند کر نکل جائے گا۔ "ابے وہی سیب کے بٹنوں والی اور کون سی!"

رحمان نے پھوپھی کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بہت اونچی آواز میں فریاد کی۔ "مجھے خدا کی قسم، نبی جی کی قسم، مجھے پیر دستگیر کی قسم پھوپھی! میں نے واسکٹ چھوئی بھی ہو تو میرے ہاتھ ...."

پھوپھی لپک کر آئی اور اپنے شوہر سے بولی۔ "سیب کے بٹنوں والی واسکٹ کہاں رکھی ہے؟ میں نے تو وہ کالی صوف والی واسکٹ دیکھی تھی۔"

پھر رحمان کو تنہا چھوڑ کر دونوں اندر بھاگ گئے۔ ذرا دیر بعد پلٹے تو پھوپھی کہہ رہی تھی۔ "خواہ مخواہ میرے بچے پر تہمت لگاتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟ اپنے روپے ایک بار پھر گن لو، ہمارے خاندان نے قتل کیے ہیں، پر چوری کبھی نہیں کی۔ ہاں، ایک روپیہ اِدھر لاؤ۔ یہ میرے بچے کا انعام ہے۔ خواہ مخواہ رُلا دیا بیچارے کو۔ بے کر کھانا حرام کر ڈالا، اِدھر لاؤ روپیہ۔"

رحمان ایک دم خاموش ہو گیا۔ آنسو اُس کے گالوں پر بہتے جا رہے تھے لیکن اُس کی سسکیاں اور ہچکیاں تھم گئی تھیں۔ پھوپھی نے شوہر سے ایک روپیہ چھین لیا اور رحمان کی طرف بڑھی۔ پھوپھا بولا۔ "آج نہیں تو کل چرا لے گا۔ ندیدہ تو ہے ہی۔ یتیم لڑکا تو ندیدہ ہوتا ہی ہے چاہے کسی ملک کے لاٹ صاحب کا لڑکا ہو۔"

پھوپھی نے رحمان کے پاس آکر اُسے اکٹھے بہت سے پیار کر ڈالے، پھر اُس کی مٹھی کھول کر اُس میں روپیہ رکھا اور اُس کی انگلیاں بند کر کے اُس کی بلائیں لیں، دوسرے ہاتھ کی انگلی پکڑ کر اُسے کوٹھے میں لے آئی۔ مجبور کر کے کھانا کھلایا اور جب وہ دوسری روٹی سے ایک نوالہ توڑنے لگی تو رحمان پہلی بار بولا۔ "نہیں پھوپھی! بس۔"

"کیوں؟" پھوپھی نے پیار بھرے غصّے میں پوچھا۔

"ہاضمہ بگڑ جاتے گا۔" رحمان بولا۔

پھوپھی یکایک رو دی اور چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ رحمان باہر نکلا تو پھوپھا چارپائی پر بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔ وہ اُس کے پاس آیا اور روپیہ اُن کی ران پر رکھ کر بولا۔ "میں نہیں لیتا۔"

"لے۔" پھوپھا نے روپیہ اُٹھا لیا۔

"ہاں بس نہیں لیتا۔" رحمان نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا اور پلٹ کر صحن سے باہر چلا گیا۔

وہ اُس صحن میں پھر کبھی داخل نہ ہوا کیونکہ وہ رات کی رات گاؤں سے نکلا اور کہیں آدھی رات کو ایک کھیت کی مینڈھ پر جا کر ذرا سستایا۔ پھر وہیں سو گیا۔ صبح وہ اُٹھا تو کھیتوں پر دھوپ چمک رہی تھی اور قریب ہی ایک درخت کے ٹھنٹ پر ایک کوّا بیٹھا چیخ رہا تھا۔ رحمان پہلے تو حواس باختہ بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر رونے لگا اور روتے روتے "امّاں، امّاں" پکارنے لگا۔ کافی دیر تک رونے کے بعد اُس نے غصّے سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ "امّاں۔ کمّاں۔ ٹھمّاں۔" وہ اُٹھا، آنسو پونچھے اور کسانوں سے اپنے گاؤں کا پتہ پوچھتا ہوا شام سے پہلے گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوا تو یوں بے اختیار رونے لگا جیسے اُسے کسی نے گالی دے دی ہے۔ لوگوں نے

لسے پہچان لیا تھا۔ وہ اسے ڈلاسا دیتے، تھپکتے اور تنگ آکر آگے نکل جاتے۔ اُس کے گرد بہت سے لڑکے جمع ہو گئے جو اُسے بڑی ہمدردی سے دیکھتے پھر آپس میں سرگوشیاں کرتے۔" بے چارے کی ماں مر گئی تھی نا پچھلے سال"۔

" ماں تو میری بھی مر گئی ہے پر میں تو یوں نہیں روتا"۔

" تمہارا باپ تو ہے نا یار۔ اس کا تو باپ بھی نہیں ہے"۔

" ہاں ہاں، اس بے چارے کا تو باپ بھی نہیں نا"۔ وہ پھر ہمدردی سے رحمان کو دیکھنے لگتے جو اَب زور زور سے ہچکیاں لینے لگا تھا اور آنسو پونچھتے پونچھتے اُس کے گالوں کی جلد چھل گئی تھی۔ شام کو اُس کے پاس راجا اللہ نواز کا سائیس آیا اور اسے بڑے پیار سے بتایا کہ راجا اللہ نواز نے اُسے اپنے پاس بُلایا ہے۔

راجا اللہ نواز گاؤں کا کھاتا پیتا بزرگ تھا۔ زمینیں بھی خاصی تھیں، طب میں بھی کچھ درک تھا اور مفت علاج کرنے کی وجہ سے وہ مرجعِ عوام ہو گیا تھا۔ دردِ شقیقہ، دردِ طحال اور دردِ دنداں دُور کرنے کے لیے اُس کے پاس تیر بہدف تعویذ اور دَم تھے۔ پھر وہ بلا کا تہجد گزار تھا اور روزانہ سینکڑوں نوافل پڑھنے میں تو وہ یکتا تھے روزگار سمجھا جاتا تھا۔ اُس کے اصطبل میں دو گھوڑے برسوں سے موجود تھے۔ گھر کے لیے سودا سلف خود خرید لاتا تھا لیکن اُن گھوڑوں سے اُسے اتنی محبت تھی کہ اُن کے لیے کم از کم دو خدمت گزار تو ہمیشہ موجود رہتے۔ رحمان جب راجا اللہ نواز کے پاس آیا تو اُس وقت نمازی شام کی نماز پڑھ کر اُس کی بیٹھک میں جمع ہو گئے تھے۔ سب کے سامنے اُس نے رحمان کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولا۔

" دیکھو بیٹا! تم یتیم ہو۔ یوں پھوٹ پھوٹ کر روؤ گے تو مجھے ڈر ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ گاؤں غرق ہی نہ کر دے۔ تمہارا باپ مرا تو اس میں گاؤں والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تمہاری ماں چل بسی تو یہ بھی اُس کی قسمت کا لکھا تھا۔ یہ سب کام خداوند تعالیٰ کے ہیں جو بڑا بے نیاز اور بے پروا ہے اس لیے خدا کے لیے اتنا نہ روؤ کہ تمہارا صبر اس بے قصور گاؤں پر ٹوٹے۔ میں سارے گاؤں کی طرف سے تمہارے آنسو پونچھنے کو تیار ہوں۔ یوں کرو کہ یہیں میرے اصطبل میں رہو۔ تمہاری نوکری یہ ہے کہ گھوڑوں کے تھان صاف رہیں، اِدھر گھوڑے لید کریں تو اُدھر تم جھاڑو سے اصطبل آئینہ بنا دو۔ اس نوکری کے بدلے میں ہر روز شام کا کھانا تم میرے گھر سے کھانا، سمجھے؟ اوپر سے سال میں ایک دو مرتبہ تمہیں میرے بچوں کی اُترن بھی ملتی رہے گی۔ سو میں تمہیں انشاء اللہ تعالیٰ ننگا بھی نہیں رہنے دوں گا۔ باقی رہا صبح کا کھانا تو اُس کا انتظام یوں ہو جائے گا کہ میرے خاندان کے جتنے بھی گھر ہیں، اُن کے ہاں کا کوڑا اُٹھا کر باہر گھورے پہ پھینک آیا کرو، اور بس۔ سب پردہ نشین بی بیاں ہیں۔ نائن میراثن آئے تو کوڑا اُٹھے، تمہاری وجہ سے یہ فائدہ ہو گا کہ گھر صاف رہیں گے بس۔ اتنا سا کام ہے تم اس گاؤں کے بیٹے ہو اور تمہارے سر پہ ہاتھ رکھنا میرا فرض ہے، کیوں بھئی، کیا غلط کہا ہے میں نے؟"

نمازی تو اس دوران میں راجا اللہ نواز کی سخاوت سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ بعض رقیق القلب لوگوں پر رقت تک چھا گئی۔ ایک نے راجا اللہ نواز کو داتا اللہ نواز کہہ ڈالا۔ رحمان کو ایک شخص ایک طرف لے گیا۔ راجا اللہ نواز کے گھر سے کھانا آیا تھا جس میں دو روٹیاں تھیں اور اُن پر خود رحمان کی مٹھی سے بھی بڑی دو پیاز کی گانٹھیں رکھی تھیں۔ اُس نے آناً فاناً روٹیوں کا صفایا کر دیا اور پھر بیٹھک میں جا کر راجہ اللہ نواز سے کہا۔" جی میں نے روٹی کھالی ہے"۔

راجا اللہ نواز بولا۔" بہت اچھا کیا"۔

رحمان نے بڑی معصومیت سے کہا۔" جی میری نوکری ابھی لگ گئی کہ صبح سے لگے گی؟"

راجا اللہ نواز اور دوسرے نمازی ہنسنے لگے۔ راجا بولا۔" ابھی سے لگ گئی بیٹا!"

رحمان نے اسی انداز میں کہا۔" تو جی پھر یہ بتا دیجیے کہ جھاڑو کہاں رکھا ہے؟"

نمازی اور زور سے ہنسنے لگے مگر راجا اللہ نواز سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اُس نے کندھے سے بڑا نیلا رومال اُتار لیا، اپنی آنکھیں پونچھ کر رحمان کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔" نہیں بیٹا! میں نے غلط کہا تھا، تمہاری نوکری صبح سے لگے گی"۔

مگر رحمان کی منطق کا سلسلہ جاری تھا، فوراً بولا۔" پر کھانا تو مجھے ابھی سے ملنے لگا ہے جی؟"

راجا اللہ نواز کے ہونٹ اُس کی داڑھی اور مونچھوں سے لٹک آئے اور وہ زار زار رونے لگا۔" اسے لے جاؤ"۔ اُس نے روتے ہوئے کہا۔" اس بچے کو لے جا کر سُلا دو ورنہ مجھے ڈر ہے کہ ابھی بھونچال آ جائے گا اور ہم سب دھرتی کے پیٹ میں اُتر جائیں گے اور یہ حرام موت ہو گی۔ لے جاؤ اسے۔ جاؤ بیٹا، جاؤ، کلمہ پڑھ کر آرام سے سو جاؤ، بڑوں سے بہت دلیل بازی نہیں کرتے، خداوند تعالیٰ خفا ہو جاتا ہے"۔

رحمان نے سوچا کہ خداوند تعالیٰ اُس سے خوش ہی کب تھا جو اب خفا ہو گا؟ آخر رحمان نے اُس کا کیا بگاڑا ہے؟ اُس نے تو کبھی کسی کو گالی تک نہیں دی۔ اُس نے تو زندگی میں صرف ایک بار چوری کی تھی اور وہ بھی ایک آنے کی پنسل کی۔ پھر جب اُستاد نے اُس کی پانچ اُنگلیوں کے درمیان چار پنسلیں رکھ کر اُنگلیاں دبا دی تھیں تو اُس نے چیخ کر سچ بول دیا تھا۔ " میری نہیں، غلام یاسین کی ہے"۔ پھر اُس نے تو ماں تک کو ساری بات سچ سچ بتا دی تھی اور ماں نے کہا تھا کہ رحمان نے پھر کبھی چوری کی تو وہ اسے تینتیس دھاریں نہیں بخشے گی اور جس بچے کو اُس کی ماں تینتیس دھاریں نہ بخشے، وہ ساری عمر لوگوں کی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ اس کے بعد سے

اُس نے آج تک کوئی چوری نہیں کی تھی لیکن وہ لوگوں کی ٹھوکریں نواب تک کھا رہا تھا۔ تو کیا ماں نے مرنے سے پہلے اسے بتّیس دھاریں نہیں بخشی تھیں؟ "اماں، کتاں، ٹھماں!" وہ غصّے میں پکار اُٹھا پھر رونے لگا اور یوں ہی روتے روتے سو گیا۔

صبح اصطبل میں پھاوڑے سے لید جمع کرتے ہوئے اُسے ماں یاد آ گئی۔

ایک بار کوٹھا لیپنے کے لیے جب وہ گارا بنانا چاہتی تھی تو اُسے گارا گاڑھا کرنے کے لیے اُس میں گھوڑے کی لید ملانے کا خیال سوجھا۔ ٹوکرا سر پر رکھ کر وہ سارے گاؤں میں گھوم آئی تھی مگر اُسے کہیں سے لید نہ ملی تھی۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملتا کہ آج وہ بھی گارا بنا رہے ہیں۔ بعض سگھڑ گھرانے تو لید خشک کر کے اُس سے ایندھن کا کام لیتے تھے اور آج رحمان کے پاس ٹوکروں لید جمع رکھی ہے مگر ماں نہیں جو گارا بنا سکے۔ فوراً اُس کے ذہن پر اپنا کوٹھا اُبھرا اور وہ پھاوڑا پھینک کر گلی میں بھاگنے لگا۔ جب وہ اپنے کوٹھے کے سامنے پہنچا جس میں اُس نے زندگی کے سات برس گزارے تھے تو یہ دیکھ کر اُس کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر رہ گئی کہ کوٹھے کی چھت گر چکی ہے اور ٹوٹی ہوئی دیوار پر دو بلّیاں آمنے سامنے بیٹھی دُمیں پھیلائے غرّا رہی ہیں۔ ایک پتھر اُٹھا کر اُس نے بلّیوں کی طرف پھینکا اور چلّایا "ہٹ جاؤ، حرام زادیو! سوٗر کی بچیّو! اُلّو کی پٹھیو!" بلّیاں بھاگ گئیں مگر اُسے کچھ ایسا لگا جیسے اُس کی زبان میں جلن ہو رہی ہے اور زبان کی نوک پر ایک پھوڑا نکل رہا ہے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر کسی طرح بلّیاں پکڑ لائے اور اُنھیں دیوار پر بٹھا کر اُن سے بڑے پیار سے کہے کہ "غرّاؤ، شوق سے غرّاؤ اور مجھے معاف کر دو۔" اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی ماں سامنے دیوار سے لگی کھڑی ہے اور اسے بڑے غصّے سے گھور رہی ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور دیر تک روتا رہا اور جب راجا اللہ نواز کا سائیس اسے بیٹھک میں لے آیا تو راجا اللہ نواز وظائف پڑھ رہا تھا۔ اُس نے اپنا گریبان اُٹھا کر اُس میں چھوکی اور بولا "رو کیوں رہے ہو بیٹا؟"

رحمان نے پھر سے روتے ہوئے کہا "جی آج میں نے گالی بکی ہے اور ماں کہتی تھی کہ جو گالی بکے گا، اُس کی زبان میں پھوڑا نکل آئے گا۔"

راجا بولا "ٹھیک ہی تو ہے۔" پھر رحمان کو پاس بلایا، اُس کا منہ کھول کر اُس میں چھوکی اور کہا "اب پھوڑا ووڑا نہیں نکلے گا لیکن تم نے گالی دی کسے؟"

رحمان معصومیت سے بولا "جی دو بلّیوں کو!" راجا اللہ نواز یوں بے اختیار ہو کر ہنسا کہ رحمان تک کو ہنسی آ گئی اور وہ اصطبل میں جا کر پھاوڑے سے کھیلنے لگا۔

آہستہ آہستہ وہ اس زندگی کا عادی ہو گیا۔ وہ صبح کو راجا اللہ نواز کے ہاں جا کر چھاچھ کا ایک پیالہ پیتا پھر اُس کے گھر کا گوڑا ایک ٹوکرے میں بھر کر گلی کے نکڑ پر ایک گھورے پر پھینک آتا۔ راجا کے خاندان میں سات گھر تھے، گوڑے کے یہ سات ٹوکرے ڈھونے کے بعد وہ اصطبل آتا اور پھاوڑا سنبھال لیتا، گھوڑے کے تھانوں پر ریت پھیلاتا تاکہ کیچڑ نہ ہونے پائے پھر ایک خالی ناند کا سہارا لے کر اوپر چھت گھورتا رہتا جس میں عموماً بھڑیں اُڑتی رہتیں۔ جب کوئی بھڑ مکڑی کے جالے میں پھنس جاتی تو بھڑ اور مکڑی کی آپس میں خوب لڑائی ہوتی۔ مکڑی بھڑ کو دبوچنے کے لیے آگے بڑھتی تو بھڑ کالا سا ڈنک نکال کر مدافعت کرتی اور مکڑی جالے کے پرلے سرے تک بھاگ جاتی۔ پھر جب کبھی دو بھڑیں آپس میں گتھ کر نیچے گرتیں تو وہ ایک بھڑ سر کی طرف سے پکڑ کر اُس کا ڈنک نوچ لیتا اور اُس کی ٹانگ میں دھاگا باندھ کر اُسے اُڑنے کے لیے چھوڑ دیتا اور خوب ہنستا، پھر ایک دم اُسے پھاوڑا استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی اور وہ اپنے کام میں جُٹ جاتا۔ اب ماں بھی اُسے بہت کم یاد آتی تھی اور یاد آتی بھی تھی تو رحمان کی آنکھیں نہیں ڈبڈباتی تھیں۔ وہ بس ذرا سا اُداس ہو جاتا۔ تب اوپر چھت میں بھڑ اور مکڑی کی جنگ شروع ہو جاتی اور وہ خالی الذہن ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگتا۔

گرمیوں میں گوڑے کے ٹوکروں کا بوجھ اچانک بڑھ گیا۔ راجا اللہ نواز کے خاندان میں منوں تربوز کھائے جانے لگے اور اُن کے موٹے موٹے چھلکوں سے ٹوکرے اَٹ اَٹ گئے۔ کئی بار اُسے ایک ایک گھر کا گوڑا دو بار لے جانا پڑتا اور جب وہ چھلکے گھورے پر پھینکتا تو اُسے اُن پر دانتوں کے نشان نظر آتے اور اُس کے دانتوں میں کُھل سی ہونے لگتی۔ کئی چھلکوں پر تربوز کا گلابی گودا باقی رہ جاتا تھا۔ ایسے چھلکے گندگی کے ڈھیر پر پھینکتے ہوئے وہ سوچتا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جنھیں تربوز کھانے کا سلیقہ تک نہیں آتا۔ ایک میری ماں تھی کہ گودا چھری سے یوں کاٹتی تھی کہ چھلکے پر گلابی رنگ کا ایک ذرّہ تک کہیں باقی نہ رہے اور ایک یہ راجے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے گھروں سے ساری چھریاں چوری ہو گئیں۔ پھر اُس کے منہ میں آج سے ڈیڑھ دو برس پہلے کے تربوزوں کا ذائقہ پانی بن کر اُمڈ آتا اور اس کا کیسا کیسا جی چاہتا کہ چھلکوں سے بچا کھچا گلابی رنگ چاٹ لے لیکن وہ ہمیشہ اس گندے ارادے پر قابو پا لیتا۔ ویسے ٹوکرا گھورے پر اُلٹ کر چھلکے کُرید کُرید کر دیکھنے کی اُسے عادت ہو گئی تھی۔ اب تربوزوں کے ساتھ خربوزوں کے چھلکے بھی شامل ہونے لگے تھے اور راجا اللہ نواز کے ہاں کی گندگی میں تو اُسے ایک دن آموں کی گٹھلیاں بھی نظر آ گئی تھیں۔ اُس وقت رحمان کے پیٹ میں چھاچھ چھل چھل چھلکتی معلوم ہوتی اور زبان کی جڑ میں آم کا ذائقہ جیسے چمٹ کر رہ گیا۔

ایک روز وہ ٹوکرا اُلٹ کر گندگی کُرید رہا تھا جب اُسے سلولائیڈ کا ایک بھلا چنگا گڈا انگریزی ٹوپی پہنے، ہاتھ میں کالے رنگ کی چھڑی لیے کوڑے میں لپٹا ہوا ملا۔ گڈا اپنے چولے سے جھاڑ پونچھ کر غور سے دیکھا

تو اسے بے اختیار ہنسی آ گئی، گڈے کی ایک آنکھ سے پتلی غائب تھی۔ ایک ہاتھ میں خالی ٹوکرا لٹکاتے اور دوسرے ہاتھ میں گڈا لیے اصطبل کے پاس سے گزرا تو جی میں آئی کہ گڈا یہیں کہیں چھپا کر رکھ دے۔ پھر دن بھر اس سے کھیلا کرے۔ کبھی اسے سر کے بل کھڑا کر دے، کبھی سُلا دے اور کبھی ٹہلاتے لگ پھرا۔ ایک دم اس کے کان گرم ہو گئے اور گلا خشک ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے راجا اللہ نواز کے ہاں جا کر گڈا اس کی بیوی کے سامنے رکھ دیا اور بولا "جی بی بی جی، یہ گڈا کوڑے میں چلا گیا تھا۔"

راجا اللہ نواز بھی قریب ہی بیٹھا باد امی پر کلمۂ شہادت پڑھ رہا تھا، فوراً اٹھا اور بولا "شاباش بیٹا! تم نے چوری نہیں کی تمھیں آج انعام ملے گا۔" اندر جا کر وہ تربوز کی ایک پھانک اٹھا لایا اور رحمان کے ہاتھوں پر رکھ دی۔

اصطبل میں آ کر وہ پھانک پر پل پڑا اور چھلکے کی سفیدی تک نوچ ڈالی۔ سخت سخت چھلکے نے اس کا ذائقہ بگاڑ دیا اور اس نے سوچا۔ "اونہہ بڑا راجا بنا پھرتا ہے، انعام ہی دینا تھا تو وہ گڈا ہی دے دیتا۔ تربوز کی ایک پھانک بھی انعاموں میں کوئی انعام ہے۔ بھئی ایک چھوٹا سا تربوز ہی اٹھا کے دے دیتا، ذرا سا تربوز کا پانی تو پی لیتے واہ!"

ایک روز بڑے زور کی بارش ہوئی۔ دوسرے دن جب رحمان چھاچھ پینے کے لیے راجا اللہ نواز کے ہاں جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ گلیوں میں ہر طرف تربوز اور خربوزوں کے ڈھیر لگے ہیں اور لوگ ٹوکرے بھر بھر کے خریدے لیے جا رہے ہیں۔ ایک لڑکے کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ بارش کے بعد تربوزوں اور خربوزوں میں پانی بھر جاتا ہے اور وہ گل جاتے ہیں اس لیے کسانوں نے کھیت کے کھیت صاف کر دیے ہیں اور اب انھیں اونے پونے بیچ رہے ہیں۔ رحمان کو اچانک راجا اللہ نواز پر غصہ آ گیا۔ نوکری لگتی ہے تو تنخواہیں ملتی ہیں۔ یہ بھی کیا بھئی دن بھر اصطبل صاف کرو، سیروں کوڑے کے ٹوکرے اٹھاؤ اور بدلے میں دو روٹیاں اور پیاز کی دو گانٹھیں لے کر اللہ کا شکر ادا کرو۔ کنجوس مکھی چوس مہینے میں ایک آنہ ہی دے دیتا تو ہم یہ جاتی بہار کا پھل تو ذرا سا چکھ لیتے۔

بچے کل پیٹ اور سینے سے چار چار پانچ پانچ خربوزے لگتے بھاگے جا رہے تھے اور وہ راجا اللہ نواز کے ہاں چھاچھ پینے چلا تھا۔ ایک بچے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ایک خربوزہ گر کر دور لڑھک گیا۔ رحمان نے لپک کر خربوزہ اٹھایا، اسے جھاڑا اور یوں ہی ذرا سا سونگھ کر اسے بچے کے حوالے کر دیا۔ خربوزے کی خوشبو اس کی ناک سے چپٹی چلی آئی اور اس نے جی میں کہا، "سو سو روپے شرط، یہ خربوزہ کھانڈ کی طرح میٹھا تھا، پھیکا نکلے تو ناک کٹوا ڈالوں۔"

صحن میں جا کر اس نے گھڑوں کے پیچھے سے اپنا پیالہ اٹھایا اور اسے دھو کر راجا کی بیوی کے پاس آیا۔ چھاچھ پی کر وہ خوف زدہ سا ہو گیا

اسے کچھ ایسا لگا جیسے اس نے خوب پیٹ بھر کر تربوز اور خربوزے کھانے کے بعد اوپر سے چھاچھ پی لی ہے اور اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح ہیضہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس نے اپنی ناک مل ڈالی جس میں سے خربوزے کی خوش بو کم بخت نکلتی نہ تھی۔ اسے اپنے اس شبہے پر ہنسی آ گئی اور وہ کوڑے کا ٹوکرا اٹھا کر باہر چلا گیا۔

گھورے پر جا کر اس نے کوڑا کریدا۔ چھلکوں کے نیچے کوٹھوں کے فرش کی مٹی تھی، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے، راجا اللہ نواز کے حقے کی جلی ہوئی تمباکو تھی۔ رحمان سناٹے میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے کوڑے کے نیچے اس نے بچھو دیکھ لیا ہو۔ پھر اس کے خشک ہونٹ ذرا سے پھڑکے اور وہ مسکرانے لگا، ہاتھ بڑھا کر کاغذ کا ایک پرزہ اٹھا لیا۔ یہ ایک روپے کا نوٹ تھا۔

نوٹ مٹھی میں بند کر کے اور ٹوکرا چھوڑ کر وہ بھاگا اور اصطبل کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنی مٹھی کچھ یوں کھولی جیسے نوٹ کے پر ہیں اور موقع پاتے ہی وہ پھر سے اُڑ جائے گا۔ مٹھی ایک بار پھر سختی سے بند کر کے وہ لپکا اور گلی میں تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر کے پاس جا کر رکا۔ گدھوں سے خربوزوں کے بھرے ہوئے بورے اتارے جا رہے تھے اور ڈھیر اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ آنے جانے والے پرلی دیوار سے لگ لگ کر گزر رہے تھے۔ ایک دم سے ایک ہی بار اکٹھے ایک روپے کے تربوز اور خربوزے خریدنے کے لیے اس نے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور کان گرم ہو گئے۔ ادھر سے کسان بولا "اب یہاں کوئی مداری کا کھیل ہو رہا ہے؟ لینا ہے تو لے نہیں تو گھر کی راہ لے۔ لینا ہے کچھ؟"

رحمان پلٹ آیا۔ وہ سیدھا راجا اللہ نواز کے پاس گیا اور نوٹ اس کے سامنے رکھ کر بولا "جی یہ روپیہ کوڑے میں چلا گیا تھا۔"

راجا اللہ نواز چونکا اور اپنی بیوی کو ڈانٹا۔ "کچھ سُنا؟ اب روپے بھی کوڑے میں اُٹھے جا رہے ہیں۔ تم نے گھر کی ایسی ہی خبر گیری کی تو کبھی میں بھی کوڑے میں اُٹھ جاؤں گا۔ رحمان نیک بچہ ہے بے چارہ کوئی اور ہوتا تو یہ ایک روپیہ تو گیا تھا۔ ادھر آ، اسے کہیں سنبھال کے رکھ دے۔" پھر وہ رحمان سے مخاطب ہوا "جیو بیٹا جیو۔ خداوند تعالیٰ تمھیں اس کا اجر دے گا۔ یہ تمھارے خاندان کی شرافت ہے۔ تمھاری جگہ کوئی کمین ہوتا تو سر پر قرآن رکھ کر بھی انکار کر دیتا، جیو۔" اس نے رحمان کے سر پر پھیرنے سے ہاتھ پھیر دیا۔

"ٹوکرا کہاں چھوڑ آئے ہو؟" راجا اللہ نواز کی بیوی نے پوچھا۔ وہ نوٹ اندر بڑے کوٹھے میں صندوقوں کی قطار کے اوپر ایک کٹورے کے نیچے رکھ رہی تھی۔

"جی ٹوکرا؟" رحمان نے کہا "جی ہاں، ٹوکرا۔" اس نے خود ہی جواب

دیا اور بھاگا۔ ٹوکرا گھوڑے پر پڑا دیکھ کر اُس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اُسے صحن میں اُٹھا لایا۔

آج اُس نے باقی چھ گھروں کے ٹوکرے گھوڑے پر اُلٹ دیے مگر نقلیں گرنے دیا نہیں۔ وہ بہت نڈھال ہو رہا تھا، قدموں میں سیسہ بھر گیا تھا گھٹنوں میں ذرا بھی دم نہیں تھا۔ خالی ٹوکرے کے بوجھ نے اُس کا ایک کندھا جھکا رکھا تھا۔

کوڑا ڈھونے کے بعد وہ اصطبل آیا اور ناند کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ لید کی ڈھیریاں لگی تھیں مگر اُس نے پھاوڑا پاؤں سے پرے دھکیل دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کافی دیر بعد وہ اُٹھا اور پاؤں گھسیٹتا راجا اللہ نواز کے صحن میں داخل ہوا۔ گھر کے سب لوگ پرلی طرف سائے میں کھانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ راجا کی بیوی نے اُسے دو روٹیوں پر پیاز کی دو گانٹھیں رکھ کر دیں اور بولی۔ "ٹھیرو پیازیں مجھے دے دو آج میں تمھیں مرچوں کا اچار دوں گی۔" اُس نے پیازیں اُٹھا کر روٹیوں پر دو مرچیں رکھ دیں اور رحمان بڑے کوٹھے کے سائے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔

اچانک اُس کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ وہ روٹی چبانے کے بجائے نگلنے لگا اور آن کی آن میں صفایا کر کے اُٹھا۔ ذرا سا جھک کر پرلی طرف دیکھا، سارا گھرانا کھانے میں مصروف تھا، وہ ہونٹ دانتوں میں دبا کر بڑے کوٹھے میں گیا، بلی کی طرح پلنگ پر چڑھا اور سب سے پہلے والے صندوق سے کٹورا اُٹھا کر روپے کا نوٹ مٹھی میں بھینچ لیا۔ پلنگ سے اُترا تو اُس کے چہرے پر ہلدی کھنڈ چکی تھی۔ دروازے تک آیا تو یکایک بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور پلنگ کی چادر سے اپنے پاؤں کے نشانات جھاڑ دیے۔ باہر آ کر اُس نے کنکھیوں سے پرلی طرف دیکھا، سب کھانے میں مگن تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب صحن کے وسط میں آیا تو راجا کی بیوی بولی۔ "رحمان؟"

"ارے!" رحمان اُچھل پڑا۔ سب ہنسنے لگے۔ "کیا ہوا؟" بیوی نے پوچھا۔ "ڈر گیا بے چارہ، تمھاری آواز بھی تو ماشاء اللہ ہے؟" راجا بولا۔

"جی۔" رحمان نے کافی دیر بعد جواب دیا۔ اُس کی آواز خود اُس سے نہیں پہچانی گئی۔

"کھا چکے کھانا؟" بیوی نے پوچھا۔

"جی۔" رحمان کی ڈھارس بندھی۔

"اچھا تھا؟" بیوی نے پھر پوچھا۔

"جی۔" رحمان نے کہا پھر ہمت کر کے چند الفاظ بڑھائے۔ "جی بڑا مزے دار تھا۔"

"اچھا۔" بیوی بولی۔

رحمان باہر گلی میں آ گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے نوٹ کی بہت سی چونچیں نکل آئی ہیں اور وہ ان سب چونچوں سے اُس کی ہتھیلی اور اُنگلیوں پر ٹھونگیں مارے جا رہا ہے۔ رحمان نے نوٹ دوسری مٹھی میں لے لیا اور پہلی مٹھی کا پسینہ چولے پر رگڑ دیا۔ تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر کے پاس پہنچتے ہی وہ مڑ گیا اور اصطبل چلا گیا۔ ٹھیک ہے۔ اُس نے سوچا، چوری کی جائے تو مائیں تینتیس دھاریں نہیں بخشتیں مگر جب ماں مر چکی ہو تو تینتیس دھاروں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ رہا عمر بھر ٹھوکریں کھانے کا سوال تو اس سے زیادہ اور کیا ٹھوکریں کھاؤں گا؟ اور پھر ایک روپے کی چوری بھی کوئی چوری ہے؟ بڑے ہو کر راجا کو پورا روپیہ ادا کر دوں گا بھئی یہ تو اُدھار ہے، کما کر اُتار دوں گا، ایسی بھی کیا بات ہے۔ مطمئن ہو کر وہ باہر آیا اور فیصلہ کیا کہ تربوز اور خربوزے اس گلی سے خریدنا حماقت ہے۔ کسی دوسری گلی میں چلتے ہیں، وہیں خریدیں گے، وہیں کھائیں گے اور پھر مسجد میں جا کر ہاتھ منہ دھو لیں گے، اللہ اللہ خیر سلّا۔

وہ گلیاں طے کرتا ہوا تیز تیز جا رہا تھا۔ ایک گلی میں اُسے گھڑے گھڑے کے برابر تربوز پڑے نظر آئے، وہ اُن کی طرف بڑھا مگر ایک جگہ جا کر یوں ایک دم تھم گیا جیسے دلدل میں پھنس گیا ہے۔ اُس کی نظریں اپنے کھنڈرے پر جم گئیں جس کی چھت گر چکی تھی اور جس کی ٹوٹی ہوئی دیواروں پر بلیاں لڑتی تھیں۔ اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کوٹھے کے کھنڈر میں سے اُس کی ماں پیٹ کے درد سے کراہتے ہوئے اور روتے ہوئے نکلی ہے اور اُس کے قریب آ کر اُس نے رحمان کے منہ پر ایک زنّاٹے کا تھپڑ مار دیا ہے۔

یکایک وہ پوری شدّت سے واپس بھاگا۔ اسے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کی ماں لمبے لمبے ڈگ بھرتی اُس کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ وہ گلیوں میں اُڑا جا رہا تھا۔ وہ اصطبل کے پاس بھی نہیں رُکا۔ راجہ اللہ نواز کی حویلی میں بھی وہ اسی طرح بھاگتا ہوا داخل ہوا اور کوزے سے ہاتھ دھوتے ہوئے راجا اللہ نواز کے پاس جا کر دھم سے گرا اور دو تین لڑھکنیاں کھا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ "کیا ہے؟ ارے کیا ہوا؟" سارا گھرانا اُس کے اِردگرد جمع ہو گیا۔

رحمان نے بھنچی ہوئی مٹھی سے نوٹ نکالا اور راجا اللہ نواز کے قدموں میں رکھ کر جیسے کہیں پاتال سے بولا۔ "جی میں نے آپ کا یہ روپیہ چُرا لیا ہے۔"

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، تڑپ کر اُٹھا، بھاگ کر صحن سے نکلا۔ اصطبل میں جا کر لید کی ڈھیریوں میں لوٹنے لگا اور بلبلا کر کہنے لگا۔ "میں پھر چوری نہیں کروں گا۔ میں کبھی چوری نہیں کروں گا اماں!"

پھر اچانک اُٹھ کر اُس نے غصّے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور پوری قوّت سے پکارا۔ "اماں، کماں، ٹھماں" اور بلکتا ہوا ناند میں گر گیا۔

رشوت

فلیچر فلورا ٥ ش م جمیل

اگر ایسا ہو جائے تو کتنے تشنہ

کاموں کے دن نہ پھر جائیں

وہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا۔ دوسرے سراغ رسانوں کی طرح اُس نے کام کا کوئی علیحدہ اصول نہیں بنایا تھا۔ وہ ہر ایسا کام کرنے کے لیے تیار رہتا تھا جس کے لیے کوئی مؤکل اُس کی فیس ادا کر سکے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ جب سے اُس نے یہ پیشہ اختیار کیا تھا، اُس کے پاس صرف طلاق کے معاملات آتے تھے۔ ان معاملات میں اب وہ خاصا تجربے کار ہو گیا تھا۔

اگر اُس کا کوئی مؤکل طلاق لینے کا خواہش مند ہوتا اور تفتیش سے یہ ثابت ہو جاتا کہ فریق مخالف میں ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے جسے بنیاد بنا کر طلاق حاصل کی جا سکے تو گیسپر مناسب معاوضے پر ایسی بنیاد بھی پیدا کر دیتا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ کسی کام میں اپنے ضمیر اور پیشہ ورانہ اصولوں کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

گیسپر دیکھنے میں جتنا بدصورت نظر آتا تھا، کام میں اتنا ہی ماہر تھا۔ وہ گنجے سر، پستہ قد، باہر کی طرف نکلی ہوئی توند، بھاری جبڑوں، بے رنگت لٹکتے ہوئے موٹے ہونٹوں اور چھوٹی چمک دار آنکھوں والا آدمی تھا۔ اُس کے تخیل کی پرواز بہت اُونچی تھی۔ اُس کا زیادہ وقت تصوراتی دنیا میں بسر ہوتا تھا جہاں اُس کی خواہش اور حکم کے مطابق ہر قسم کے معجزے ظہور پزیر ہوتے تھے۔ اُس نے کام کے سلسلے میں خود پر کبھی کوئی قید عائد نہیں کی تھی۔ پھر بھی تمام توقعات کے برعکس اُس کا کاروبار زیادہ نہیں چل سکا تھا۔ ضروریات پوری کرنے کے بعد اکثر اُسے مکان اور دفتر کے کرائے ادا کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے دفتر میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ جب وہ کام کے سلسلے میں باہر ہوتا تھا تو دفتر میں تالا لگا رہتا تھا۔

ایک روز ہرشل نامی ایک مؤکل اُس کے مختصر سے دفتر میں داخل ہوا۔

وہ ایک دُبلا پتلا اور دراز قد آدمی تھا۔ کہیں کہیں سے اُس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ "تشریف رکھیے مسٹر ہرشل!" تعارف کے بعد گیسپر نے کہا۔ ہرشل بیٹھ گیا۔

"فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"بات یہ ہے کہ میں آپ کے پاس خود نہیں آیا ہوں۔ دراصل میری بیوی نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔"

"حکم کیجیے، میں آپ کی بیوی کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہمارے پڑوس میں مسٹر ولسن اپنی بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ میری بیوی مسٹر ولسن کی حرکات و سکنات کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے، یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے۔ ہم نے کوشش تو کی تھی لیکن ناکام رہے۔"

گیسپر کرسی پر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا: "شاید آپ کو مسٹر ولسن پر کچھ شک ہے کہ وہ کسی غیر قانونی پیشے سے منسلک ہیں؟"

"جی ہاں، میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔" ہرشل کی انگلیاں میز سے کھیلنے لگیں۔ وہ اپنے خیالات مرتب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "بات یہ ہے کہ مسٹر ولسن تین سال قبل ہمارے پڑوسی بنے تھے۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے اپنی وہ مخصوص عادت شروع کر دی، میرا خیال ہے، اُسے عادت کہنا مناسب نہیں ہو گا۔ دراصل وہ دونوں میاں بیوی بہت پُراسرار قسم کے ہیں۔ جب میری بیوی مسٹر ولسن کی بیوی سے خاصی بے تکلف ہو گئی تو اُس نے اُس سے مسٹر ولسن کے پیشے اور حرکات و سکنات کے بارے میں کچھ سوالات کیے لیکن وہ ہر سوال کا جواب ٹال دیتی تھی۔ جب میری بیوی کے تعلقات میں شدت پیدا ہوئی تو مسٹر ولسن کی بیوی کا دوستانہ رویہ بھی بدل گیا اور ایک روز اُس نے سختی سے کہہ دیا کہ آیندہ اُس سے اس قسم کا کوئی سوال نہ کیا جائے۔ یہیں سے اس واقعے کی ابتدا ہوتی ہے۔"

"واقعے کی ابتدا؟" گیسپر اپنے موکل کے اندازِ بیان سے کچھ اُلجھ گیا تھا۔ "مسٹر ہرشل! میری درخواست ہے کہ آپ اپنا مدعا صاف لفظوں میں بیان کیجیے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں جناب!" ہرشل نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "مسٹر ولسن حجامت کی ایک دُکان کے مالک ہیں اور اپنی دکان میں خود بھی یہی کام کرتے ہیں۔ بال کاٹنا اور شیو وغیرہ بنانا مگر اُن کا معیارِ زندگی اُن کے پیشے کی نسبت بہت بلند ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُس چھوٹی سی دُکان سے اتنی آمدنی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک شان دار زندگی بسر کر سکیں، خاص طور پر اس لیے بھی کہ مسٹر ولسن سنیچر کو دُکان پر نہیں جاتے۔ ہر جمعے کی شام کو تقریباً چھ بجے مسٹر ولسن گھر سے رخصت ہوتے ہیں اور اپنی گاڑی میں سوار ہو کے کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ اُن کے پاس درمیانے سائز کا ایک بیگ ہوتا ہے اور وہ گھر سے ہمیشہ تنہا نکلتے ہیں۔ اُن کی واپسی اتوار کی رات کو نو اور دس بجے کے درمیان ہوتی ہے۔ اوقات میں کبھی کبھار تبدیلی ہو جاتی ہے مگر پروگرام میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اب بتائیے کیا خیال ہے آپ کا؟ ہے نا عجیب بات؟" ہرشل نے فاتحانہ انداز میں گیسپر کو دیکھا۔

"بظاہر تو اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے مسٹر ولسن ہفتے کے دو دن کسی دوسری جگہ کوئی اور کاروبار کرتے ہوں جس میں زیادہ آمدنی ہوتی ہو۔"

"درست ہے، ہم نے اس پہلو پر غور کیا تھا لیکن آپ یہ بھی تو سوچیے کہ سنیچر حجاموں کے لیے شدید مصروفیت کا دن ہوتا ہے۔ آخر ایسا کون سا کاروبار ہو سکتا ہے جس کے لیے مسٹر ولسن سنیچر کو دُکان سے غیر حاضر رہتے ہیں؟"

"مسٹر ہرشل! ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔ آئیے اب معاملے کی بات کریں۔ کیا آپ میری خدمات اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے پڑوسی کا تعاقب کروں اور یہ معلوم کروں کہ وہ جمعے کی شب کہاں جاتا ہے اور مسلسل دو روز تک کیا کرتا رہتا ہے؟"

"میں نہیں، میری بیوی یہ معلوم کرنا چاہتی ہے جناب!"

"چلیے یہی سہی لیکن یہ بتائیے اگر میری تفتیش کا نتیجہ آپ کی بیوی کے لیے مایوس کن ثابت ہوا تو کیا اس صورت میں بھی آپ میرا معاوضہ ادا کریں گے؟ یعنی اگر یہ ثابت ہو گیا کہ مسٹر ولسن کسی غلط پیشے سے منسلک نہیں ہیں یا اُن کی حرکات و سکنات حیرت انگیز اور غیر معمولی نہیں ہیں؟"

"میں نے اور میری بیوی نے اس امکان پر بھی غور کر لیا ہے۔ ہم آپ کا معاوضہ ہر صورت میں ادا کریں گے۔"

"اس کام میں میرے معاوضے کے علاوہ کچھ اخراجات بھی ہوں گے۔ محتاط اندازے کے مطابق سو ڈالر کافی ہونے چاہئیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"سو ڈالر؟" ہرشل کا چہرہ اُتر گیا۔ "میرا اور میری بیوی کا خیال تھا کہ پچاس ڈالر کافی رہیں گے۔"

"خیر آپ پچاس ڈالر دے دیجیے لیکن اگر اخراجات پچاس سے زیادہ کے ہو گئے تو میں زائد رقم اپنے بل میں شامل کر دوں گا۔ یہ بتائیے آپ پچاس ڈالر نقد ادا کرنا پسند کریں گے یا چیک دیں گے؟"

ہرشل پچاس ڈالر کا چیک بنا کے لایا تھا۔ اُس نے بٹوے سے چیک نکال کے گیسپر کے حوالے کر دیا۔ چیک پر دستخط اُس کی بیوی نے کیے تھے۔ گیسپر نے ولسن کی دُکان اور مکان کا پتہ لکھ لیا اور ہرشل سے اُس کا مختصر حلیہ معلوم کر لیا تاکہ شناخت میں آسانی رہے۔

جمعے کی شام گیسپر نے بیگ میں لباس کا ایک جوڑا رکھا اور بیگ گاڑی کی پچھلی نشست پر پھینک کے ولسن کے مکان کی طرف چل دیا۔ ایک روز پہلے وہ ولسن کی دُکان پر اُسے کام کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا اس لیے اب اُسے پہچاننے میں کسی غلطی کا احتمال نہیں تھا۔ وہ پانچ بجے ہی ولسن کے مکان سے کچھ فاصلے پر جا کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں مکان کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ احاطے میں ایک سیاہ سیڈان کار کھڑی تھی۔ چھ بجے کے قریب ولسن مسکراتا ہوا مکان سے نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سیاہ چرمی بیگ تھا۔ اُس کا تعاقب شروع ہو گیا۔

ولسن کی شخصیت بلاشبہ غیر معمولی تھی۔ گیسپر ان معاملات میں تقریباً بے حس تھا مگر وہ ولسن کی شخصیت سے فوراً مرعوب ہو گیا۔ ولسن پستہ قد آدمی تھا، نہ دراز قد۔ اُس کی کمر سیدھی تھی اور چال میں ایک تناؤ یا نہ وقار تھا۔ وہ موٹا تھا نہ دُبلا۔ اُس کے بال گہرے سلیٹی تھے البتہ کنپٹیوں سے بھورے ہونے لگے تھے۔ اُس کی آنکھیں قدرے بڑی اور خواب ناک تھیں۔ ناک کھڑی اور ستواں تھی۔ ہونٹ بھرے بھرے اور بازو مضبوط تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک وجیہہ اور پُرکشش آدمی تھا۔ نہ معلوم اُس کی عمر کیا تھی؟ وہ تیس سال کا بھی ہو سکتا تھا اور پچاس سال کا بھی۔ اُسے دیکھتے ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ ایک سدا بہار اور شگفتہ مزاج شخص ہے اس لیے کبھی بوڑھا نہیں ہوگا، ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

اُن کا سفر ایک سو ساٹھ میل بعد ایک دوسرے شہر میں ختم ہوا۔ گیسپر کو تعاقب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ولسن یا تو بے پروا آدمی تھا یا اُسے اپنے تعاقب کی ذرا بھی اُمید نہیں تھی۔ دوسرے شہر پہنچ کے اُس نے اپنی گاڑی کرائے کے ایک گیراج میں کھڑی کر دی اور بیگ اُٹھائے ہوئے ایک عالی شان ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ ہوٹل گیراج کے قریب ہی تھا۔ گیسپر بھی اُسی گیراج میں گاڑی کھڑی کر کے ہوٹل میں داخل ہوا مگر اِس اثنا میں اُس کا شکار اُس کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اُس نے لابی کا کونا کونا چھان مارا، ڈائننگ ہال دیکھا، بار دیکھا مگر ولسن کہیں نہ ملا۔ گیسپر مجبور ہو کے استقبالیہ کلرک کے پاس پہنچا۔ کلرک کرسی پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ گیسپر نے اُس کی غنودگی میں دخل اندازی کی۔ "سُنیے مسٹر! مجھے ایک صاحب کی تلاش ہے۔ اُن کا نام ولسن ہے۔ کیا وہ آپ کے ہاں ٹھیرے ہیں؟"

کلرک نے نہایت سرد مہری سے انکار میں سر ہلا دیا۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ اگر ولسن یہاں ٹھیرا ہوا ہے بھی تو میں تم جیسے اُچکّے کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ گیسپر مایوس ہو کے لابی کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ کیا اتنی بھاگ دوڑ ضائع ہو جائے گی؟ وہ دیر تک اپنی بدقسمتی پر غور کرتا رہا۔ پھر جب ایک دفعہ اُس نے سر اُوپر اٹھایا تو حیرت سے اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

ولسن اعلاترین لباس پہنے ہوئے ایک ملکۂ حسن کو پہلو میں لیے بے حد وقار کے ساتھ اُس کے سامنے سے گزرا اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ اِس لباس میں اگر وہ کسی ملک کا بادشاہ نہیں تو کم از کم تخت کا وارث ضرور نظر آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ جو نوجوان عورت تھی، وہ ہر اعتبار سے ملکۂ حسن کہلانے کے قابل تھی۔

پندرہ منٹ بعد گیسپر نے اُسی ہوٹل کی گیارھویں منزل کا ایک کمرہ لے لیا۔ یہ کمرہ دوسرے کمروں سے چھوٹا تھا۔ اس لیے اس کا کرایہ بھی کم تھا۔ اُس نے ولسن اور اُس کی محبوبہ کا تعاقب نہیں کیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر وہ اُن کا تعاقب کرے گا تو وہ دونوں ہجوم میں کہیں نہ کہیں ضرور اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے اور تعاقب کے اخراجات میں اضافہ ہو جائے گا، یہ بات اُس کا موکل پسند نہیں کرے گا۔ یہ امکان نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ تعاقب بھی گزشتہ تعاقب کی طرح لمبے فاصلے کا ثابت ہو۔ ولسن اب جس رنگ میں سامنے آیا تھا، اُس کے پیشِ نظر کچھ بھی ہو جانا ممکن تھا۔ ایک چھوٹی سی دکان چلانے والے شخص سے ایسے اعلا لباس اور ایسی شان دار محبوبہ کی توقع کون کر سکتا ہے؟ گیسپر کو رات کہیں نہ کہیں تو بسر کرنی تھی۔ اُس نے سوچا کہ کیوں نہ اسی ہوٹل میں بسر کی جائے۔ اس طرح اسے معلومات حاصل کرنے اور تعاقب جاری رکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ یہ بات صاف تھی کہ اُس کے موکل نے جو پچاس ڈالر دیے تھے، وہ ہوٹل کے کرائے اور اتنے طویل تعاقب کے لیے ناکافی رہیں گے۔ اتفاق سے اُس کی جیب میں پچاس ڈالر اور موجود تھے۔ اگر اسے یہ اندازہ نہ ہوتا کہ اس معاملے میں خاصی آمدنی ہو سکتی ہے تو وہ کبھی اس مہنگے ہوٹل میں ٹھیرنے کی عیاشی نہ کرتا۔ ولسن کی رنگ رلیاں اور رنگ رلیوں کا اعلا معیار دیکھتے ہوئے اسے اپنا مستقبل تاب ناک نظر آنے لگا تھا۔

اُسے ولسن کی دیدہ دلیری پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ مسلسل تین سال سے یہ معاملہ کس طرح چلا رہا ہے۔ دونوں شہروں میں صرف ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ زیادہ نہیں ہوتا اس لیے ولسن کو دیکھ لیا جانا ناممکن بات نہیں تھی لیکن اُس کا مطمئن اور پُراعتماد انداز بتا رہا تھا، جیسے اُس نے جادو کی ٹوپی پہن لی ہو اور اسے یقین ہو کہ اس ٹوپی کی وجہ سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ گیسپر اُس کے متعلق غور کرتے کرتے اُس کی صلاحیتوں کا معترف ہوتا جا رہا تھا۔ ولسن شاید دنیا کا سب سے کامیاب دروغ گو تھا کیونکہ ایک عورت کو اور وہ بھی اپنی بیوی کو مسلسل تین سال تک پوری دو راتیں شہر سے باہر گزارنے کے باوجود مطمئن کرنا ناممکن تھا مگر ولسن نے یہ بات ممکن بنا رکھی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ہوٹل کا ملازم ٹرے لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ٹرے میں دو چیزیں تھیں، بیئر کی ایک بوتل اور برف کے ٹکڑے۔ گیسپر نے ٹرے میز پر رکھنے کا اشارہ کیا اور غور سے ملازم کا جائزہ لیا۔ اُس نے بھانپ لیا کہ یہ ملازم بھی ہوٹلوں کے اکثر ملازمین کی طرح لالچی ہے اور زائد رقم کمانے کا کوئی موقع گنوانا پسند نہیں کرے گا۔ "اور کچھ جناب؟" ملازم نے ادب سے پوچھا۔

"نہیں البتہ مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔" گیسپر نے پانچ ڈالر کا نوٹ انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

ملازم نے نوٹ پر نظر ڈالی اور جھکتے ہوئے بولا۔ "ہم اپنے مہمانوں کی ہر خواہش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جناب!"

"ایک صاحب ہیں اُن کا نام مسٹر ولسن ہے۔ وہ اسی ہوٹل میں مقیم ہیں، کیا تم اُن کے متعلق مجھے کچھ بتا سکتے ہو؟"

"مسٹر ولسن؟" ملازم چند لمحوں تک ذہن پر زور دیتا رہا۔ "مجھے افسوس ہے جناب! میں اس نام کے کسی صاحب سے واقف نہیں ہوں۔"

گیسپر نے ولسن کا حلیہ بیان کیا۔ حلیہ سُن کر ملازم کی آنکھوں میں چمک

پیدا ہوئی: "ہاں ہاں بے شک۔ میں ایک ایسے مہمان سے واقف ہوں جو آپ کے بتائے ہوئے حلیے پر پورے اُترتے ہیں لیکن اُن کا نام ولسن نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ مجھے صحیح نام یاد نہ رہا ہو۔" گیسپر نے کہا۔ "وہ صاحب کوئی ایک گھنٹے قبل ہوٹل میں داخل ہوکے سیدھے اُوپر چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلے تو شام کے تفریحی لباس میں تھے۔ اُن کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں جو اپنی خوب صورتی کی بنا پر کسی بھی فلم میں ہیروئن بن سکتی ہیں۔ مسٹر ولسن نے اُوپر جا کے لباس تبدیل کیا تھا اس لیے میں نے اندازہ لگایا کہ اُن کے پاس یہاں کے کسی کمرے کی چابی مستقل موجود رہتی ہے یا وہ اس کام کے لیے اُن خاتون کا کمرہ استعمال کرتے ہیں؟"

"اوہ۔ وہ۔" ملازم چھت گھورنے لگا۔ چند لمحوں بعد اُس نے آہستہ آہستہ نظریں جھکائیں اور کمرے کا فرش دیکھنے لگا۔ "یقیناً آپ کا اشارہ مسٹر اور مسز راجر کی طرف ہے جناب! وہ دونوں میاں بیوی ہیں اور یہاں اُن کا مستقل قیام ہے۔"

گیسپر کی سانسیں چند لمحوں کے لیے بند سی ہو گئیں۔ "کیا کہا تم نے؟ مسٹر اور مسز راجر؟"

"جی ہاں جناب۔ مسز راجر کے پاس پندرھویں منزل پر ایک نہیں دو نہیں پورے تین کمرے ہیں۔ وہ مستقل طور پر یہاں مقیم ہیں۔ اُن کے شوہر پورے ہفتے کاروباری سلسلے میں شہر سے باہر رہتے ہیں۔ اُن کی واپسی جمعے کی رات کو ہوتی ہے اور اتوار کی شام کو وہ پھر چلے جاتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے قابلِ رشک محبت کرتے ہیں خصوصاً مسز راجر تو اپنے شوہر پر جان چھڑکتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کوئی تفریح نہیں کرتیں عموماً کمرے میں بند رہتی ہیں۔ اُن کی تفریحات اور مسرتیں صرف اُن دو دنوں تک محدود ہیں جب اُن کے شوہر آتے ہیں۔"

گیسپر چند لمحوں تک یہ معلومات ہضم کرتا رہا پھر بولا۔ "بے شک مسٹر راجر اپنی وجاہت کے لحاظ سے عورتوں کے لیے ایک پُرکشش مرد ہیں۔ وہ یہاں کب سے مقیم ہیں؟"

"تقریباً تین سال سے جناب! جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ شادی کے فوراً بعد یہاں منتقل ہو گئے تھے۔"

"اوہ! اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ خاصے دولت مند ہیں؟"

"صرف خاصے نہیں بلکہ بہت زیادہ دولت مند ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ساری دولت اُن کی بیوی کی ہے۔ مسٹر راجر خود زیادہ دولت والے نہیں ہیں۔"

"خوب، خوب۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اُن کی شادی کہاں ہوئی تھی؟ میرا مطلب ہے کہ اسی شہر میں ہوئی تھی یا کسی دوسرے شہر میں؟"

"مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم! اگر اُن کی شادی اسی شہر میں ہوئی ہو گی تو یہ بات آپ کو ٹاؤن ہال سے معلوم ہو جائے گی۔"

ملازم چلا گیا۔ گیسپر نے بیئر کی بوتل سے ایک تاب ناک مستقبل کا جشن منایا۔ اب اسے اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اگر وہ حسینۂ عالم ولسن کی محبوبہ ہوتی تو وہ ولسن کو صرف یہ کہہ کے بلیک میل کر سکتا تھا کہ وہ اُس کی قانونی بیوی پر یہ راز افشا کر دے گا لیکن اب اُس کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی ہے۔ امریکی قانون کے مطابق کوئی امریکی بیک وقت دو بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ یہ بڑا سنگین جرم ہے۔ اس کی سزا دس سال قید بامشقت ہے۔ اب اُسے ولسن کی دوسری غیر قانونی شادی کے صرف ثبوت کی ضرورت ہے۔ ثبوت ملنے کے بعد ولسن اور اُس کی غیر قانونی دولت مند بیوی اُس کی مٹھی میں ہوں گے اور اُس کی تمام معاشی پریشانیاں یکلخت دُور ہو جائیں گی۔ گیسپر انھی رنگین خیالوں میں ڈوبے ڈوبے کسی وقت سو گیا۔

دوسرے روز اُس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ اُس نے غسل کیا، لباس بدلا اور ناشتے کے بعد سیدھا ٹاؤن ہال پہنچ گیا۔ وہاں ایک کلرک کی مٹھی گرم کرنے اور چھ گھنٹے ضائع کرنے کے بعد اُس کا مقصد پورا ہو گیا۔ اُسے راجر اور مسز راجر کی شادی کے سرٹیفکیٹ کی نقل مل گئی۔ اتوار کی شام وہ ولسن کا تعاقب کرتا ہوا واپس آیا۔

پیر کی صبح وہ بہت جلد اپنے دفتر پہنچ گیا اور کئی گھنٹے قانونی کتابوں میں اُلجھا رہا۔ وہ اپنے شکار کے ساتھ گفتگو کرنے سے پہلے پوری طرح مطمئن ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ پھر مطمئن انداز میں اُس نے ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھایا اور اپنے موکل ہرشل کو فون کیا۔ "میں گیسپر بول رہا ہوں۔ پرائیویٹ سراغ رساں۔" اُس نے کہا۔ "کیا آپ فون پر آزادی سے گفتگو کر سکتے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس صرف میری بیوی کھڑی ہے لیکن جناب! کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں مکمل رپورٹ آپ کے دفتر آکے وصول کروں؟"

"ضرور، ضرور۔ آپ جب چاہیں تشریف لا سکتے ہیں لیکن اس معاملے میں آپ کی تشریف آوری فضول ہو گی۔" گیسپر نے کہا۔

"فضول؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میری تفتیش سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔"

"تو ... تو یہ جو ہمارے پڑوسی ہیں یہ ہر ہفتے کہاں جاتے ہیں؟"

"کینساس سٹی۔"

"کس لیے؟"

"وہ وہاں ایک عورت سے ملاقات کرتے ہیں۔"

"ایک عورت سے؟ کیا کہا آپ نے؟ ایک عورت سے؟" ہرشل نے پُرجوش لہجے میں چیختے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ اُس عورت کی عمر اسّی سال ہے اور وہ آپ کے پڑوسی کی والدہ ماجدہ ہیں۔"

"اوہ۔" دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں بعد ہرشل اس صدمے سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ "وہ ہر ہفتے کینساس سٹی محض اپنی والدہ سے ملنے جاتے ہیں؟ یہی کہا ہے نا آپ نے؟"

"جی ہاں یہی کہا ہے۔ اُن کی والدہ وہاں ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہیں۔ آپ کے پڑوسی کو اُن سے بہت محبت ہے اس لیے وہ ہر ہفتے بلا ناغہ اُن سے ملنے جاتے ہیں۔"

"معاف کیجیے گا، ذرا ایک منٹ توقف فرمائیے۔"

گیسپر کو دوسری طرف سرگوشی سنائی دی۔ میاں بیوی کسی مسئلے پر جلدی جلدی بحث کر رہے تھے "اچھا تو ٹھیک ہے"۔ ہر شل کی مایوس کن آواز آئی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کے دفتر آنا واقعی فضول ہو گا۔"

"بہتر ہے۔ میں آپ کو اپنا بل ڈاک سے روانہ کر دوں گا۔" اس سے پہلے کہ اس کا موکل کوئی احتجاج کرتا، گیسپر نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر ڈائرکٹری میں اس نے لپنے تنکار کی دکان کا نمبر تلاش کر کے گھمایا۔ دوسری طرف سے تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھایا گیا۔ وہ ولسن کی آواز فوراً پہچان گیا اس کی آواز بھی اس کی شخصیت کے مطابق پُر کشش اور بھاری تھی

"میں ولسن بول رہا ہوں۔"

"اوہ میرا خیال ہے کہ غلط نمبر مل گیا ہے۔ میں نے دراصل مسٹر راجر کا نمبر ملایا تھا۔" گیسپر نے شرارت کے انداز میں دیواری کیلنڈر کی نیم عریاں لڑکی کو آنکھ ماری۔

وہ اس بات کا قائل تھا کہ لوہے پر اس وقت چوٹ لگائی جائے جب خوب گرم ہو۔

دوسری طرف سکوت طاری ہو گیا۔ چند لمحوں بعد ولسن کی آواز دوبارہ ریسیور میں ابھری۔ اس کا لہجہ اب بھی پہلے کی طرح پُر سکون اور غیر جذباتی تھا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟ آپ کا نام؟" اس نے دریافت کیا۔

"نام میں کیا رکھا ہے مجھے یقین ہے کہ ہمارے درمیان بہت جلد مستحکم دوستانہ تعلقات استوار ہو جائیں گے۔"

"ضرور، مجھے بے حد مسرت ہو گی۔ کیا آپ مجھ سے ملاقات کے لیے کوئی وقت مقرر کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ آج شام کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بہت عمدہ خیال ہے۔ کیا جگہ کا تعین بھی آپ کریں گے؟"

"جی نہیں۔ یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں، ہاں اگر مجھے وہ جگہ پسند نہ آئی تو اسے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"مناسب ہے۔ میری دکان کے مشرق میں چند دکانیں چھوڑ کے ایک چھوٹا سا ریستوران ہے، میں دکان بند کر کے کبھی کبھی وہاں چند گھونٹ بئیر پیتا ہوں۔ آپ وہاں آنے کی زحمت کیجیے۔ مجھے آپ کو اپنے ساتھ بئیر کی دعوت دیتے ہوئے بہت مسرت ہو گی۔"

"جگہ تو معقول معلوم ہوتی ہے اچھا کس وقت؟"

"میں ساڑھے پانچ بجے دکان بند کرتا ہوں۔"

"میں ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ریستوران پہنچ جاؤں گا۔"

"بہتر ہے محترم دوست! میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

گیسپر نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے سوچا کہ یہ شخص بہت ٹھنڈے دماغ اور فولادی اعصاب کا مالک ہے۔ ظاہر ہے ایسا ہی آدمی اس طرح دیدہ دلیری سے ایک وقت میں دو شادیاں رچا سکتا ہے اور ایسا ہی شخص دو عورتوں کو ایک ساتھ بے وقوف بنا سکتا ہے۔ دوسروں سے ایک عورت بھی بے وقوف نہیں بنائی جاتی۔

ولسن ریستوران کے ایک کیبن میں تنہا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ گیسپر اندر داخل ہوا، ولسن نے کھڑے ہو کے اس سے مصافحہ کیا اور بہت شائستگی سے اُسے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "میرا نام ولسن ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے نام نامی سے میں واقف نہیں ہوں۔"

"میرا نام گیسپر ہے۔"

"کیسا مزاج ہے مسٹر گیسپر؟ کیا آپ میرے ساتھ بئیر نوش فرما سکتے ہیں؟ یہ میری عزت افزائی ہو گی۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں سخت مشروبات نہیں ملتے۔"

"میں بئیر ہی پسند کرتا ہوں۔"

ولسن نے ویٹر کو بئیر لانے کا اشارہ کیا۔ ویٹر نے جب تک حکم کی تعمیل نہیں کی، وہ دونوں آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ ولسن نے گلاس بھرے اور ایک گلاس اٹھا کر گیسپر کی صحت کا جام تجویز کیا۔ گیسپر کو اس کے شائستہ اور مہذب انداز سے وحشت ہونے لگی۔

"کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ راجر کے وجود سے کیسے واقف ہوئے؟" ولسن نے بئیر کی پہلی چسکی لینے کے بعد کہا۔

"آپ جو سوال چاہیں کر سکتے ہیں لیکن میں جو سوال مناسب سمجھوں گا اسی کا جواب دوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ اگر میں راجر کے وجود سے انکار کر دوں تو یہ ایک فضول کوشش ہو گی؟"

"ظاہر ہے۔ میں ثبوت کے بغیر کوئی بڑا الزام کبھی نہیں لگاتا۔ آپ کو احساس ہو گا مسٹر ولسن کہ آپ ایک سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

"یقیناً اس میں کیا شک ہے۔" ولسن نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس صورت میں میرا خیال ہے کہ ہمیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ براہِ راست اصل موضوع پر گفتگو کرنی چاہیے۔ آپ یہ بتائیے کہ اس سلسلے میں آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"دیکھیے جناب! میں ایک انتہائی معقول آدمی ہوں۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دو شادیاں کرنی چاہتا ہو اور ایک وقت میں دو بیویاں سنبھال سکتا ہو تو اسے ضرور ایسا کرنا چاہیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

"یقیناً آپ بہت معقول آدمی ہیں مسٹر گیسپر! معقول بھی اور بلند خیال بھی۔ دو بیویاں رکھنے میں کسی کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ دنیا میں آج بھی بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں دو بیویوں والے شوہر کو ایک بیوی والے شوہر کے مقابلے میں زیادہ عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں یہ بات جرم نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ ابھی اس وسیع النظری کا مالک نہیں ہوا ہے۔ یہاں اسے جرم تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے"

میں خود کو زمین کے کسی مخصوص خطّے کا باشندہ نہیں سمجھتا اور صرف وہی اخلاقی اصول اپناتا ہوں جو مجھے پسند آتے ہیں، خواہ اُن کا تعلق کسی بھی خطّے اور کسی بھی قانون سے ہو۔"

"آپ کا نقطۂ نظر بہت عمدہ ہے لیکن اس ملک میں آپ ایسا کر کے بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ بلکہ گرفتار ہو چکے ہیں اس ملک میں دو بیویاں رکھنے کی سزا دس سال قید با مشقّت ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"دیکھیے مسٹر ولسن! جیسا کہ میں نے کہا، میں ایک معقول آدمی ہوں میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میری ذات کسی کی مسرّتوں میں حائل ہو۔"

"مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ آپ واقعی ایک بے حد معقول آدمی ہیں۔ اچھا تکلّف برطرف، اب کام کی بات ہو جائے مسٹر گیسپر! آپ شاید مجھے بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ظاہر ہے، ہر آدمی کو اپنی مسرّتوں کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی ضرور دینی پڑتی ہے۔"

"بے شک ظاہر ہے کہ اگر آپ اپنی مسرّتوں کے لیے قربانی نہیں دے سکتے تو آپ کو اپنی عمر کا خاصا بڑا حصّہ جیل میں گزارنا پڑے گا۔ یہی نہیں آپ اپنی دونوں بیویوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ وہ اس انکشاف کے بعد آپ سے نفرت کرنے لگیں گی اور فوراً علیحدگی اختیار کر لیں گی۔"

"آہ، یہی تو میرا کمزور پہلو ہے، میری دونوں بیویاں نہایت عمدہ عورتیں ہیں۔ میں اُن دونوں عمدہ عورتوں سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔ آپ کو شاید علم نہ ہو، میں بیک وقت دونوں سے بے انتہا محبت کرتا ہوں اور اُن میں سے کسی ایک کی علیحدگی بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو گی مگر اب بات گھوم پھر کر اسی نازک مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔" اُس نے چند لمحوں تک توقّف کیا۔ پھر پوچھا۔ "آپ میری مسرّتوں کی کیا قیمت طلب کرنا چاہتے ہیں مسٹر گیسپر؟"

"میں لالچی آدمی نہیں ہوں مسٹر ولسن، لیکن اگر کوئی چیز ہاتھ آ رہی ہو تو اُسے ٹھکراتا بھی نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ میری نگاہ میں آپ کی خوب صورت اور دولت مند بیوی کا پیکر گھوم رہا ہے جس سے ملنے کے لیے آپ ہر جمعے کو دوسرے شہر جاتے ہیں۔ اس صورت میں آپ خود بتائیے کہ آپ کی مسرّتوں کی مناسب قیمت کیا ہو سکتی ہے؟"

مسٹر گیسپر! آپ نے بالکل قطعی درست کہا ہے کہ انجیلا بہت خوب صورت اور دولت مند ہے۔ ساتھ ہی وہ بے حد فراخ دل بھی ہے۔ اُس نے آج تک مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مجھے جو رقم دیتی ہے اُسے میں کس طرح اور کہاں خرچ کرتا ہوں؟"

"اگر یہ بات ہے تو پھر پچّیس ہزار ڈالر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جہاں تک غریب ولسن کا تعلق ہے اُس کے لیے یہ رقم بہت زیادہ ہے۔ البتہ ایک مال دار عورت کے شوہر راجر کے لیے یہ رقم بہت مناسب ہے۔"

"میں اس وقت ایک مال دار عورت کے شوہر راجر ہی سے گفتگو کر رہا ہوں،" گیسپر نے کہا۔

"تو راجر کی حیثیت سے میں اس مطالبے پر ضرور غور کروں گا۔"

"اس میں غور کرنے کی کیا بات ہے؟ یہ رقم تو آپ کو لازماً دینی ہے ورنہ......"

"درست ہے مسٹر گیسپر! لیکن آپ نہ بھولیے کہ میں رقم کے معاملے میں اپنی بیوی انجیلا کا محتاج ہوں۔ اُس سے رقم حاصل کرنے کا مسئلہ تو کسی نہ کسی طرح حل ہو جائے گا لیکن اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ میں آیندہ پیر سے پہلے آپ کو یہ رقم کسی صورت میں ادا نہیں کر سکتا۔"

"خیر، میں ایک ہفتے انتظار کر سکتا ہوں لیکن یہ ابھی بتائے دیتا ہوں کہ رقم نوٹوں کی شکل میں ہونی چاہیے۔ میں چیک قبول نہیں کروں گا۔"

"مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ آپ جیسے جہاں دیدہ اور تجربے کار آدمی کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ کیا آج تک کسی نے بھی بلیک میل کی رقم چیک سے ادا کی ہے؟"

"میرا مقصد صرف وضاحت کرنا تھا۔"

"میں آپ کی تمام باتیں خوب سمجھ گیا ہوں مسٹر گیسپر! آپ مطمئن رہیے۔ ہر کام آپ کی منشا کے مطابق ہو گا۔"

"اب ہمیں آیندہ ملاقات کے وقت اور مقام کا تعیّن کر لینا چاہیے۔"

"ضرور۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ یہ معاملہ جلد از جلد ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یقین کیجیے، میری بھی یہی خواہش ہے۔ آیندہ پیر کی شام کیسی رہے گی؟"

"اچھی رہے گی مگر کہاں؟"

"رقم کی منتقلی رازداری کا تقاضا کرتی ہے مسٹر گیسپر اور میرا خیال ہے، یہ کام کسی ہوٹل کے کیبن میں انجام نہیں دینا چاہیے۔ اس کے لیے میں اپنی دُکان کا پچھلا کمرہ زیادہ مناسب سمجھتا ہوں بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ آپ کو معلوم ہے، میں ساڑھے پانچ بجے شام کو دُکان بند کر دیتا ہوں اور میرا نائب فوراً چلا جاتا ہے۔ پورے چھ بجے کا وقت ہمارے لیے بہت موزوں رہے گا۔ آپ اپنی گاڑی میری دُکان کی پچھلی گلی میں کھڑی کیجیے گا، پھر بغلی دروازہ کھٹکھٹائیے گا۔ میں فوراً دروازہ کھول کے آپ کو اندر بلا لوں گا۔"

"مجھے منظور ہے لیکن دیکھیے کسی قسم کی چالاکی نہیں چلے گی مسٹر راجر! میں ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہوں جو چالاک بننے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"پلیز مسٹر گیسپر! یہ کہہ کے آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں، اسی لیے میں نے موجودہ صورتِ حال فوراً قبول کر لی ہے۔ میں اس ملک کے قانون کے مطابق ایک سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہوں اور اُس کی سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو سوچیے کہ میں آپ کو کس طرح دھوکا دے سکتا ہوں؟ تاش کے سارے پتّے تو آپ کے پاس ہیں میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔"

ولسن رخصت ہو گیا۔ گیسپر نے ویٹر کو بیئر کی ایک اور بوتل لانے کا حکم دیا۔ وہ بہت بدحواس تھا کیوں کہ وہ خود کو نہایت پریشان محسوس کر رہا تھا حالانکہ یہ خوش ہونے کا موقع تھا۔

ایک ہفتے بعد گیسپر ولسن کی دکان کا پچھلا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ ٹھیک پونے چھ بجے تھے۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ ولسن نے کھولا تھا۔ اُس کے جسم پر جاموں والا سفید اور بے داغ لباس تھا۔ "آئیے مسٹر گیسپر! تشریف لائیے۔ آپ ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

گیسپر جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز رکھی تھی۔ میز کے گرد دو کرسیاں تھیں۔ ایک کونے میں بجلی کے چولھے پر کیتلی میں پانی چڑھا ہوا تھا۔ "تشریف رکھیے مسٹر گیسپر!" ولسن نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا آپ کافی پینا پسند کریں گے؟"

"شکریہ۔ میں کافی نہیں پیتا۔" گیسپر اس مختصر سے کمرے میں خود کو مقید محسوس کر رہا تھا۔ یہ احساس اُسے بے چین کیے دے رہا تھا۔

"بہت خوب۔" ولسن دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اب ہمیں فوراً معاملے کی بات پر آجانا چاہیے۔"

"مجھے اُمید ہے کہ آپ نے رقم کا بندوبست کر لیا ہوگا؟"

"بے شک میں اس سلسلے میں کوتاہی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے پاس اس وقت طے شدہ رقم سے دگنی رقم موجود ہے۔"

"دگنی رقم؟ یعنی پچاس ہزار ڈالر؟"

"جی ہاں۔"

"کہاں ہیں؟"

"آپ مطمئن رہیے مسٹر گیسپر! آپ جب حکم دیں گے، رقم آپ کے سامنے ہوگی۔"

"پھر انتظار کس بات کا ہے؟" گیسپر نے بے زاری سے پوچھا۔

"میں نے عرض کیا نا کہ میں نے طے شدہ رقم سے دگنی رقم کا بندوبست کیا ہے"

"کیوں؟ کس لیے؟"

"آپ کو پیش کرنے کے لیے لیکن زائد رقم کا حق دار بننے کے لیے آپ کو ذرا سی محنت کرنی پڑے گی۔"

"کیسی محنت؟" گیسپر کا لہجہ مرتعش تھا۔

"مجھے اجازت دیجیے مسٹر گیسپر کہ میں آپ کے سامنے اپنی تجویز پیش کر سکوں۔"

"کوئی تجویز سننا جرم نہیں ہے مسٹر راجر! آپ اپنی بات جاری رکھیے۔"

"آپ کے اس اقدام نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور مجھے پہلی بار اپنے معاملے کی نزاکت کا مکمل احساس ہوا ہے۔ احساس تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ معاملہ زیادہ عرصے نہیں چلے گا لیکن اب میں خوب سمجھ گیا ہوں کہ اگر آپ مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ سکتے ہیں تو آپ کے بعد کوئی دوسرا بھی میری اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ آپ تو خیر بے حد معقول آدمی ہیں اور یہ قصہ آپس میں ختم کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن دوسروں کے متعلق میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ عقل مندوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے پوری کے چکر میں پڑنے کے بجائے آدھی پر قناعت کی جائے۔ مجھے دو بیویوں کی جگہ ایک ہی بیوی پر گزارا کرنا پڑے گا۔ آپ کچھ سمجھے مسٹر گیسپر؟" ولسن خاموش ہو کے گیسپر کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک غمگین اور اُداس مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ غور سے اپنی انگلیوں کے ناخن دیکھ رہا تھا۔ ناخن بہت نفاست سے تراشے گئے تھے۔

گیسپر کی حالت یہ تھی جیسے کسی ہیوی ویٹ چیمپئن نے اُس کی توند میں گھونسا مار دیا ہو۔ "میں ... میں سمجھا نہیں۔" اُس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"شاید مجھے اپنی بات زیادہ وضاحت سے بیان کرنی چاہیے۔" ولسن نے ایک گہری سانس کھینچی۔ "مسٹر گیسپر! میں نے بے حد رنج و غم کے ساتھ اپنی ایک بیوی کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"کون سی بیوی کی؟" گیسپر نے لکنت سے پوچھا۔

"یہ فیصلہ کرنا میرے لیے بے حد دشوار ثابت ہوا۔ انجیلا یا مارتھا؟ مارتھا یا انجیلا؟ یقین کیجیے مسٹر گیسپر! میں پورے ہفتے ایک رات بھی ٹھیک سے نہیں سو سکا۔ اس سوال نے مجھے بے حد پریشان کیا۔ آپ میری حیثیت سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اب میں عمر کے اُس حصے میں داخل ہونے والا ہوں جہاں جوانی کے طوفانی جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور ایک عمدہ گھر اور پُرسکون زندگی کی خواہش دوسری سب خواہشوں پر غالب آجاتی ہے۔ ایک صاف ستھرا اور پُرسکون گھر اور گھر کے پکے ہوئے عمدہ کھانے زندگی کی تمام ضرورتوں پر حاوی آجاتے ہیں۔ یہ نکتہ مارتھا کے حق میں جاتا ہے۔ مجھے ایک صاف ستھرے پُرسکون گھر کے ساتھ عمدہ کھانے وہی دے سکتی ہے۔ دوسری طرف میں یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ میں ابھی عمر کے اُس حصے میں نہیں پہنچا ہوں جہاں جوانی کے منہ زور جذبات قطعاً سرد پڑ جائیں۔ یہ بات انجیلا کے حق میں جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور اُس کے حق میں جاتی ہے۔ انجیلا کی موت کے بعد اُس کی بے پناہ دولت کا تنہا وارث مجھے ہونا ہے لیکن اگر انجیلا کی موت غیر فطری طور پر واقع ہوگی تو پولیس تفتیش کا پٹارا کھول دے گی۔ اس طرح یقیناً اُس پر میری دو بیویوں کا راز کھل جائے گا۔ پھر دُنیا کی کوئی عدالت مجھے بے گناہ تسلیم نہیں کرے گی۔ انجیلا کے وارث کی حیثیت سے مجھے جو دولت ملنی ہے میرا جرم ثابت ہونے پر وہ دولت میری پہلی بیوی مارتھا کو بھی نہیں مل سکے گی۔ اس لیے انجیلا کی موت ہر صورت میں نقصان دہ ہے۔ لہٰذا اب میرے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں دل پر جبر کر کے اپنی پیاری مارتھا کی علیحدگی برداشت کر لوں۔" اس نے کچھ رک کے مضمحل آواز میں کہا۔ "مسٹر گیسپر! مارتھا کو راستے سے ہٹنا پڑے گا۔"

"وہ کس طرح؟" گیسپر کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"آپ اتنے بھولپن کا مظاہرہ نہ کیجیے مسٹر گیسپر! میں نے آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر ڈالی ہیں۔ اُمید ہے آپ برا نہیں مانیں گے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ میری تفتیش کا جو نتیجہ برآمد ہوا ہے اُس کی رُو سے آپ ایک خاصے بے رحم اور سفاک آدمی ہیں۔ یقین کیجیے مسٹر گیسپر! میں نے آپ سے جو درخواست کی ہے وہ آپ کی صلاحیتوں سے بالا نہیں ہے۔"

"گویا آپ اپنی بیوی کے قتل کے لیے میری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

"آپ صحیح سمجھے۔ میں آپ کو ایک سنہرا موقع فراہم کر رہا ہوں مسٹر گیسپر! اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ اس موقع سے فائدہ اُٹھانا پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ آپ پچیس ہزار ڈالر لینا پسند کریں گے یا پچاس ہزار ڈالر؟"

دولت کا حصول گیسپر کی سب سے بڑی آرزو تھی لیکن یہ معاملہ بہت تیزی سے اور غیر متوقع طور پر آگے بڑھتا تھا۔ اس لیے وہ بُری طرح اُلجھ گیا۔ اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔ اُس نے اپنا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی۔ اُس کی سمجھ میں صرف یہ آسکا کہ ولسن اس معاملے میں اسے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ "میں یہ تجویز منظور نہیں کر سکتا۔" اُس نے کھنچی کھنچی آواز میں کہا۔

"کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے مسٹر گیسپر؟ اگر اس موضوع پر کچھ دیر بحث کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟ افہام و تفہیم سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔"

"بحث کرنے کے لیے رکھا ہی کیا ہے؟"

"کیا اس منصوبے میں آپ کو اپنے فائدے کی کوئی بات نظر نہیں آتی؟"

"مجھے کچھ نظر آتا ہو یا نہ آتا ہو لیکن میں یہ ضرور سمجھ سکتا ہوں کہ اس وقت ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ آپ نے قانون شکنی کی ہے اور میں آپ کو بلیک میل کر رہا ہوں لیکن اگر میں آپ کی پیشکش قبول کر لوں تو میں ایک قاتل بھی بن جاؤں گا۔ پھر ہم دونوں کی حیثیتوں میں فرق پیدا ہو جائے گا۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں میری زندگی داؤ پر لگ جائے گی جب کہ آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آپ بدستور محفوظ رہیں گے۔"

"حیرت ہے مسٹر گیسپر! آپ جیسا تجربے کار آدمی ایسی باتیں کر رہا ہے۔ اگر آپ میری پیشکش قبول کر لیں تو میں بھی اس جرم میں برابر کا شریک بن جاؤں گا اور اپنی ریاست کا قانون اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت ہے اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے کا راز ہمیشہ راز رکھنے پر مجبور ہوں گے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کی پیشکش قبول کرنے کی صورت میں میرا جرم آپ کے جرم سے زیادہ سنگین ہو جائے گا۔ اگر آپ نے کام ہونے کے بعد مجھے رقم دینے سے انکار کر دیا تو میں آپ کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکوں گا۔"

"میں ایک شریف اور معزز شہری ہوں مسٹر گیسپر! آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے۔ کیا میں آپ کو دھوکے باز نظر آتا ہوں؟"

پھندے

ابوظفر زین

- **سگریٹ**: بڑے قبرستان کا سب سے مختصر راستہ۔
- **کرنسی**: کاغذی وعدے۔
- **معمّا**: الفاظ کی کراس بریڈنگ۔
- **رنڈوا**: خالی ماچس۔
- **ماڈرن تعلیم**: جو انسان کو عقل کے بغیر جینا سکھاتی ہے۔
- **فرائی فش**: ماہی بے آب۔
- **دُنیا**: ہر جانے والا اس کی ہزاروں شکایتیں لے کر جاتا ہے اس کے باوجود کروڑوں نئے لوگ ہر سال آجاتے ہیں۔

گیسپر کچھ سوچنے لگا پھر اچانک بولا۔ "آپ مجھے پچاس ہزار ڈالر پہلے ہی ادا کر دیجیے تاکہ میرے وسوسے ختم ہو جائیں۔"

"ابھی میں نے صرف یہ کہا تھا کہ کیا میں آپ کو دھوکے باز نظر آتا ہوں؟ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ مجھے دھوکے باز نظر نہیں آتے۔ بہرحال میں آپ کو دس ہزار ڈالر پیشگی ادا کرنے کے لیے تیار ہوں تاکہ آپ کو میری نیک نیتی پر یقین آجائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں مسٹر گیسپر کہ جیسے ہی آپ کام ختم کریں گے، میں باقی چالیس ہزار ڈالر فوراً آپ کو ادا کر دوں گا۔"

گیسپر کو ولسن پر یقین آگیا۔ "ایک منٹ۔" اُس نے جلدی سے کہا۔ اُس کے ذہن میں ایک نیا خیال اُبھرا تھا۔ "ابھی آپ نے کہا تھا کہ یہاں آپ کے پاس پچاس ہزار ڈالر موجود ہیں۔ یہ نہ بھولیے کہ میں اپنا مطالبہ پچیس ہزار سے بڑھا کر پچاس ہزار بھی کر سکتا ہوں۔ بھلا مجھے ان جھگڑوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بے شک مسٹر گیسپر! آپ ایسا کر سکتے ہیں لیکن آپ کی یہ کوشش ناکام ہو جائے گی۔ میں ایک معقول آدمی ہوں اور آپ کی خاموشی کی معقول قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن کوئی غیر معقول مطالبہ کبھی تسلیم نہیں کروں گا۔ یقین نہ آئے تو آپ کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔"

گیسپر کو ولسن کی اس بات پر بھی یقین آگیا۔ اُس نے مزید گفتگو کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ "خیر مسٹر ولسن! میں فی الفور کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے اس منصوبے کے تمام زاویوں پر غور کرنا پڑے گا۔ کوئی آخری فیصلہ اس کے بعد ہی کر سکوں گا۔ میں اس وقت آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ ہم اس منصوبے پر بے خوف و خطر عمل کر سکتے ہیں؟"

"ذرا سی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں ہر جمعے کی شام کو اپنے گھر سے چلا جاتا ہوں اور اتوار کی رات کو واپس آتا ہوں۔ اس دوران میں مارتھا گھر میں تنہا ہوتی ہے۔ وہ ایک اصولی عورت ہے بلکہ ہم اسے

عادتوں کا غلام کہہ سکتے ہیں۔ اُس نے مجھے اکثر بتایا ہے کہ میری غیر حاضری میں وہ سنیچر کی رات کو اکیلی فلم دیکھتی ہے اور فلم ختم ہوتے ہی سیدھی گھر آجاتی ہے۔ گھر آکے سونے سے پہلے وہ تلخ شراب کا ایک گلاس پیتی ہے۔ پھر سو جاتی ہے۔ وہ شراب پینے کی عادی نہیں ہے اس لیے سنیچر کی رات کو شراب پی کر اُسے بہت گہری نیند آتی ہے۔ بارہ بجے رات کے بعد آپ کسی وقت بھی اپنا کام آسانی سے انجام دے سکتے ہیں آپ کو ذرا بھی دشواری نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ آپ کی سہولت کے لیے میں آپ کو اپنے مکان کی فاضل چابی بھی دے دوں گا۔ مارتھا کے سر پر کسی بھاری چیز کی ایک ضرب کافی ہوگی اور مکان میں چند ایسی شہادتیں چھوڑ دینا کافی ہوگا کہ رات کے وقت وہاں کوئی چور داخل ہوا تھا۔ پولیس یہی نتیجہ اخذ کرے گی کہ مارتھا نے چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہوگا اس لیے چور نے گھبرا کے مارتھا پر حملہ کر دیا اور مارتھا ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گئی، چور فرار ہو گیا۔ میں اس دوران میں شہر سے باہر ہوں گا اور نہایت آسانی سے دوسرے شہر میں اپنی موجودگی ثابت کر دوں گا۔ پولیس مجھ پر شبہ نہیں کرے گی۔ پیر کو میں آپ کے معاوضے کی باقی رقم بھی ادا کر دوں گا۔ اب آپ کا کیا خیال ہے مسٹر گیسپر؟"

"یہ کام تو بہت آسان نظر آتا ہے بے حد آسان۔ پھر بھی مجھے سوچنے کا موقع دیجیے مسٹر ولسن!"

"ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی۔ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے آج مارتھا نے میرا پسندیدہ کھانا پکایا ہوگا اور وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی مجھے اجازت دیجیے۔"

گیسپر نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا تھا البتہ ایک بار اُس نے ایک عورت کو خودکشی کرنے پر ضرور مجبور کر دیا تھا اسی لیے اُسے آخری فیصلے پر پہنچنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ تین روز تک رات دن اسی مسئلے پر غور کرتا رہا۔ اُسے جب بھی مارتھا کے سر پر اپنے ہاتھ سے ضرب لگانے کا خیال آتا، اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ انسانی جان لینا گناہ سمجھتا تھا یا اس جرم کے خیال سے اُس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا تھا، ضمیر تو اُس نے پہلے ہی اپنے وجود سے علیحدہ کر دیا تھا اور اخلاق کی اہمیت اسے تسلیم ہی نہیں تھی۔ اُسے صرف قانون کا خوف تھا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو کیا ہوگا؟ دوسری طرف پچاس ہزار کے تصور ہی سے اُس کے منہ میں پانی آجاتا تھا۔ ولسن نے جو سیدھا اور آسان منصوبہ پیش کیا تھا اُس کی کشش بھی بہت زیادہ تھی۔ اُسے اس منصوبے میں بہ ظاہر کوئی نقص یا جھول نظر نہیں آتا تھا۔

تین روز بعد وہ اپنے مختصر دفتر میں بیٹھا تھا اور بار بار کلائی کی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ چھ بجنے میں بیس منٹ باقی رہ گئے تو اُس نے ولسن کی دکان کا نمبر ملایا۔ اُسے یقین تھا کہ ولسن کا نائب جا چکا ہوگا اور ولسن اس وقت دکان بند کرنے میں مصروف ہوگا۔ "جناب! میں ولسن بول رہا ہوں"۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں گیسپر ہوں۔ کیا آپ آسانی سے بات کر سکتے ہیں؟ آپ کے قریب کوئی ہے تو نہیں؟"

"میں تنہا ہوں مسٹر گیسپر! کل جمعہ ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ معلوم آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"کیا آپ کے پاس دس ہزار ڈالر موجود ہیں؟"

"قطعی موجود ہیں۔"

"اور باقی چالیس ہزار ڈالر بھی؟"

"یقیناً میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا مسٹر گیسپر!"

"آپ مجھے پیشگی رقم کب ادا کر سکتے ہیں؟"

"رقم بینک سے لاکر سے نکالنی ہوگی۔ اب یہ کام صبح ہی ہو سکتا ہے"

"کیا میں صبح آپ کی دکان پر آجاؤں؟"

"میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہوگا مسٹر گیسپر! ہمیں اب ملاقات کرنے کے سلسلے میں بے حد احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ میں کل صبح بینک سے دس ہزار ڈالر نکال لوں گا اور دوپہر کا کھانا ہلٹن ریستوراں میں کھاؤں گا میں ٹھیک ایک بجے وہاں ملوں گا۔ کھانے سے پہلے میں ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے جاؤں گا۔ آپ مجھے غسل خانے میں مل جائیے گا، میں رقم کا پیکٹ آپ کی جیب میں ڈال دوں گا۔"

"ٹھیک ہے گھر کی فاضل چابی لانا بھی نہ بھولیے گا۔"

"پیکٹ کے ساتھ چابی بھی آپ کی جیب میں پہنچ جائے گی۔"

رقم کی منتقلی دوپہر کو خوش اسلوبی سے انجام پا چکی تھی۔ شام کو پونے چھ بجے تھے۔ گیسپر ولسن کے مکان سے کچھ فاصلے پر چھپا ہوا تھا اور داخلی دروازے کی نگرانی کر رہا تھا چند منٹ بعد ولسن کی گاڑی اس کے مکان میں داخل ہوئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ولسن ہاتھ میں سیاہ چرمی بیگ اٹھائے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کے شہر سے باہر جانے والی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ گیسپر نے احتیاطاً اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ ولسن کی گاڑی شہر سے نکل کے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ گیسپر نے اطمینان کی سانس لی اور شہر کی طرف واپس چل دیا۔ اُسے ولسن کی نیت پر شبہ نہیں تھا لیکن اُس کا اصول تھا کہ بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے کہ کچھ وقت پہلے ضائع کر دیا جائے اور ہر طریقے سے اپنا اطمینان کر لیا جائے۔

دوسری رات گیسپر نہایت احتیاط کے ساتھ ولسن کی دی ہوئی چابی سے اُس کے مکان کا بغلی دروازہ کھول رہا تھا۔ اُس نے اپنی گاڑی آدھے میل کے فاصلے پر ایک ایسے تاریک علاقے میں کھڑی کی تھی کہ کوئی بھی اُسے آسانی سے نہیں دیکھ سکتا تھا اگر وہ اپنی گاڑی ولسن کے مکان کے قریب کھڑی کرتا اور کوئی شخص اُس کی گاڑی وہاں کھڑی دیکھ کے مشکوک ہو جاتا اور اس کا نمبر

PAL-DAL 104/5,75

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
عظیم ورثہ

نوٹ کرلیتا تو کیا ہوتا؟ آدھے میل کا فاصلہ اُس نے پیدل طے کیا تھا اس کے لیے اُس نے تنگ و تاریک گلیوں کو ترجیح دی تھی۔ رات کا ایک بجا تھا اس لیے آدھے میل کے سفر میں کسی راہ گیر سے اُس کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ مکانات تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گلیوں میں سکوت ہی سکوت تھا۔ اُسے یقین تھا کہ واپسی میں بھی خوش قسمتی اُس کا ساتھ دے گی اور وہ کسی کی نگاہ میں آئے بغیر اطمینان سے اپنے گھر پہنچ جائے گا۔

چابی خاموشی سے قفل میں گھومی۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ بغلی دروازہ باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ گیسپر نے اندر داخل ہو کے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا اور بے حس و حرکت کھڑا ہو کے آہٹ لینے لگا۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور مکمل سکوت طاری تھا۔ آہستہ آہستہ اُس کی نظریں تاریکی کی عادی ہو گئیں تو اُسے باورچی خانے کا دوسرا دروازہ نظر آیا۔ یہ دروازہ مکان کے اندر کھلتا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم اُٹھاتا ہوا دوسرے دروازے کی طرف بڑھا اور باورچی خانے سے نکل کر ہال میں آگیا۔ ہال میں رک کے اُس نے کوٹ کی جیب تھپتھپائی۔ اندر سیسے کے پائپ کا ایک چھوٹا لیکن بھاری بھرکم ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ گیسپر کو اُسی سے مارتھا کے سر پہ ضرب لگانی تھی۔ اُس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اُس کے سامنے تین کمرے تھے۔ ان کمروں میں سے ایک خواب گاہ تھی اور خواب گاہ میں اُس کا شکار شراب کے نشے اور گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیسپر بے آواز چلتا ہوا ایک دروازے کے پاس پہنچا اور اُسے کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ اندر تاریکی تھی۔ اُس نے دوسرا دروازہ کھولا۔ اُسے بستر پر ایک موٹی سی عورت لیٹی ہوئی نظر آئی۔ لیمپ کی دھیمی روشنی میں وہ گوشت پوست کا ایک بے ڈول ڈھیر نظر آ رہی تھی۔ عورت خرّاٹے لے رہی تھی۔ وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گیسپر نے کوئی تاخیر کیے بغیر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

چند لمحوں تک وہ غور سے اپنے شکار کی طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے سیسے کے پائپ کا ٹکڑا نکالا اور اسے مضبوطی سے پکڑ کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ابھی وہ چند قدم ہی بڑھا تھا کہ اُسے پیچھے سے شوں کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی اُس نے اپنی کھوپڑی کے اندر ایٹم بم پھٹتا ہوا محسوس کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بہت تیزی سے تاریکی کے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔

ولسن اپنی بیوی مارتھا کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ پھر سیدھا غسل خانے میں چلا گیا۔ مارتھا مسہری پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ "تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی ڈیئر؟" اُس نے بلند آواز میں اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔

"نہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔" ولسن نے بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔ "میں اُس کی لاش ایک تاریک گلی میں ڈال آیا ہوں۔ اتفاق سے جاتے اور آتے وقت کسی سے میرا سامنا نہیں ہوا۔ تمہیں معلوم ہے، اپنے علاقے کے قریب ایک محلّے کی تاریک گلیوں میں اکثر راہ گیر لوٹ لیے جاتے ہیں۔ اُس محلّے میں اچھے لوگ آباد نہیں ہیں۔ میں نے اُس کی تمام جیبیں خالی کر دی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ صبح جب پولیس اُس کی لاش دیکھے گی اور اسے اُس کی جیبیں خالی نظر آئیں گی اور سر پر زبردست ضرب کا نشان ملے گا تو وہ اسے صرف ایک ناخوش گوار حادثہ تصور کرے گی۔"

"اوہ ولسن ڈیئر! تم بہت ذہین اور چالاک ہو۔"

"نہیں مارتھا میری جان! میں اتنا چالاک نہیں ہوں جتنا گیسپر بے وقوف تھا۔ اُس سے نمٹنے کے لیے کسی چالاکی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"تم نے اُس کی گاڑی تلاش کی تھی؟"

"کی تھی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ گاڑی اُس نے خاصے فاصلے پر کھڑی کی ہو گی۔ اس سے ہمارا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور اگر اُس کی گاڑی نہ بھی ملی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"لیکن ڈیئر! دس ہزار ڈالر تو ضائع ہو گئے نا؟"

"کوئی بات نہیں مارتھا! اپنی مسرتوں کے سامنے بھلا دس ہزار ڈالر کیا حیثیت رکھتے ہیں۔" ولسن کرسی کی پشت پر رکھا ہوا کوٹ پہننے لگا۔

"کیا تمہارا واپس جانا ضروری ہے ڈیئر؟"

"ہاں مارتھا! مجھے پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے لیکن خیر اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اس کے علاوہ اس مکان سے میری غیر موجودگی بہت ضروری ہے۔ صرف احتیاطی تدبیر ہے تاکہ اگر ضرورت پڑے تو یہ ثابت کیا جا سکے کہ میں دو روز تک دوسرے شہر میں رہا۔"

"بے شک۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ذرا سوچو تو سہی۔ وہ احمق اپنے ذلیل حربے سے ہمارے درمیان نفاق ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت ہماری محبت میں معمولی سی کمی بھی پیدا نہیں کر سکتی۔"

"مجھے یہ کہنے دو مارتھا کہ اُس نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی تھی بلکہ اُس نے ہمیں سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ اُسے کیا معلوم کہ میں شادی کے معاملے میں بے حد خوش قسمت ہوں اور میری ازدواجی زندگی اتنی خوش گوار ہے کہ کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"شکریہ ڈیئر! تم بہت اچھے شوہر ہو۔"

"اچھا مارتھا! اب مجھے اجازت دو۔ ابھی بہت طویل سفر کرنا ہے۔" ولسن نے آگے بڑھ کے اپنی بیوی کے رخساروں پر محبت کے نقوش ثبت کیے۔ "شب بخیر مارتھا! میں معمول کے مطابق کل شام لوٹ آؤں گا۔ اب تم اطمینان سے گہری نیند سو سکتی ہو۔"

"شب بخیر ڈیئر! ذرا احتیاط سے گاڑی چلانا۔" مارتھا نے کہا۔ "اور ہاں انجیلا کو میری طرف سے خوب پیار کرنا۔"

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تذکرہ حضرت شاہ آغا محمد	ریاض الفضائل	یادگار نظامی	تاریخ مشائخ چشت
مرزا نذیر احمد	عبدالغنی	مرتضیٰ حسین	خلیق نظامی

● ابوالمنصور سرمدی

قمر صاحب

انیسویں صدی کے آخری دن تھے۔ ایک سُرخ و سفید نوجوان صبح کی نماز پڑھتا اور سورج کی طرف نگاہ جما کے بیٹھ جاتا۔ ظہر کے وقت تک یہی حالت رہتی پھر اُس کا رُخ مغرب کی طرف ہو جاتا۔ اُس کے حجرے کے سامنے دھوپ سے بچاؤ کے لیے کھپریل بنی ہوئی تھی۔

وہ کھپریل نوجوان نے اُتروا دی تھی اس لیے مغرب کے وقت تک اُس پر پوری دھوپ پڑتی رہتی۔ وہ نوجوان مسلسل سورج کی طرف دیکھ سکتا تھا لیکن خود اُسے ایک نظر دیکھنے کی تاب کسی میں نہیں تھی۔ کوئی نظر بھر کر اُس کی طرف دیکھتا تو اُس کا چہرہ جھلس کر رہ جاتا۔ اُس کے معدودے چند عقیدت مند جان پر کھیل کے قدم بوسی کے لیے آتے تھے۔ اُن کی نگاہیں بھی جھکی رہتی تھیں۔ وہ خود بھی دوسروں کی طرف دیکھنے سے احتراز کرتا تھا۔

اُن دنوں وہ نوجوان اپنے خاندان کے ساتھ وسطِ ہند کے علاقے ہٹ میں مقیم تھا۔ وہاں ایک پرانا قلعہ تھا۔ قلعے میں ایک باؤلی تھی۔ لوگ باؤلی سے پانی بھرنے آتے تھے۔ قلعے میں جانے کے لیے باؤلی سے گزرنا پڑتا تھا۔ نوجوان روزانہ فجر کی نماز کے بعد قلعے جاتا اور سورج کی طرف نگاہ جما کے کھڑا ہو جاتا پھر دس گیارہ بجے واپس آتا۔ ظہر کے بعد وہ پھر وہاں پہنچتا اور سورج غروب ہونے کے بعد بستی کا رُخ کرتا۔ لوٹتے وقت وہ باؤلی قریب آنے سے پہلے آنکھیں بند کر لیتا تھا تاکہ کسی پانی بھرنے والے پر اُس کی نظر نہ پڑ جائے۔ عصا کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ گھر آ جاتا۔ گھر میں بھی سختی سے یہ انتظام تھا کہ اُس کے آتے وقت کوئی سامنے نہ ہو۔ اُس کے جلال کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے دُور سے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے تھے۔ چرند و پرند تک گریزاں ہو جاتے تھے۔ البتہ درختوں کو نوجوان کی شرربار نظروں سے مفر نہیں تھا۔ اُن کی قسمت میں دُھواں اور جلے ہوئے پتے لکھے تھے۔

ایک دن ایک خوب صورت عورت رادھا قلعے کی باؤلی سے دو گھڑے سر پر رکھ کے لا رہی تھی۔ اتفاق سے نوجوان قلعے سے واپس آ رہا تھا۔ رادھا ایک تیز و طرار عورت تھی۔ اُس نے چاہا، اس سے پہلے کہ نوجوان اتصالِ راہ تک پہنچے "میں آگے نکل جاؤں کیونکہ میرے سر پر بوجھ ہے" نوجوان تو آنکھیں بند کیے دھیرے دھیرے دیر میں پہنچے گا۔ بستی واپس جانے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ نوجوان دوسری پگڈنڈی سے آ رہا تھا۔ اتصالِ راہ کے قریب ایک گھنا اور پرانا درخت تھا۔ رادھا اُس درخت کے قریب پہنچی تو نوجوان نے اُس کی آہٹ سنی۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو درخت پر نظر پڑی۔ دفعتہً ہرے بھرے درخت سے دھواں اُٹھا اور وہ چشم زدن میں خشک ہو گیا۔ رادھا قریب پہنچ چکی تھی۔ نوجوان نے اُسے دیکھ کے غصے سے عصا اُس کے سر پر مارا۔ گھڑے ٹوٹ کے زمین پر بکھر گئے۔ رادھا پانی میں شرابور ہو گئی اور گھر کی طرف بھاگی۔ خیریت گزری کہ نوجوان کی طرف رُخ کرنے سے پہلے اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ چہرہ محفوظ رہا لیکن سارے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ روتی ہوئی اُسی وقت نوجوان کی نانی کے پاس پہنچی۔ بی بی جی

دُہائی ہے میرا سارا بدن جل رہا ہے۔"

نوجوان کی بیوی نے اسے سمجھا بُجھا کر بٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد نوجوان بھی آ گیا اور حسبِ معمول تخت پر جا کے بیٹھ گیا۔ اُس کی بیوی اُس کے پاس گئی۔ ایسے وقت میں وہی اُس کے سامنے جاتی تھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "رادھا کی خطا معاف کر دیجیے۔ بے ادب ضرور ہے مگر ناسمجھ ہے۔"

نوجوان نے جواب دیا "ارے وہ رو کیوں رہی ہے؟ وہ تو پانی میں بھیگ ہوئی ہے۔ جلن کیسی؟"

اُسی وقت رادھا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے بدن پر برف مل دی ہو۔ اُسے سکون حاصل ہو گیا اور وہ نوجوان کے گھر سے فوراً بھاگ پڑی، مبادا اُس سے کوئی اور غلطی سرزد ہو جائے۔ وہ بلند آواز سے یہ کہتی جاتی تھی "پُرانے قلعے کی طرف مت جانا۔ پُرانے قلعے کی طرف مت جانا، وہاں وہ موجود ہے۔"

نوجوان کا نام شاہ آغا محمد تھا۔ آغا محمد اپنے وقت کے قطب تھے اور انھیں حضرت صاحب کہا جاتا تھا۔ وہ اللہ کے عشق میں ہر وقت سورج کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ اُن کے گھر کی دیوار کے ساتھ دُور تک ہرے بھرے درخت لگے ہوئے تھے اور اُن کے ہاں ایک طوطا بھی پلا ہوا تھا۔ ایک دن حضرت صاحب گھر لوٹے تو طوطا انھیں دیکھتے ہی شور مچانے لگا۔ حضرت صاحب آنکھیں بند کیے ہوئے صحن تک پہنچ چکے تھے۔ طوطے کی آواز سُن کے انھوں نے پلٹ کے دیکھا۔ طوطا اُسی لمحے تڑپ کے مر گیا۔ حضرت صاحب کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ انھوں نے درختوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ اُسی وقت تمام درخت جُھلس کر رہ گئے۔ حضرت صاحب نے گھبرا کے آسمان کی طرف دیکھا "بارِ الٰہا! مجھے زندگی کے لیے ثواب بنا، عذاب نہیں۔ میری آنکھیں صرف اتنی کھول کہ دُنیا والے میرے عشق کی تپش سہار سکیں ورنہ میں تیری دُنیا سے آنکھیں پھیر لوں گا۔"

اُس دن سے حضرت صاحب کی آنکھیں ہمیشہ نیم وا رہتیں۔ اللہ کی تجلّیات نے انھیں اس طرح اپنے دامن میں لے لیا تھا کہ وہ کسی کی آہٹ پر چونکتے تو انھیں انوار کی تابانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔

زیادہ دُور کی بات نہیں، مرزا آغا محمد ۱۸۳۱ء میں تُسکر گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے تقریباً تمام اعزا ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ کچھ عزیز محمود نگر میں بھی آباد تھے۔ آغا محمد نسلاً تہرانی تھے۔ اُن کے والد کے پردادا مرزا محمد قاسم اودھ کی سلطنت کے شباب میں لکھنؤ پہنچے تھے۔ لکھنؤ میں وہ محکمۂ دارالضرب کے داروغہ ہوئے۔ اس تقرر اور شاہِ اودھ کی قدر شناسی نے انھیں ہمیشہ کے لیے لکھنؤ کا کر دیا۔ اُن کے بعد اُن کی اولاد بھی لکھنؤ ہی میں رہی اور شاہی زمانے میں یہ سب لوگ معزز عہدوں پر فائز رہے۔ علم و فضل میں بھی یہ خاندان ہمیشہ ممتاز رہا۔

حضرت صاحب کے والد محمد مرزا واجد علی شاہ کے چچا امجد علی کے عہد میں محکمۂ تعمیرات کے داروغہ تھے۔ سلطنت کے زوال کے بعد وہ محمود آباد میں درگاہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ حضرت صاحب کی والدہ سیّد علی مردان کے خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ سیّد علی مردان کی نہر دلّی میں بہت مشہور تھی۔ شیر مردان خاں اُن کے خالو تھے جن کا باغ شیر جنگ کے نام سے اب بھی لکھنؤ میں موجود ہے۔ وہ بہت نیک نفس، خدا ترس اور عبادت گزار عورت تھیں۔ محرّم میں اُن کا یہ دستور تھا کہ وہ چاند کی منتظر رہتیں اور مناقب پڑھتے ہوئے روتی رہتیں۔ محرّم کا چاند دیکھتے ہی کھانا چھوڑ دیتیں۔ سات محرّم تک صرف رات کو دودھ پیتیں۔ اور ۸ محرّم سے کھانا پینا سب چھوڑ دیتیں۔ حتّیٰ کہ نقاہت سے دن میں کئی بار بے ہوش ہو جاتیں۔ آغا محمد کو اہلِ بیت کی محبّت والدین سے ورثے میں ملی تھی۔ بچپن ہی میں اس محبت نے اُن کے دل پر تسلّط جما لیا تھا۔ انھیں کھیل کود سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ مکتب گھر کے نزدیک تھا۔ خاندان کے سب لڑکے وہیں پڑھتے تھے۔ آغا محمد نے کم عمری میں قرآن حفظ کر لیا تھا اور "گلستاں"، "بوستاں" اور "میزان الصرف" وغیرہ ختم کر لی تھیں۔ اُنھی دنوں ایک شاہ صاحب اپنے خاندان کے ساتھ اُن کے باغ میں آ کے مقیم ہوئے۔ آغا محمد اکثر رات کے وقت شاہ صاحب کی باتیں سننے کے لیے باغ میں چلے جاتے۔ ایک رات وہ باغ میں پہنچے تو شاہ صاحب کی جھونپڑی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ انھوں نے اندر سے شاہ صاحب کی بیوی کی آواز سُنی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھیں "آج فاقے کا تیسرا دن ہے۔ بچّوں کو بڑی مشکل سے بہلایا ہے۔ نہایت وقت سے سوئے ہیں۔ سوئے کہاں ہیں، فاقے کی نقاہت نے غافل کر دیا ہے۔"

آغا محمد جلدی سے گھر واپس آئے اور والدہ سے کھانا لے کے دوبارہ باغ میں پہنچے۔ انھوں نے شاہ صاحب کو آواز دی اور کھانا اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شاہ صاحب نے اپنی بیوی سے کہا "نیک بخت! اللہ نے رزق پہنچا دیا ہے۔ بچّوں کو بیدار کر دو۔"

اُن کی بیوی بچّوں کو جگا کے اُن کے منہ ہاتھ دھلانے میں مصروف ہو گئی۔ چٹائی پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ شاہ صاحب گھڑا اُٹھا کے باغ کے کنوئیں سے پانی بھرنے چلے گئے۔ آغا محمد بھی اُن کے ساتھ تھے۔ دونوں پانی لے کے واپس آئے تو دیکھا کہ کھانا ایک کتّا کھا رہا ہے۔ شاہ صاحب خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اُن کی بیوی نے حسرت سے کہا "افسوس کہ کتّا رزق پائے اور آدمی کے بچّے بھوکے رہیں۔"

شاہ صاحب یہ سُن کے بہت متاثر ہوئے اور کُتّے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ابھی تک کھانے میں مصروف تھا۔ شاہ صاحب نے اُس سے کہا "تو مر کیوں نہیں جاتا؟"

کتّے نے کھانا چھوڑ کے فوراً ایک انگڑائی لی اور اُسی وقت اُس کی جان نکل گئی۔ آغا محمد کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ شاہ صاحب نے اُن سے کہا "صاحب زادے! روتے کیوں ہو۔ مشیّتِ ایزدی یہی تھی۔ تم نے

حقِ خدمت ادا کر دیا۔ اللہ تمھیں جزا دے گا۔ تمھیں تو رونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔"

آغا محمد کا دل اور بھر آیا۔ وہ خوب روئے۔ شاہ صاحب نے شفقت سے انھیں گلے لگا لیا۔ "صاحب زادے! ہمیشہ یاد رکھنا کہ آج میں نے تمھیں گلے لگایا ہے۔ کل بڑے بڑے اولیا تمھیں گلے لگائیں گے۔ گھبراؤ نہیں۔ بندے کے اور اللہ کے معاملات عجیب ہوتے ہیں۔ اللہ باقی ہے، بھوک فانی ہے۔ ابھی یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اب گھر جاؤ اور چین سے سوؤ۔"

آغا محمد کی عمر مشکل سے نو دس برس تھی۔ وہ گھر آکے ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے والدہ کو رات کا واقعہ سنایا۔ اُن کی والدہ نے جلدی جلدی کھانا تیار کر کے ایک لونڈی کے ہاتھ شاہ صاحب کو بھیجا۔ آغا محمد بھی ساتھ گئے، لیکن شاہ صاحب کی جھونپڑی دیکھ کے انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے ویران پڑی ہو۔ نہ شاہ صاحب تھے، نہ ان کے بیوی بچے۔ وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ ایک بھرے پُرے خاندان کو کون سی ہوا کہاں اُڑا کے لے گئی؟ انھیں سکتہ سا ہوا اور اُسی وقت اُن کا دل دُنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ اور خدا کا تصور جسم و جاں پر محیط ہو گیا۔

وہ اکثر اپنی والدہ سے پوچھتے: "ماں! خدا کیسے ملے گا؟" وہ مسجد میں نمازیوں سے بھی یہ بات دریافت کرتے اور پیش امام سے بھی پوچھتے۔ لوگ جواب میں انھیں مختلف عبادتیں اور وظائف بتاتے مگر انھیں سکون میسر نہ ہوتا۔

آخر ایک شخص نے انھیں بتایا کہ "باندے میں ایک بزرگ شاہ مخصوص عالم رہتے ہیں۔ وہ کافروں تک کو ایمان کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ اُن کا ایک واقعہ سنو۔ ایک بار شاہ مخصوص عالم اپنے کسی خادم کے ساتھ بنارس گئے۔ انھوں نے شہر سے باہر ایک بوسیدہ مسجد میں قیام کیا۔ وہاں چند لوگوں نے اُن کی گفتگو سنی اور متاثر ہو کے اُن کے گرویدہ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ بنارس بھر میں اُن کا چرچا ہونے لگا۔ یہ ایک اُجڑی ہوئی مسجد تھی۔ بسا اوقات ایک بھی نمازی نہیں آتا تھا۔ شاہ مخصوص عالم اور ان کے خادم کو تنہا رہنا پڑتا تھا۔ اسی تنہائی میں ایک دفعہ مسلسل تین دن سے فاقہ تھا۔ خادم نے اُن سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں شہر جا کے کچھ مزدوری کر لاؤں؟ شاہ مخصوص عالم نے جواب دیا۔ جو خدا شہر میں روزی دے سکتا ہے وہ یہاں بھی موجود ہے اور مجبور نہیں ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ جلدی کیا ہے۔

اُن دنوں باندے کا نواب بنارس کے راجا کا مہمان تھا اور اُسے شاہ مخصوص عالم کی موجودگی کا علم ہو چکا تھا۔ وہ اُن کی خدمت میں پہنچا۔ دونوں میں دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ رخصت ہوتے وقت نواب نے انھیں کھانے کی دعوت دی۔ شاہ مخصوص عالم نے کہا۔ میں ضرور حاضر ہوتا لیکن آج کل میں اللہ کا مہمان ہوں۔ میزبان کی مرضی کے بغیر مہمان کو کسی دوسرے کے دروازے پر نہیں جانا چاہیے۔

نواب مایوسی سے لوٹ گیا۔ اُس نے افسردگی کے ساتھ اپنے مصاحبین سے کہا۔ خواہش تھی کہ شاہ صاحب میرے دسترخوان کی عزت بڑھاتے لیکن انھوں نے مجھے اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھا۔

ایک مصاحب نے اعتماد سے کہا۔ آپ دعوت کا انتظام کیجیے، شاہ صاحب کو لانے کی ذمّے داری میں لیتا ہوں۔

مصاحب شاہ مخصوص عالم کے پاس آیا اور اُن سے کہا۔ آج پنج تنِ پاک کی فاتحہ ہے۔ آپ تشریف لے چلیے۔ فاتحہ پڑھیے اور ہم لوگوں کو بھی داخلِ حسنات کیجیے۔

شاہ مخصوص عالم مسکرائے۔ واہ مولا! ایک گناہ گار بندے کے لیے پنج تنِ پاک کو درمیان میں لے آیا۔ چلو چلتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے نواب کی قیام گاہ پہنچ کے انھوں نے فاتحہ میں شرکت کی۔ کھانے کے بعد سماع کی محفل آراستہ ہوئی۔ بنارس کا راجا بھی اپنے مندر کے بڑے پجاری کے ساتھ محفل میں شریک تھا۔ بڑا پجاری شاہ مخصوص عالم کا پھٹا پرانا لباس نخوت اور حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ شاہ صاحب نے اُس کے ہاتھوں میں پڑے ہوئے سونے کے کڑے اور زرّیں دوشالا دیکھ کے نظریں جھکا لی تھیں۔ قوّال جوش و خروش سے گا رہے تھے ؎ محبت غیر سے میری چھڑا دو یا رسول اللہ۔

شاہ مخصوص عالم پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسی حالت میں انھوں نے پجاری کو مخاطب کر کے کہا۔ سنو۔ کیا کہا جا رہا ہے۔ یہ کہہ کے وہ مستی میں قوّال کے ساتھ مصرع دہرانے لگے۔

محبت غیر سے میری چھڑا دو یا رسول اللہ

پجاری نے جیسے ہی شاہ مخصوص عالم کے چہرے پر نظر کی، دفعتہً اُس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور بے تاب ہو کے چیختے ہوئے نعرہ لگایا لا الٰہ الا اللہ۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ یہ بڑا پجاری ہے، سب محوِ حیرت تھے۔ پجاری اپنا سر جھٹکتا، جھومتا، نعرے لگاتا ہوا شاہ مخصوص عالم کے پیروں پر گر گیا۔ انھوں نے اسے اُٹھایا اور کہا۔ تیری جگہ میرے سینے میں ہے۔"

آغا محمد یہ واقعہ سن کے بے چین ہو گئے۔ جو آگ اُن کے سینے میں سُلگ رہی تھی وہ بھڑک اُٹھی۔ اُن کی عمر تیرہ چودہ برس ہو گی۔ وہ گھر سے خدمت گار کے بغیر کبھی نہیں نکلے تھے لیکن اُس وقت انھیں نہ اپنی کم سنی کا خیال رہا، نہ سفر کی مشکلوں کا خیال۔ اُن کے پاس زادِ راہ بھی نہیں تھا مگر وہ کسی کو اطلاع دیے بغیر شاہ مخصوص عالم کے شہر باندے جانے کے لیے گھر سے نکل گئے۔ اُس زمانے میں ریل نہیں تھی۔ چنانچہ وہ مصائب برداشت کرتے ہوئے پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ کان پور پہنچتے پہنچتے اُن کے تلووں میں چھالے پڑ چکے تھے اور فاقوں سے اُن کا چہرہ نڈھال تھا۔ اتفاقاً کان پور کا ایک رئیس اُن کے خاندان سے واقف تھا۔ اُس نے انھیں بازار سے گزرتے ہوئے دیکھ کے پہچان لیا اور اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ آغا محمد کو خیال آیا، ایسا نہ ہو کہ یہ

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک بدکار عورت نے اپنی اوڑھنی سے ڈول باندھ کر کنویں سے پانی نکالا۔ قریب ہی ایک پیاسا کتا زبان نکالے کھڑا تھا۔ عورت نے اُسے پانی پلادیا۔ یہ نیکی اُس کی بخشش کا سبب بن گئی"

حضرت ابو ہریرہؓ

مخلص شخص مجھے پھر گھر بھجوادے یا میرے گھر والوں کو خبر کردے" وہ رات کے پچھلے پہر چھپکے سے باہر نکلے اور کئی دن کا سفر کرکے ایک گاؤں پہنچے۔ یہاں ایک گوالن نے انھیں اپنے ہاں بٹھا کے کچھ کھانے کو دیا۔ آغا محمد کو معلوم تھا کہ ایک وقت کے کھانے سے زیادہ قیام کرنا مسافر کی منزل کھوٹی کر دیتا ہے۔

وہ وہاں سے بھی روانہ ہوگئے۔ انھیں پیدل چلنے کی عادت نہیں تھی اور نہ کبھی انھوں نے سفر کی صعوبت اٹھائی تھی مگر وہ چلتے رہے۔ وہ ایک ایک منزل دو دو تین تین دن میں طے کرتے۔ جہاں ندی پڑجاتی وہاں غسل کرتے، کپڑے دھوتے، پھر آگے بڑھ جاتے۔ چلتے چلتے پیروں میں زخم پڑگئے تھے۔ منزل دور تھی لیکن شوق اڑائے لیے جارہا تھا۔ اسی طرح مشقتیں سہتے سہتے آخر وہ موضع گدیا پہنچ گئے۔

گدیا میں انشا میاں نامی ایک درویش صفت رئیس نے عصر کے وقت مسجد میں ایک سرخ و سفید لڑکے کی عبادت میں محویت کا عالم دیکھا تو آگے نہیں بڑھ سکے، وہیں جم کے رہ گئے۔ وہ انتظار کرتے رہے کہ لڑکا کب عبادت ختم کرے اور وہ اس حیرت انگیز لڑکے سے بات کریں۔ انشا میاں کے اشارے پر کئی لوگوں نے اسے مسافر سمجھ کے کھانے کی پیشکش کی۔ آغا محمد پورے دن کے فاقے سے تھے مگر وہ خوش اسلوبی سے ٹال کے جنگل کی طرف نکل گئے۔ جنگل پہنچ کے انھوں نے دعا کی کہ "خداوندا! تو خفیفت سے باخبر ہے اور تیرا نام رزاق ہے۔ میں تیرے سوا کسی کے سامنے کیسے ہاتھ پھیلا سکتا ہوں۔ میرا رزق میری طبیعت کے مطابق بے منتِ غیر عطا کر یا قرآن سے اپنا نام رزاق مٹادے۔"

دعا کے بعد وہ دوبارہ واپس آگئے۔ مغرب کے بعد انشا میاں نے اُن سے بستی میں آنے کی غرض و غایت پوچھی۔ انھوں نے جواب دیا۔ "مسافر ہوں اور ایک ضرورت سے باندے جارہا ہوں۔ آج رات یہاں قیام کروں گا، صبح ہوتے ہی روانہ ہوجاؤں گا۔"

انشا میاں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور دنیا کے مکر و فریب سے قطعی نابلد ہیں۔ انھوں نے آغا محمد سے کہا۔ "صاحب زادے! عشا کے بعد تم غریب خانے چلنا اور ماحضر تناول کرنا۔ مجھے مسرت ہوگی۔"

آغا محمد نے جواب دیا۔ "بزرگوار! آپ مجھ سے پہلے کبھی نہیں ملے۔ ہمارے درمیان کوئی مراسم بھی نہیں ہیں۔ پھر یہ دعوت کیسی؟"

انشا میاں خاموش ہوگئے۔ کچھ دیر بعد اتفاق سے انھوں نے شاہ مخصوص عالم کا ذکر چھیڑ دیا کہ وہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ باندے کے نواب اور امرا اُن کی خدمت میں دست بستہ کھڑے رہتے ہیں لیکن شاہ صاحب کا حال یہ ہے کہ وہ بازار جا کے غریبوں اور بیواؤں کا سودا سلف خریدتے ہیں اور مطلوبہ سامان اپنے سر پہ رکھ کر اُن لوگوں کو پہنچاتے ہیں۔

حاضرین میں سے کسی نے شاہ مخصوص عالم کے باطنی علم کی اور کسی نے ظاہری علم کی تعریف کی۔ انشا میاں نے بتایا کہ "باندے کے تقریباً تمام علما اپنے مسائل کے تصفیے کے لیے شاہ صاحب سے رجوع کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام مولوی احسان الحق اپنے تمام علم و فضل کے باوجود شاہ مخصوص عالم کے مرید ہیں۔"

آغا محمد یہ گفتگو سن کے انشا میاں سے ایک ربط محسوس کرنے لگے۔ اس لیے اُنھوں نے اُن کے گھر جانا منظور کرلیا لیکن وہ وہاں پہنچے اور دسترخوان بچھا تو انھوں نے کھانا کھانے سے انکار کردیا۔ انشا میاں نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانے۔ آخر انشا میاں نے اُن سے پوچھا۔ "صاحب زادے! آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟" انھوں نے اپنی تعلیم بتائی۔ انشا میاں نے دوسرا سوال کیا۔ "کیا آپ ملازمت کرسکیں گے؟"

آغا محمد نے جواب دیا۔ "ہاں اگر میرے لائق ملازمت ملے گی تو ضرور کروں گا۔"

انشا میاں نے کہا کہ "میرے لڑکے نے حال میں "گلستان" شروع کی ہے آپ اُسے پڑھا دیا کیجیے۔ میں آپ کو دسترخوان اور چار روپے ماہانہ تنخواہ دے دیا کروں گا۔" آغا محمد نے حامی بھرلی۔ انشا میاں نے کہا۔ "آپ کی ملازمت آج ہی سے شروع ہوگئی۔ اب کھانا تناول کرلیجیے۔"

آغا محمد نے پہلے لڑکے کو بلوایا، اُس سے اس کا سبق سنا اور اگلا سبق دل جمعی سے پڑھایا۔ پھر کھانا کھایا۔ انھوں نے ملازمت اس شرط پر قبول کی تھی کہ جب تک اُن کا دل چاہے گا، وہ رہیں گے۔

صرف چند روز میں وہ وہاں سے اکتا گئے۔ شاہ مخصوص عالم سے ملنے کی خواہش انھیں ہر وقت بے چین رکھنے لگی۔ آخر ایک دن وہ چپکے سے روانہ ہوگئے۔ باندے پہنچ کے جب وہ شاہ مخصوص عالم کی خانقاہ گئے تو شاہ صاحب اپنے مریدوں کو درس دے رہے تھے۔ اچانک اُن کی نظر آغا محمد پر پڑی۔ وہ فوراً بولے۔ "سبحان اللہ! کیسے علم کو کیسا طالب ملا ہے۔"

آغا محمد دیوانہ وار اُن کے قدموں پہ جا گرے۔ شاہ صاحب نے مسند سے اٹھ کر انھیں سینے سے لگالیا۔ اسی وقت اُن سے بیعت لی اور انھیں اپنے درس میں شامل کرلیا۔ قاعدے کے مطابق اُن کے لیے چار روپے مہینہ وظیفہ مقرر ہوا۔ ایک غریب سید فیل خانے میں ملازم تھے، اُن کے ہاں آغا محمد کے رہنے

کا انتظام ہو گیا۔ سستا زمانہ تھا۔ ایک روپے کا چار پانچ سیر گھی، ایک روپے کا منوں غلّہ اور ایک آنے سیر گوشت ملتا تھا۔ آغا محمد اپنے وظیفے سے ایک روپیہ مُرشد کی نذر کر دیتے تھے۔ آٹھ آنے اپنے لیے رکھتے تھے اور آٹھ آنے چوکیدار کو دیتے تھے، تاکہ وہ آدھی رات گزرنے کے بعد انھیں جگا دیا کرے۔ ان کے سرہانے ٹھنڈے پانی کا گھڑا رکھا رہتا تھا۔ چوکیدار کو تاکید تھی کہ اگر غفلت کی وجہ سے اُن کی آنکھ نہ کھُلے تو وہ اُن کے سر پر پانی ڈال دیا کرے۔ وہ شہر سے باہر ایک مسجد میں جا کے صبح تک عبادت کرتے اور فجر کی نماز پڑھ کے وہاں سے خانقاہ واپس آتے۔ دن بھر شیخ کی صحبت سے فیض یاب ہوتے پھر مغرب سے پہلے اعتکاف کے لیے آبادی سے باہر نکل جاتے۔

ایک دن شیخ الاسلام مولوی احسان الحق خانقاہ پہنچے۔ شاہ مخصوص عالم کا حجرہ بند تھا۔ انھوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو انھیں آغا محمد بھی نظر نہیں آئے۔ خانقاہ کا ایک خادم موجود تھا۔ وہ کسی ایسے شخص سے گفت گو کر رہا تھا جس کی نہ شکل نظر آ رہی تھی نہ آواز سُنائی دے رہی تھی۔ مولوی احسان الحق خادم کے پاس پہنچے اور آہستہ سے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ "تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

اچانک انھیں آغا محمد فرش پر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ اُن کی آنکھیں جلال سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ عام حالات میں وہ مولوی احسان الحق کا بہت احترام کرتے تھے لیکن اس وقت انھوں نے غصّے سے کہا۔ "مولوی صاحب! جو باتیں تمھاری کتابوں میں نہیں لکھی ہیں اُن پر گفتگو نہ کیا کرو۔"

اُسی وقت حجرے کا دروازہ کھُلا اور شاہ مخصوص عالم نے باہر آ کے آغا محمد سے کہا۔ "آغا! جو کتابیں تم نے پڑھی ہی نہیں ہیں اُن پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا کرو۔" پھر وہ مولوی احسان الحق سے مخاطب ہوئے۔ "احسان! آغا ابھی بچّہ ہے۔ شریعت سے دامن چھڑا کے طریقت کی طرف بھاگ رہا ہے۔ کچھ دن اور میرے پاس رہا تو جذب میں کھو جائے گا۔ اسے ظاہری علم سے آراستہ کرو۔ آج سے یہ تمھارا دینی بیٹا ہے۔"

مولوی احسان الحق خوشی خوشی آغا محمد کو گھر لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ "ہمیں یہ بیٹا شاہ صاحب نے عطا کیا ہے۔" مولوی احسان الحق کی بیوی بے اولاد تھیں اور انھیں اولاد نہ ہونے کا بہت غم تھا۔ وہ بے حد خوش ہوئیں۔ اُس دن سے آغا محمد مستقلاً مولوی احسان الحق کی حویلی میں منتقل ہو گئے۔ ابھی تک انھوں نے شاہ مخصوص عالم یا مولوی احسان الحق کو اپنے خاندان کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا تاکہ اُن کے ماں باپ کو خبر نہ ہو جائے اور وہ آبِ حیات کے جس چشمے پہ کھڑے ہیں وہاں سے انھیں لوٹنا نہ پڑے۔

آغا محمد ابھی ظاہری اور باطنی علوم کی تحصیل کر رہے تھے کہ ایک شام شاہ مخصوص عالم نے اپنے تمام عقیدت مندوں اور مُریدوں کو جمع کر کے اُن سے کہا۔ "عزیزو! میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ آغا محمد کی تعلیم مکمل ہونے

> عنقریب ایسے لوگ تمھارے حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمھاری روزی ہوگی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور بُرے کام کریں گے۔ وہ تم سے اُس وقت تک راضی نہیں ہوں گے، جب تک تم اُن کی بُرائیوں کی تعریف اور اُن کے جھوٹ کی تصدیق نہیں کرو گے لیکن تمھارا فرض ہے کہ تم اُن کے سامنے حق کا کلمہ بلند کرو، اگر وہ اسے گوارا کر لیں تو فبہا لیکن اگر وہ اسے گوارا نہ کریں اور حق گو کو قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہوگا۔
>
> رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم

میں ابھی بہت وقت ہے۔ میں اسے تم لوگوں کے سُپرد کرتا ہوں اور اسے اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔"

شاہ مخصوص عالم نے اپنے سر سے سبز دستار اُتار کے آغا محمد کے حوالے کر دی۔ حاضرین پر رقّت طاری ہو گئی۔ شاہ صاحب نے سب کو صبر کی تلقین کی اور حجرے میں جا کے خود کو اپنے حقیقی محبوب کے سُپرد کر دیا۔ محبوب نے انھیں قبول کر لیا۔

آغا محمد کو مُرشد کے انتقال کا بہت صدمہ تھا مگر مولوی احسان الحق کی دل جوئی نے انھیں پھر علم کی تحصیل کی طرف متوجہ کر دیا۔ اب اُن کی عمر ۲۰ سال ہو چکی تھی۔ وہ بہت وجیہہ نوجوان تھے۔ جہاں سے گزرتے، لوگ انھیں دیکھتے رہ جاتے۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے آغا محمد سے زیادہ خوب رو نوجوان کبھی نہیں دیکھا۔ مولوی احسان الحق کی بیوی اُن کی دینی ماں تھیں، اُن کے سوا کوئی عورت کوشش کے باوجود اُن کے چہرے پر نگاہ نہیں ڈال سکتی تھی۔

آغا محمد نہایت تیزی سے علم و عرفان کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ انھی دنوں باندے میں ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کی خبریں پہنچیں۔ پھر یہ اطلاع ملی کہ لکھنؤ تاراج ہو گیا ہے اور وہاں انگریزوں کے ہاتھوں شہریوں کی آبرو لُٹ رہی ہے۔ آغا محمد نے اس سلسلے میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "میں اپنا صدمہ کسی طرح ظاہر نہیں کر سکتا۔ مجھ پر ایسی خاموشی طاری ہوئی کہ جس وقت مؤذن نے مغرب کی اذان دی، اُس وقت مجھے ہوش آیا۔ ہر چند میں چاہتا تھا کہ طبیعت اس خیال سے ہٹا لوں مگر دل پر قابو نہیں تھا یہاں تک کہ نماز کے دوران میں بھی لکھنؤ کی تباہی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رہا۔ میں نے نماز کے بعد دیر تک توبہ و استغفار کی کہ اے پاک بے نیاز! جو تجھے منظور تھا ہوا مگر اب میری بے قراری دُور فرما اور میرے دل کو سکون دے۔ مجھے تیرے کار خانے میں کیا دخل اور میری فکر کس کام کی۔ یا مقلب القلوب میرا دل اُس طرف سے پھیر دے۔ میں نادم ہوں، تو علیم و دانا ہے کہ یہ طبیعت میری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اگر میرے عزیز و اقارب زندہ ہیں اور میری مادرِ مہرباں بقیدِ حیات ہیں اور میرے والد اور بھائی دُنیا میں باقی ہیں تو اُن کا اچھا ٹھکانا کر دے اور اگر اُن کی اس عالم کی سیر پوری ہو چکی ہو تو انھیں اپنے جوارِ رحمت

ایک بار حج کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے تمام گورنروں کو طلب کیا اور عام مجمع میں اعلان کیا کہ اگر کسی شخص کو ان کے کسی ظلم کے خلاف شکایت ہو تو وہ اپنی شکایت بے جھجک بیان کرے، پورے مجمع میں سے صرف ایک شخص اُٹھا۔ اُس نے عمرو بن عاصؓ کی شکایت کی کہ "انھوں نے ایک بار مجھے ناروا طور پر سو کوڑے لگوائے تھے۔"

حضرت عمرؓ نے شکایت کرنے والے سے کہا۔ "اٹھو اور ان سے بدلہ لو۔"

عمرو بن عاصؓ نے اس پر احتجاج کیا اور گزارش کی کہ "آپ اپنے گورنروں پر یہ دروازہ نہ کھولیے۔"

حضرت عمرؓ نے کہا۔ "میں نے رسولِ اکرمؐ کو اپنے آپ سے بدلہ لیتے دیکھا ہے۔ اس لیے گورنروں کو بدلے سے مبرا نہیں کیا جا سکتا۔" آخر عمرو بن عاص کو ہر کوڑے کے بدلے دو اشرفیاں دے کر اپنی پیٹھ بچانی پڑی۔

یں جگہ عطا فرما اور انھیں بخشش دے۔"

نماز کے بعد آغا محمد اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُستاد نے اندازہ لگا لیا کہ آغا محمد پر لکھنؤ کی خبروں کا بڑا اثر پڑا ہے، انھوں نے شاگرد کو دلاسا دیا اور کہا۔ "تمھارے لیے تو لکھنؤ اُسی دن تاراج ہو چکا تھا جب تم نے اُسے چھوڑا تھا۔ ہمیشہ باقی رہنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ خود کو اُس کی ذات میں گم کر دو۔"

جنگِ آزادی کی ناکامی ہندوستانیوں پر انتقام کی بجلی بن کر ٹوٹ چکی تھی۔ باندہ بھی اس انتقام کی زد پر تھا۔ مولوی احسان الحق نے کرائے کی ایک گاڑی لی اور گھر کا تمام اثاثہ لے کے اپنے اعزا اور آغا محمد کے ہمراہ راتوں رات بستی سے نکل گئے۔ وہ لوگ یہاں وہاں ہوتے ہوئے ترھوانی پہنچے۔ ترھوانی پر زبردست لوٹ مار کے بعد انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ ترھوانی کا تحصیل دار مولوی احسان الحق کا بہت معتقد تھا۔ اُس نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی عزت سے اپنے گھر لے گیا۔ تمام خاندان کا دستر خوان اور تیس روپلے ماہانہ مقرر ہو گئے۔ یہاں چند دن سکون سے گزرے۔ ایک روز مولوی احسان الحق کے لیے زنان خانے سے کھچڑی آئی۔ انھوں نے کھچڑی اسی وقت واپس بھجوا دی اور اپنی بیوی سے کہا۔ "چلو، اب یہاں سے رزق اُٹھ گیا۔"

"بیوی نے پوچھا۔ "کیسے؟ یہ ایک اچھا ٹھکانا ہے۔ ویسے بھی ان دنوں سفر کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔"

مولوی احسان الحق نے جواب دیا۔ "تحصیل دار پہ ادبار آنے والا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ میرے لیے کھچڑی جھوٹے برتن میں آئی تھی۔"

بیوی نے سامان بندھوانا شروع کر دیا۔ تحصیل دار کو اطلاع ہوئی تو اُس نے آ کے بہت منت سماجت کی کہ آپ اپنا ارادہ ملتوی کر دیجیے لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ دوسرے ہی دن خبر آئی کہ تحصیل دار کو بغاوت کے الزام میں کالے پانی کی سزا سنا دی گئی ہے۔

مولوی صاحب آغا محمد کے ہمراہ منزل بہ منزل قیام و سفر کرتے ہوئے جبل پور جا نکلے۔ یہاں ضلع کے سررشتے دار قاضی عظیم الدین نے اُن کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور انھیں نہایت معقول مشاہرے پر اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لیے مقرر کر لیا۔ مولوی احسان الحق نے یہ ملازمت جلد ہی چھوڑ دی اور تہیہ کر لیا کہ اب کہیں نوکری نہیں کریں گے۔ جبل پور چھاؤنی میں انھوں نے پہلے مسلم مدرسے کی بنا ڈالی اور آغا محمد کے ساتھ تعلیم و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

اُنھی دنوں آغا محمد نے خواب میں دیکھا کہ شاہ مخصوص عالم شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور اُن سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ "لو آغا! ہم تمھاری شادی بھی کر چلے۔" آغا محمد نے یہ خواب اُستاد کو سنایا۔ اُستاد نے اپنی بیوی سے کہا کہ "مبارک ہو۔ پیر و مرشد نے تمھارے بیٹے کی شادی کا انتظام کر دیا ہے۔ مرشد نے شادی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس لفظ سے اُن کی یہ خواہش ظاہر ہوتی ہے۔ یہ تقریب ایسی دھوم سے ہو کہ سارا شہر دیکھ کے عش عش کر اُٹھے۔"

آغا محمد کو تعجب تھا کہ انھیں شادی کرنے کا خیال تک نہیں تھا اور اُن کے پاس اخراجات کے لیے پیسے بھی نہیں تھے لیکن مولوی احسان الحق کی بیوی نے جبل پور کے رئیسِ اعظم خواجہ عطاء اللہ کی بیٹی کے لیے اُن کا پیام بھجوا دیا۔ رشتہ فوراً منظور بھی کر لیا گیا۔ فوجی چھاؤنی میں مولوی احسان الحق کے بہت سے شاگرد موجود تھے۔ وہ فوج کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ انھوں نے مِل جُل کے اِس شان و شوکت سے آغا محمد کی شادی کی کہ وہ جبل پور کی تاریخ کا ایک یادگار واقعہ بن گئی۔

شاید مولوی احسان الحق صرف آغا محمد کی دُنیوی تکمیل کے لیے زندہ تھے۔ آغا محمد کی شادی کے بعد ایک دن اُنھیں رات کی کسی دعوت میں جانا تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کے انھوں نے کہا۔ "کاش کھلاڑی پانی برسا دیتا تو مجھے عذر ہو جاتا۔"

یہاں تک کہ عشا کا وقت ہو گیا۔ نماز کے بعد میزبان انھیں لینے کے لیے آ گیا۔ مولوی احسان الحق خود اُس کے ساتھ چلے گئے لیکن اُس کے بے حد اصرار کے باوجود آغا محمد کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ وہ میزبان کے گھر پہنچے تو خوب پانی برسا۔ میزبان نے تواضع کا خاص اہتمام کیا تھا۔ مولوی احسان الحق نے سیر ہو کے کھانا کھایا لیکن گھر لوٹ کے اُن کا اضطراب بڑھ گیا۔ نصف شب کے بعد اُن کی وحشت اور زیادہ ہو گئی اور صبح ہوتے ہوتے اُن پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ حکیم کو بلوایا گیا۔ مولوی احسان الحق نے اپنی بیوی سے کہا۔ "کھلاڑی کا کھیل ختم ہو گیا۔ اب علاج سے کیا فائدہ؟"

اُن کی بیوی گریہ و زاری کرنے لگیں۔

"موت تو سب کے لیے ہے۔ روتی کیوں ہے نیک بخت! وقت کم ہے، ایک بات غور سے سُن لے۔" مولوی احسان الحق نے اپنی بیوی کو دلاسا

دیتے ہوئے کہا "میری ایک خواہش ہے، باقی زندگی میرے اور اپنے اعزّا کے بجائے اپنے دینی بیٹے کے پاس گزار دینا۔" بستر کے اطراف علما اور مُرید جمع تھے۔ اُن سے انھوں نے کہا "شاہ مخصوص عالم، آغا محمد کو اپنا جانشین نامزد کر چکے ہیں۔ آپ سب لوگ گواہ رہیے گا کہ میں نے مُرشد کی امانت ان تک پہنچا دی ہے۔ آج سے میرے بیٹے کو شاہ مخصوص عالم کا سجادہ نشین تصوّر کیا جائے۔" یہ اعلان کر کے مولوی احسان الحق نے مُرشد کی سبز دستار اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آغا محمد کے سَر پہ رکھ دی "میں یہ امانت آج سے تمھارے سُپرد کر رہا ہوں"۔ پھر اُن کا انتقال ہو گیا۔

آغا محمد مُرشد اور اُستاد کے انتقال کے بعد خود کو بہت تنہا محسوس کرتے تھے۔ وہ کئی کئی دنوں کے لیے جنگلوں میں نکل جاتے، مجاہدے کرتے، اعتکاف میں بیٹھے رہتے لیکن انھیں سکون میسّر نہ آتا۔ اُن کا ذہن بہت سے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔ شہر میں کوئی اور صاحبِ باطن نہیں تھا۔ انھوں نے چند عُلما سے خط و کتابت کی لیکن اُن کی اُلجھن بڑھتی گئی۔ وہ اکثر پوری پوری رات روتے ہوئے گزار دیتے تھے۔ یہ حال دیکھ کے ایک دن اُن کی دینی ماں نے اُن سے پوچھا "بیٹا! ہر وقت روتے کیوں ہو؟ اتنے اُداس کیوں رہتے ہو؟"

آغا محمد نے ادب سے جواب دیا "اپنی بدقسمتی پر روتا ہوں، پہلے مُرشد کا ساتھ چھوٹا پھر اُستاد بچھڑ گئے۔ جس منزل کے شوق نے گھر سے بے گھر کیا تھا۔ میں اب بھی اُس سے بہت دُور بھٹک رہا ہوں۔ منزل ملنا تو درکنار، راستے تک کا پتہ نہیں چلتا۔"

"تمھیں صبر و سکون سے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ بانس بریلی میں شاہ نظام الدّین حسین موجود ہیں۔ تم اُن سے اپنا مدّعا کہہ کے تو دیکھو" ماں نے کہا۔

آغا محمد نے شاہ نظام الدّین کو ایک خط لکھا اور خط میں شریعت و طریقت کے متعلق کچھ سوالات کیے۔ شاہ نظام الدّین نے اتنے جامع جوابات روانہ کیے کہ آغا محمد اُن سے ملاقات کے لیے تڑپ اٹھے۔ انھوں نے ماں سے اجازت لی اور بریلی پہنچ کے شاہ نظام الدّین سے ملے۔ شاہ صاحب کے علمی تبحّر اور التفات نے اُن کا دل موہ لیا۔ وہ اُن سے کسبِ فیض کر کے جبل پور آ گئے۔ پھر وہ کئی بار بریلی گئے اور آئے۔ اب ریل چلنے لگی تھی۔ لکھنؤ راستے میں پڑتا تھا۔ وہاں رُک کے انھوں نے اپنے والدین اور عزیزوں سے بھی ملاقات کی۔ علم کی طلب انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ بریلی کی خاک کو سُرمہ بنا لینا چاہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے خواب میں دیکھا کہ شاہ مخصوص عالم اُن کا ہاتھ پکڑ کے انھیں شاہ نظام الدّین کے پاس لے گئے اور اُن سے کہا کہ "ہمارے اس فرزند کو اپنے پاس رکھو۔" آغا محمد صبح اُٹھتے ہی بریلی روانہ ہو گئے۔ اس بار شاہ نظام الدّین نے انھیں دیکھا تو مسکرا کے کہنے لگے "تو تم آ ہی گئے۔ آؤ۔ آؤ۔ تخت خالی پڑا ہے۔"

اُسی وقت بیعت کی تجدید ہوئی۔ شاہ نظام الدّین نے انھیں معرفت

صالحین میں سے ایک شخص کا کہنا ہے "میں نے ایک غلام خریدا تھا۔ اُس سے میں نے پوچھا۔ تمھارا نام کیا ہے؟"

غلام نے جواب دیا "آقا! جو بھی آپ رکھ دیں۔"

میں نے پوچھا "تم کیا کام کر سکتے ہو؟"

غلام نے جواب دیا "جو آپ بتائیں۔"

میں نے پوچھا "تم کیا کھاتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "بھلا غلام کا دل آقا کے سامنے کیا کھانے کو چاہ سکتا ہے؟"

غلام کے ان جوابات پر مجھے رونا آ گیا۔ میں نے اُس سے کہا "پیارے! تو نے مجھے خدا کا ادب کرنا سکھا دیا۔"

جھنگ سے محمود اختر قریشی

کے اسرار سے آگاہ کیا۔ پھر خلعت و خلافت سے بھی نوازا۔ وہ سفر میں آغا محمد کو عموماً اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ اجمیر بھی لے گئے۔ وہاں ایک رات انھوں نے خدّام کو عمومی اجازت دی کہ ہر شخص خواجہ کے مزار پہ جا سکتا ہے۔ سب لوگ بصد شوق گئے لیکن آغا محمد نہیں گئے۔ شاہ نظام الدّین نے اُن سے کہا "تم شاید خصوصی اجازت چاہتے ہو؟ اچھا جاؤ۔ خواجہ کے دربار میں حاضری دو۔"

آغا محمد نے وہاں جا کے مزار کے پائنتی ایک دروازے کی چوکھٹ پر سَر رکھ دیا اور پوری رات راز و نیاز میں گزار دی اور فجر کی نماز کے بعد پیر کے پاس پہنچ کے چپ چاپ بیٹھ گئے۔ اُسی شام شاہ نظام الدّین اپنے مُریدوں کے ساتھ فاتحہ خوانی کے لیے مزار پہ حاضر ہوئے۔ آغا محمد بھی ساتھ تھے۔ اچانک سجادہ نشین کے بیٹے نے بلند آواز میں پوچھا "مرزا آغا محمد کون ہیں؟"

آغا محمد صف سے باہر آ گئے اور بولے "میں ہوں کہو کیا کہنا ہے؟"

"خواجہ پیا نے حکم دیا ہے کہ آغا محمد کی دستار بندی کی جائے۔"

وہ ایک سفید دستار طشت میں سجا کر لایا اور آغا محمد کی دستار بندی شروع کی۔ شاہ نظام الدّین نے درمیان میں دخل دیا "تم اقلیمِ طریقت کے ایک شہزادے کے سامنے بیٹھے ہو۔ دستار ذرا اچھی طرح باندھو۔"

آغا محمد پہ جذب کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ شاہ نظام الدّین نے انھیں سنبھالا دیا "آغا! ہوش میں آؤ۔ یہ پہلی منزل ہے، خود کو سنبھالو اور دربار میں نذر پیش کرو۔"

آغا محمد نے عالمِ مستی میں آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے کہا "پیر و مُرشد واقف ہیں کہ خاک سار کے پاس جان کے نذرانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

شاہ نظام الدّین نے فوراً اپنا صندوقچہ منگوایا "آغا محمد! لو، پانچ روپے نذر کر دو۔"

آغا محمد جبل پور میں عشا کی نماز کے بعد چند نوالے کھا کے رات تال

کی مسجد میں چلے جاتے اور صبح تک کلمے کی ضرب لگاتے۔ سورج نکلنے کے بعد لوٹتے۔ اکثر کچھ مرید بھی اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ واپسی میں کچھ دیر کے لیے ایک کنوئیں کے قریب ضرور بیٹھتے اور کنوئیں کا پانی نکلوا کر پیتے۔ کبھی کبھی لوٹا اُسی پانی سے بھر کر گھر بھی لاتے اور کہتے "وہ زمین سڑک کے کنارے ہے، تالاب کے کنارے ہے، بڑی پُر فضا جگہ ہے۔ محرم میں اُسی راستے سے تعزیے بھی گزرتے ہیں۔ مجھے وہ زمین بہت پسند ہے اگرچہ ابھی وہ جگہ تم لوگوں کو املی کے درختوں کی وجہ سے تاریک نظر آتی ہے لیکن درخت کٹ جانے کے بعد وہ بہت روشن ہو جائے گی۔"

وہ عبادت کی رات گزار کے لوٹتے تو اکثر انھیں کسی چیز کا ہوش نہ ہوتا۔ ایک بار وہ واپسی میں راستہ بھول کے دوسرے راستے پر چلنے لگے۔ اُسی راستے میں ایک خراب خانہ پڑتا تھا۔ وہاں کچھ رند جمع تھے اور ایک مغنّیہ انھیں گانا سنا رہی تھی۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ آغا محمد سیدھے شراب خانے میں چلے گئے۔ راہ میں ایک دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھی تھی انگیٹھی کے ارد گرد بہت سے مے خوار بیٹھے تھے۔ بے خیالی میں آغا محمد کا پاؤں انگیٹھی میں جا پڑا۔ وہ رقص کے انداز میں حرکت کرنے لگے اور مغنّیہ سے بولے "ہاں، یہی گاؤ۔ یہی گائے جاؤ۔"

مغنّیہ نے گانے کی کوشش کی مگر گانا یکلخت بند ہو گیا اور تمام شرابی زور زور سے کلمہ پڑھنے لگے۔ آغا محمد خود بھی کلمہ پڑھتے ہوئے شراب خانے سے باہر آ گئے۔ اُن کے پاؤں پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

حضرت صاحب آغا محمدؒ نے دل کی شکل جیسے لکڑی کے کئی ظروف بنوائے تھے۔ اُن میں سے چند سبز تھے اور چند بادامی۔ انھوں نے ایک بہت بڑی لالٹین بھی تیار کروائی تھی۔ لکڑی کے ظروف اور لالٹین کمرے میں رکھ کے وہ دروازہ بند کر لیتے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اُن برتنوں پر وہ کیا عمل کرتے تھے۔ اندر سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھتی رہتی تھیں۔

وہ رات کے پچھلے پہر اُٹھ بیٹھتے اور فجر کی نماز کے بعد دن چڑھے تک مصلے پر آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھے رہتے۔ اسی طرح ظہر کے بعد سے عشا تک آنکھ کھول کے کسی کو نہ دیکھتے اور نہ مصلے سے سر اُٹھاتے۔

ایک زمانے میں وہ روزانہ گملوں میں گیندے کے پودے منگواتے تھے۔ وہ گملے اپنے سامنے رکھتے لیکن جیسے ہی پودوں پر نظر ڈالتے، وہ اُسی وقت مُرجھا کر خشک ہو جاتے۔ پھر ظہر تک پودے دوبارہ ترو تازہ ہو جاتے۔ حضرت صاحب ظہر کے بعد گملے پھر سامنے رکھوا لیتے اور جیسے ہی اُن پر دوبارہ نظر ڈالتے، وہ پھر خشک ہو جاتے۔ گھر میں جہاں بھی جگہ ملتی، وہ پھول دار پودے لگاتے لیکن ہر پودا اُن کی نظر پڑنے کے صرف چند لمحوں بعد خشک ہو جاتا۔ مالی سخت پریشان تھا کیونکہ وہ اُس پر بہت خفا ہوتے تھے کہ تم ڈھونڈ ڈھونڈ کے ایسے پودے لاتے ہو جو ہرے بھرے ہی نہیں رہتے۔ بیٹا اور خدام اُن کی ناراضی کے خوف سے چھانٹ چھانٹ کر اچھے سے اچھے پودے لاتے تھے۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ اُن کی آنکھوں میں جو سرخی ہوتی تھی، وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ سفیدی یا سیاہی کا قطعی نشان نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو سورج روشن ہیں۔ دیکھنے والوں پر بلا کی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات انجان لوگ اُن کی نظروں کی تاب لا کے بے ہوش ہو جاتے تھے۔

حضرت صاحب اپنے معمولات کے سختی سے پابند تھے۔ طبیعت ناساز ہوتی اور لیٹنا بھی دشوار ہو جاتا تو بھی معمولات قضا نہ کرتے۔ معیّن اوقات پر لیٹے لیٹے تیمم کرتے اور اپنے کسی بیٹے سے کلمہ پڑھوا کر سنتے۔ اگر سنتے وقت کبھی غفلت طاری ہو جاتی تو انگلی سے بار بار پڑھنے کا اشارہ کرتے۔ ریل کے سفر میں وہ ریل کے اوقات پہلے سے معلوم کر لیتے تھے۔ جہاں جہاں اُن کے معمولات کا وقت آتا، ٹھہر جاتے اور معمولات ادا کرتے۔ پھر جب ریل کا وقت شروع ہوتا تو سفر جاری کر دیتے۔ اسی طرح خشکی کے سفر میں بھی جہاں بھی معیّن وقت آتا، قیام کرتے۔ خواہ آبادی ہو یا جنگل۔ کسی کی موت بھی اُن کے اوقات میں حارج نہیں ہو سکتی تھی۔ اُن کے کئی بیٹے کم سنی میں معمولات کے وقت انتقال کر گئے لیکن وہ مصلے سے اُٹھ کر نہیں گئے۔ وہ اپنے بیٹے منیر احمد کو شروع سے بے حد چاہتے تھے کیونکہ اُن کے چہرے پر انھیں اپنے پیر مرشد کی شباہت نظر آتی تھی۔ منیر احمد نے عین جوانی میں عصر کے بعد انتقال کیا۔ یہ حضرت صاحب کے وظیفے کا وقت تھا۔ منیر احمد نے نزع کے عالم میں باپ کا چہرہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ حضرت صاحب اُس کے پاس پہنچے اور چند ثانیوں تک بستر کے قریب کھڑے رہے۔ بیٹا لیٹے لیٹے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں۔ حضرت صاحب اپنا معمول پورا کرنے کے لیے پھر مصلے پر پہنچ گئے اور وظیفہ ختم کرنے سے پہلے نہیں اُٹھے۔ رات بھر اسی طرح نشست رہی۔ انھوں نے چند ثانیوں کے لیے بھی اُٹھنا صرف منیر احمد کی خاطر گوارا کیا تھا۔ دوسرے بیٹوں کے مرنے پر وہ مصلے سے نہیں اُٹھے۔

ایک بار وہ سب معمول رات کے پچھلے پہر جاگے اور وضو کر کے مصلے پر آ گئے۔ نماز ادا کر کے خاموش بیٹھے رہے۔ آج معمول کے مطابق انھوں نے وظائف نہیں پڑھے۔ مقررہ وقت بھی ختم ہو گیا لیکن وہ مراقبے سے نہیں چونکے۔

ایک خادم کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ قریب گیا۔ انھوں نے آہٹ سن کر خادم کی طرف دیکھا۔ نیم وا چشم، دبی ہوئی نظر، آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے۔ وہ خادم کو نہیں پہچانے۔ تھوڑی دیر بعد اُن سے کہا گیا کہ کھانا تیار ہے۔ انھیں کچھ ہوش آیا اور انھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر جیسے کوئی کچھ بھولا ہوا ہو یا اپنا راز چھپائے ہوئے ہو۔ انھوں نے بہت غور سے چاروں طرف دیکھا جیسے جگہ پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ بہت مشکل سے جوتا پہنا اور لڑکھڑاتے ہوئے چلنے لگے۔ اسی حالت میں زنان خانے آئے۔ یکا یک انھیں محسوس

ہوا کہ راز فاش ہونے والا ہے۔ وہ ناراض ہونے لگے کہ لوگوں کو میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر علاج کی کسی کو فکر نہیں۔ یہ استغراق کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد اُن کا استغراق بتدریج بڑھتا چلا گیا اور انھیں ماسوا کا کوئی ہوش نہ رہا۔ وہ نہ کسی کو پہچانتے تھے، نہ انھیں کسی کا نام یاد تھا، حتّا کہ اولاد کے نام بھی بھول گئے تھے مگر ایک بات تھی، اس غفلت کے عالم میں بھی بریلی کے مُرشد کا ذکر آجاتا تو وہ لرزہ براندام ہو جاتے۔ مرشد کے سلسلے میں اگر کوئی شخص محض کچھ سمجھنے کے لیے بھی کوئی بات ادب کے خلاف کہہ دیتا تو چیں بہ جبیں ہو جاتے۔ جواب دیتے مگر ناراضی سے۔

★

حضرت صاحب شریعت کے سخت پابند تھے۔ سنّت کی جزیات تک کا خیال رکھتے تھے۔ استغراق کے زمانے میں خدام کو خاص طور پر تاکید تھی کہ مجھے نماز کے وقت زبردستی جماعت میں کھڑا کر دیا کرو۔ ایسے موقعوں پر خدام انھیں بہت مشکل سے نماز ادا کرواتے۔ نماز کے دوران اکثر اُن پر سکتہ طاری ہو جاتا اور خدام ہزار جتن کر کے انھیں ہوشیار کرتے۔

ایک بار مُریدین نے خشک سالی کی شکایت کرتے ہوئے اُن سے کہا اگر اب بھی پانی نہ برسا تو لوگ فاقوں مر جائیں گے۔ حضرت صاحب نے بارش نہ ہونے پر افسوس ظاہر کیا اور سماع کا حکم دیا۔ قوّال موجود نہیں تھے۔ ایک شخص نے محض حکم کی تعمیل کے لیے گانا شروع کر دیا ؎

”میں مدھ سے بھئی منوار مورا گھونگٹا کون کرے“

یہ مصرع سنتے ہی آغا محمد وجد میں آ گئے۔ وہ جھومتے ہوئے بار بار کھڑے ہو جاتے اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہتے: ”اِنّی انا اللہ، اِنّی انا اللہ۔“ اچانک چاروں طرف سے کالی گھٹا گھر آئی اور ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔

ایک بار انھوں نے اپنے مرحوم بیٹے منیر احمد کا عرس کیا اور اس سلسلے میں سماع کی محفل منعقد کی۔ قوّالی کے موقع پر وہ اچانک استغراق میں چلے گئے۔ ایسے میں انھیں اپنے لڑکوں کے نام یاد رہتے تھے نہ اپنا ما فی الضمیر ادا کرنے کے لیے الفاظ ملتے تھے۔ وہ مسند سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ اچانک ایک قوّال نے غزل شروع کی۔

شورِ منصور از کجا و دارِ منصور از کجا   خود زدی بانگِ انا الحق خود برِ دار آمدی

شعر سنتے ہی حضرت صاحب سنبھل کے بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھوں میں ایسا جلال تھا کہ حاضرین نے خوف سے سانسیں روک لیں۔ قوّال کوشش کے باوجود شعر دوبارہ نہ ادا کر سکا۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ یہ حالت دیکھ کے اُن کے ایک مُرید اور ایک خادم گانے میں شریک ہو گئے۔ اس طرح مذکورہ شعر کی تکرار ہونے لگی۔ حضرت صاحب کی بے چینی بڑھتی گئی۔ کچھ اور مُرید بھی گانے میں شامل ہو گئے اور شعر کی تکرار کرتے رہے۔ حاضرین

عُمرہ
اور
زیارت
یا
ترقی یافتہ ممالک کا سفر

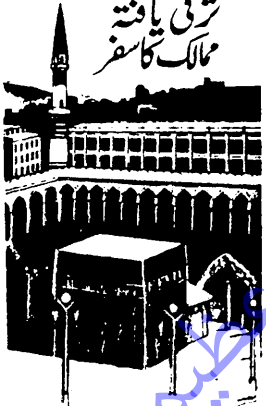

- ★ کاروباری سفر
- ★ بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم — یا ٹریننگ کے لئے
- ★ بیرونی ممالک میں ملازمت کے لئے
- ★ عزیزوں سے ملاقات یا تفریح کے لئے سفر
- ★ آپ کا مقصد یا منصوبہ کچھ بھی ہو

براہ کرم اپنے سفری کاغذات کی تکمیل اور دیگر سفری کارروائیوں کے لئے مثلاً پی فارم، ویزا وغیرہ کیلئے مزید خرچ کے بغیر ہم سے رجوع کریں۔

ٹریول ایئر لمیٹڈ

ٹریول ایجنٹ و ٹور آپریٹر۔
بمبئی ہوٹل بلڈنگ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی
ٹیلیفون نمبر: 210658 - 211658

پر سخت ہیبت طاری تھی۔ کسی شخص میں ہمت نہیں تھی کہ حضرت صاحب کی طرف نگاہ اٹھا سکے۔ دیکھتے دیکھتے لوگ اتنے سراسیمہ ہوئے کہ اُٹھ اُٹھ کے بھاگنے لگے۔ حضرت صاحب کے بیٹے اور سجادہ نشین مرزا مرتضا حسین نے قریب جاکے اُن سے کہا، "حضرت! رحم فرمایئے، فیض کی تقسیم ظرف کے مطابق کیجیے۔" وہ مسکرائے۔ "اچھی بات ہے۔ اپنا تماشا جاری رکھو۔" یہ کہہ کے وہ پھر استغراق میں کھو گئے۔

حضرت صاحب آغا محمد اکثر کہتے تھے۔ ۱۔ انصاف و حق کے خلاف ہمدردی جائز نہیں ہے۔ ۲۔ آدمی کا سب سے بڑا عیب، عیب جوئی کی عادت ہے۔ ۳۔ جب تک ارادہ نہیں، کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ۴۔ کم سخنی سب سے بڑی اہلیت ہوتی ہے۔ ۵۔ ہر دل عزیز لامذہب کو کہتے ہیں جس نے جیسا کہا، ہاں کہہ دیا۔

ان کے سجادہ نشین مرزا مرتضا حسین کہتے ہیں: "بچپن میں ایک دفعہ موضع کرتیا میں مقیم تھا۔ میں نے شہر سے حضرت صاحب کو آتے دیکھا۔ میں ایک کھیت میں تھا۔ عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا۔ انھوں نے ایک مینڈ پر چادر بچھا کے عصر کی نماز ادا کی پھر وظیفے میں مشغول ہو گئے۔ کھیت میں بہت سے سفید گھونگے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ جب تک وہ وظیفے سے فارغ ہوں، میں کچھ گھونگے جمع کر لوں۔ چنانچہ گھونگے لا لا کے میں مصلّے پر جمع کرتا رہا۔ مغرب کا وقت آیا تو حضرت صاحب نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا "کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "روپے جمع کر رہا ہوں۔" وہ ہنس کر پوچھنے لگے۔ "کیا یہ روپے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں روپے ہیں، جب بہت سے ہو جائیں گے تو بازار سے خوب گنّے خریدیں گے، بڑا مزا آئے گا۔" یہ کہہ کے میں اور گھونگے لانے کے لیے چلا گیا۔ اس بار میں دامن میں گھونگے بھر کے لایا اور میں نے ڈھیر کی طرف دیکھا تو وہ سب روپے تھے۔ میں نے دامن الٹا۔ اس میں سے بھی گھونگوں کے بجائے چھن چھن کرتے ہوئے روپے گرے۔ میں تمام روپے بیک وقت دامن میں بھر لینا چاہتا تھا۔ حضرت صاحب میری اس کیفیت سے لطف لے رہے تھے۔ مغرب کے بعد کچھ خدام وہاں آنکلے۔ حضرت صاحب نے گھوڑی منگوائی اور مجھ سے کہا کہ تم گھوڑی پر آگے بیٹھ جاؤ۔ میں دامن میں روپے بھرے ہوئے گھوڑی پر بیٹھ گیا۔ حضرت صاحب نے بازار میں گھوڑی رکوا کے بہت سے گنّے خریدے اور رقم اپنے پاس سے ادا کی۔ گھر پہنچ کے میں نے دیکھا کہ دامن میں پھر گھونگے بھرے ہوئے ہیں۔ حضرت صاحب خوب ہنسے۔ گنّے آ گئے۔ تماشا ختم، روپے ہضم۔"

حضرت صاحب کی چھوٹی لڑکی کی شادی تھی، وہ کسی سے اُدھار لینے یا نذرانے وصول کرنے کے قائل نہیں تھے۔ بڑے لڑکے نے مشکل سے برات کے کھانے کے لیے ایک من چاول کا انتظام کیا تھا لیکن برات سے ایک دن پہلے لڑکے والوں نے کہلوایا کہ ہمارے احباب و اعزا کا حلقہ بہت وسیع ہے اور ہمارے ہاں یہ پہلی شادی ہے، ہم سات سو مہمان لے کر آئیں گے۔ یہ خبر سن کے سب پریشان ہو گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انتظام کس طرح ہوگا۔ اسی دوران میں حضرت صاحب نے کسی سے پوچھ لیا کہ برات کے کھانے کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟ انھیں بتایا گیا کہ صرف ایک من چاول کا انتظام ہو سکا ہے۔ انھوں نے تاکید کی کہ دیگ تیار ہو جائے تو اس پر ایک چادر ڈال دینا اور کوئی شخص دیگ کے اندر جھانک کر نہ دیکھے۔ دوسرے روز جب نکاح ہو گیا تو وہ مجمع سے اُٹھے اور مصلّے پر جا کے بیٹھ گئے۔ دوسری طرف مہمانوں کا کھانا شروع ہوا۔ دس بجے صبح سے چار بجے سہ پہر تک برابر کھانا ہوتا رہا۔ حضرت صاحب نے پوچھا۔ "کوئی باقی تو نہیں رہا؟" معلوم ہوا کہ اب صرف گھر کے لوگ اور منتظمین رہ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ "اچھا دسترخوان بچھاؤ اور سب ساتھ بیٹھ کے کھانا کھا لو۔" دیگ سے کھانا نکلتا رہا اور سب کھاتے رہے۔

ایک عورت حضرت صاحب کے گھر کا گیہوں پیستی تھی۔ آٹا دیے ہوئے گیہوں کے وزن سے اکثر کم ہوتا تھا۔ مستورات اس بات پر اُس سے بہت ناخوش رہتی تھیں۔ ایک روز وہ آٹا لائی۔ سردی کا زمانہ تھا۔ حضرت صاحب صحن میں بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے۔ آٹا تولا گیا۔ وہ آج بھی وزن میں کم نکلا۔ حضرت صاحب کی بیوی بہت ناراض ہوئیں اور عورت سے بولیں، ہر روز تاکید کی جاتی ہے لیکن تم اپنی عادت سے باز نہیں آتیں۔ عورت نے کچھ نازیبا الفاظ اور سخت لہجے میں جواب دیا۔ حضرت صاحب نے مداخلت کی۔ "بی بی! چوری اور سینہ زوری؟ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ جو نیک کمائی سے ملے، وہی سب سے اچھا ہے۔"

عورت نے کہا۔ "آپ بھی مجھے چور سمجھتے ہیں؟ میں سچ کہتی ہوں میاں! اگر میں نے چوری کی ہو تو میری آنکھیں پھوٹیں۔"

انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "بدبخت! کاش اپنا فیصلہ تو نے اللہ پر چھوڑا ہوتا۔ وہ بڑا مہربان ہے مگر تو نے تو اپنا فیصلہ خود کر لیا۔"

ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ عورت کی آنکھوں میں درد ہوا اور دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ وہ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ میرا قصور معاف کر دیجیے۔

انھوں نے کہا۔ "تم نے اگر میرا کوئی قصور کیا ہوتا تو میں ضرور معاف کر دیتا لیکن جو فیصلہ تم نے خود اپنے متعلق کیا تھا، اُسے کوئی دوسرا کیسے بدل سکتا ہے؟"

ایک ڈاکٹر ہری بالو بنگالی بخار میں مبتلا ہوئے۔ بخار جلد ہی نمونیا میں بدل گیا۔ اُن کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے قطعی جواب دے دیا۔ آخر اس سلسلے میں حضرت صاحب سے رجوع کیا گیا۔ وہ گاجر کی فصل کا زمانہ تھا۔ حضرت صاحب نے کہا۔ گاجر کے عرق میں تھوڑی سی شکر ملا کے پلا دو۔ چنانچہ جاں بلب مریض کے منہ میں گاجر کا عرق ٹپکایا گیا۔ منٹوں میں لوگوں نے

ایسا محسوس کیا جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہ پڑا ہو۔ چند روز بعد ایک اور شخص کو نمونیا ہو گیا۔ حضرت صاحب کے ایک مرید کو ہری بابو کا واقعہ یاد تھا اس لیے اس نے گاجر کا تھوڑا سا عرق شکر ملا کے مریض کو پلا دیا۔ مریض کی حالت ایسی بگڑی کہ سانس اکھڑ گئی۔ اُس کے رشتے دار پریشان ہو گئے۔ مرید پر یہ الزام آ گیا کہ اُس نے جان بوجھ کر مریض کو مارنے کی کوشش کی ہے۔ مرید دوڑا دوڑا حضرت صاحب کے پاس پہنچا اور انھیں سارا ماجرا سنایا۔ حضرت صاحب سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ وہ شربت صرف ہری بابو کے لیے تھا نہ کہ ہر مریض کے لیے۔ بھاگ کے جاؤ، کہیں وہ مر نہ جائے۔ اب دوبارہ اُسے یہی شربت پلانا۔ مرید فوراً مریض کے گھر پہنچا۔ اُس کی زندگی کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی تھی۔ مرید نے جب اُسے گاجر کا شربت دوبارہ پلانا چاہا تو لوگ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن مرید کے سمجھانے بجھانے پر آمادہ ہو گئے کیونکہ زندگی کی اُمید تو ویسے بھی ختم ہو چکی تھی۔ شربت کے چند قطرے جیسے ہی مریض کے منہ میں گئے، اُس نے آنکھیں کھول دیں اور تھوڑی دیر بعد بالکل تندرست ہو گیا۔

جبل پور کا مشہور سیٹھ جیون داس بہت نیک اور مخیر آدمی تھا۔ دولت کی وجہ سے دُور دُور تک اُس کی رسائی تھی۔ اتفاق سے وہ ایک ایسے مقدمے میں پھنس گیا کہ اگر فیصلہ اُس کے خلاف ہوتا تو اُس کی ساری ساکھ برباد ہو جاتی۔ ہر عدالت میں اُس کے خلاف فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب آخری عدالت باقی رہ گئی تھی۔ حضرت صاحب اُن دنوں سیٹھ جیون داس کے مکان میں کرائے پر رہتے تھے۔ سیٹھ جیون داس کی طرف سے حضرت صاحب کے ایک عزیز کو یہ یقین دلایا کہ اگر حضرت نے اُس کی مدد کی اور وہ مقدمہ جیت گیا تو نقد رقم کے علاوہ ایک گاؤں اور جس مکان میں حضرت صاحب مقیم ہیں، وہ اُن کی نذر کر دیا جائے گا۔ حضرت صاحب کے عزیز نے ایک روز موقع دیکھ کے اُن سے کہا کہ دُنیا میں اچھے آدمیوں کی قدر نہیں ہے۔ سیٹھ جیون داس بہت نیک آدمی ہے مگر لوگوں نے اُسے پریشان کر کے رکھ دیا ہے، اگر اُس کی داد رسی ہو جائے تو بہت اچھا ہو گا۔ حضرت صاحب نے سیٹھ کو بلا کے ایک تعویذ دیا اور کہا کہ یہ لے جاؤ مگر یاد رکھنا کہ میں فقیر ہوں، تاجر نہیں ہوں اور کسی لالچ سے تمھاری مدد نہیں کر رہا ہوں۔ سیٹھ چند روز بعد باعزت بری کر دیا گیا۔ وہ نذرانہ لے کے دوڑا ہوا حضرت صاحب کے پاس پہنچا لیکن اس سے پہلے کہ وہ انھیں نذر پیش کرتا، حضرت صاحب نے کہا: "جیون داس! یہ کبھی نہ بھولنا کہ جو کام بنا سکتا ہے، وہ بگاڑ بھی سکتا ہے۔"

وصال سے دو ہفتے پہلے حضرت صاحب پہ استغراق طاری ہو گیا تھا۔ ایک دن چونک کے انھوں نے کہا: "میرا مہمان آ رہا ہے۔" تین بجے دن کو بمبئی میل سے اُن کے ایک مرید سیّد مظفّر یزدانی جبل پور پہنچے۔ سجّادہ نشین نے اُن سے اس طرح اچانک آنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ بمبئی کی ایک دولت مند خاتون شیریں بائی حضرت صاحب کی مریدہ ہے، وہ آج کل سخت علیل ہے اور ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں۔ استغراق کے عالم میں حضرت صاحب سے کوئی بات کہنا ہوتی تو پہلے یہ کوشش کی جاتی کہ وہ محویت کے عالم سے اس عالم کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کوشش میں خاصا وقت صرف ہوتا تھا۔ عموماً یہ طریقہ کارگر ہوتا تھا کہ اُن کے کان کے پاس بلند آواز سے کہا جاتا۔ بریلی شریف والا نامہ آیا ہے۔ تین چار بار زور زور سے یہ کہنے پر وہ متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس بار بھی یہی کیا گیا۔ وہ جب ہوش میں آئے تو شیریں بائی کی حالت بیان کی گئی اور تعویذ کے لیے کاغذ قلم اُن کے سامنے کر دیا گیا۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا۔ "دربارِ آغا محمّد شیریں بائی مراد بر آئی۔" بمبئی میں اچانک شیریں بائی کو صحّت ہو گئی۔

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، اُن کا استغراق بڑھ رہا تھا۔ وہ نہ کسی کو پہچانتے تھے، نہ انھیں ماسوا کا ہوش تھا۔ صرف دودھ اور پھلوں کے رس پر گزر تھی۔ بعد میں انھوں نے ان چیزوں کے لیے بھی منع کر دیا اور کہا کہ یہ چیزیں پینے سے تکلیف ہوتی ہے۔ وصال سے دو ہفتے پہلے انھوں نے اپنے بیٹے اور سجّادہ نشین شاہ نذیر احمد کو ایک زمین دکھائی اور کہا کہ فقیر یہاں رہے گا۔ سخت مشکلات کے بعد وہ زمین مزار کے لیے خرید لی گئی۔ انھوں نے ایک مہینے قبل ہی خاص خاص مریدوں کو اپنے وصال کا صحیح دن اور وقت بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ اُس وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہوگی۔

۱۳ ذیقعد ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۱۸ء کو جمعے کی شب حسبِ معمول خدّام حاضر تھے۔ بارہ بجے کے قریب حضرت صاحب کو بہت سکون تھا۔ سجّادہ نشین مطمئن ہو کے گھر کے اندر چلے گئے۔ حاضر باش خدّام بھی اُن کے سکون کے خیال سے اپنی اپنی جگہ لیٹ گئے۔ صرف اُن کے بھانجے یہ سوچ کے جاگتے رہے کہ کسی ایک آدمی کا ہوشیار رہنا ضروری ہے مگر چار بجے کے قریب اُن کی بھی آنکھ لگ گئی۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ فٹ بال جیسی ایک بہت بڑی گیند سامنے صحن میں ٹپّے کھا رہی ہے اور ہر ٹپّے میں اُونچی ہوتی جا رہی ہے۔ خاصی دیر تک گیند اسی طرح ٹپّے کھاتی رہی اور آہستہ آہستہ اونچی ہوتی رہی۔ حتّیٰ کہ اُس نے ایک زور کا ٹپّا کھایا اور سیدھی آسمان کی طرف چلی گئی۔ آسمان پر جا کے وہ گیند آتش بازی کی طرح پھٹی اور اُس میں سے سینکڑوں روشن ستارے نکل کے آسمان پر پھیل گئے۔ اسی وقت اندر حجرے میں حضرت صاحب نے نہایت بلند آواز سے الّا اللہ کا نعرہ لگایا اور اُن کا وصال ہو گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔

سچے رنگ کے
بے سلسلوں
کے تسلسل
کو آیات کے ساتھ
نیا سلسلہ

ایک آدمی کی عبرت ناک سرگزشت

آپ بیتی جگ بیتی
ہمایوں زمان خان

اُس روز ہوڑا ایکسپریس خاصی لیٹ تھی۔ اتفاق سے گیا شہر کے ایک اوسط درجے کے زمیں دار کا سولہ سترہ سالہ لڑکا بابر زماں صبح کی سیر کے لیے اسٹیشن کی طرف نکل گیا اور ہوڑا ایکسپریس آنے اور مسافروں کے چڑھنے اُترنے کا منظر دیکھنے کے لیے پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ اُن دنوں گیا میں گوتم بدھ کی ولادت کا سالانہ جشن دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ گیا وہ شہر ہے جہاں گوتم نے نروان حاصل کیا تھا۔ شہر سے سات میل دور ایک چھوٹی سی بستی بدھ گیا کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں دُنیا بھر کے بدھ یاتری اور راہب ہر سال گوتم سے عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ بدھ گیا میں ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو جاتا ہے۔ گیا کے کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ کی رضاکار جماعتیں یاتریوں اور راہبوں کی رہبری کے لیے سرگرم ہو جاتی ہیں۔ بابر زماں خاں کسی رضاکار تنظیم میں شامل نہیں تھا۔ وہ علیحدہ سا لڑکا تھا۔ اپنے مزاج اور عادت واطوار کے اعتبار سے قطعی مختلف۔ گھر میں بھی اُس کے تعلقات سب سے سیدھے سادے تھے لیکن وہ بڑے عزم اور حوصلے کا لڑکا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم رہتا تھا۔ کتابیں پڑھتا تھا اور انھیں یاد بھی رکھتا تھا۔ وہ فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ اسٹیشن پر اُس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا بدھ راہب اپنی ۱۲، ۱۳ سالہ لڑکی اور مختصر سامان کے ساتھ قلی کے انتظار میں کھڑا ہے۔ اُس لڑکی میں ایسی کشش تھی۔ وہ اتنی حسین اور دلکش تھی کہ بابر زماں خاں دوڑ کے اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُن کا سامان اُٹھانے لگا۔ بدھ راہب نے اُسے دُعائیں دیں۔ بابر نے اُن کے لیے فوراً ایک تانگے کا انتظام کیا اور انھیں بدھ گیا تک پہنچانے کے لیے خود بھی تانگے میں بیٹھ گیا۔ راستے بھر اُس کی نظریں اُس گڑیا جیسی لڑکی پر جمی رہیں اور اُس کا دل دھڑکتا رہا۔ بدھ راہب انجین بابر کی خوش خلقی اور شائستگی سے بہت متاثر ہوا، وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھتے رہے۔ بدھ گیا میں دوسرے یاتریوں کی طرح انھیں بھی ایک خیمہ دے دیا گیا۔ بوڑھا شخص بابر زماں سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ وہ اُسے اپنے خیمے میں لے گیا اور اُسے ایک مالا تحفے میں دے دی۔ بابر نے اُسے واپس کرنا چاہا مگر بوڑھے نے انکار کر دیا۔ پھر جب بابر نے گھر پہنچ کے مالا اپنے ابا اور امی کو دکھائی تو وہ حیرت میں رہ گئے۔ وہ سچے موتیوں کی انتہائی قیمتی مالا تھی۔ بابر کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ دوسرے دن وہ پھر بدھ گیا پہنچ گیا اور بوڑھے سے باتیں کرنے کے علاوہ اُس کی لڑکی کورا کا اُبھرتا ہوا حُسن و شباب دیکھتا رہا۔ اُس نے بوڑھے کو اپنے گھر آنے کے لیے مجبور کیا۔ درمیان درمیان میں اُس نے کورا سے بھی دو چار باتیں کیں۔ انجین دوسرے بدھ راہبوں کے برعکس اپنا تمام تر وقت خیمے میں گزارتا تھا۔ بہت کم باہر نکلتا تھا۔ بابر دو تین دن تک مسلسل اُس کے پاس جاتا رہا۔ چند دن تو جیسے تیسے گزر گئے مگر راتیں بڑی بے قراری سے گزریں۔ اُسے کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ صرف ایک صورت نظر میں سمائی تھی۔ ایک نقش دل میں بیٹھ گیا تھا۔ کورا کی صورت۔ کورا کا نقش۔ ایک دن اُس نے جرأت کی۔ وہ خیمے سے کچھ دور انتظار کرتا رہا کہ جیسے ہی بدھ راہب انجین باہر نکلے، وہ کورا سے اپنا حال بیان کرنے کے لیے خیمے میں داخل ہو جائے۔ آخر بہت انتظار کے بعد اُسے یہ موقع ملا مگر وہ کورا سے کچھ کہہ نہ سکا۔ اُس نے صرف اُتنی درخواست کی کہ وہ اُس کی آمد کا ذکر اپنے بابا سے نہ کرے۔ پھر جلد ہی وہ شام آ گئی جب بوڑھے انجین نے اُس کے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ بابر زماں نے بڑی مشکل سے اپنے گھر والوں کو ان اجنبی لوگوں کی دعوت کرنے پر راضی کیا تھا۔ انجین کی پذیرائی شان دار طریقے سے ہوئی۔ کورا کو بابر کی بہنوں نے گھیر لیا۔ انجین نے اپنی شستہ گفتگو سے بابر کے والد کو خاصا متاثر کر لیا۔ اُدھر کورا زنان خانے میں سب کی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ انجین نے بابر کی ماں کے لیے ایک اور قیمتی زیور تحفتہً پیش کیا۔ پھر تحفوں کا باقاعدہ تبادلہ عمل میں آیا۔ بہت خوش گوار ماحول میں بوڑھا انجین اُن سے رخصت ہوا۔ اب بابر کی دوستی پکی ہو گئی تھی۔ وہ اُن کے خیمے میں اعتماد سے جا سکتا تھا اور کورا سے باتیں بھی کر سکتا تھا۔ لیکن انجین ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اُس کے سامنے کاغذات کھلے ہوتے تھے اور وہ بڑے انہماک سے اُن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ ایک دن حُسنِ اتفاق سے وہ خیمے میں نہیں تھا۔ بابر کو موقع مل گیا۔ باتوں باتوں میں کورا نے اُسے بتایا کہ انجین اُس کا باپ نہیں ہے اور اُس کا تعلق تبت کے ایک قبیلے جانگ سے ہے۔ اُس نے اُس دن بابر سے بہت قریب کی باتیں کیں۔ بابر حیرت سے انھیں سنتا رہا۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بوڑھا انجین وحشت زدہ حالت میں پہنچا۔ وہ آتے ہی پوچھنے لگا کہ کوئی آیا تو نہیں تھا؟ کورا نے انکار کیا۔ بوڑھے کے اوسان ٹھیک ہو گئے۔ دوسرے دن کورا نے بابر کو بتایا کہ آیندہ ایک دو دن میں وہ جانے والے ہیں۔ یہ خبر بابر کے لیے ایک دھماکے سے کم نہ تھی۔ وہ گھر والوں کی جھڑکیاں نظر انداز کر کے یہاں آتا تھا۔ وہ رات بھر کورا کے خیال میں جاگتا اور دن بھر مضطرب رہتا تھا مگر ایک نہ ایک دن اُن اجنبیوں کو جانا ہی تھا۔ بابر نے اصرار کر کے بوڑھے کو ایک دن کے لیے مزید روک لیا۔

اُس رات جب وہ اپنے گھر میں کورا کی یاد سے بے چین تھا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اِس وقت کون ہو سکتا ہے؟ یہ سوچ کے وہ تیزی سے دروازے پر پہنچا۔ گھر والے بھی جاگ گئے تھے۔ دروازے پر کورا بڑی ابتر حالت میں کھڑی تھی۔ اُس کی بغل میں ایک گٹھری موجود تھی اور اُس کے چہرے پر پژمردگی ہوتی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ بابر کے والد نے اُسے جلدی سے گھر کے اندر کھینچ کے اُس سے ماجرا پوچھا کہ وہ اتنی رات گئے تنہا کیسے آئی ہے؟ انجین کہاں ہیں؟ کورا نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ بابا انجین قتل کر دیے گئے اور وہ اپنی جان بچا کے اور گٹھری لے کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ والد نے تفصیل پوچھی تو وہ کچھ تسلی بخش جواب نہیں دے سکی کیونکہ اُس کی حالت بہت شکستہ تھی۔ وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ والد نے گٹھری کھول کے دیکھی۔ اُس میں نہایت قیمتی جواہر موجود تھے نیز کچھ کاغذات بھی تھے۔ کورا کو اُس وقت تو پناہ دے دی گئی لیکن پھر بابر کے والدین کا رویہ بدل گیا۔ وہ بار بار اُس سے اصرار کرنے لگے کہ اِس لڑکی سے کہو کہ اِس گھر سے چلی جائے یا ہمیں پولیس کو مطلع کر دینا چاہیے یا کورا کو بدھ گیا کے کسی منتظم کے حوالے کر دینا چاہیے ورنہ اِس کی وجہ سے ہم لوگ بھی کسی بڑی مصیبت میں گھِر جائیں گے۔ ایک دن، دو دن۔ آخر تیسرے دن والدین کا رویہ بہت سخت ہو گیا۔ کورا کو اوپر کے کمرے میں نظر بند کر دیا گیا تھا تاکہ اُس پر ہمسایوں کی نظر نہ پڑ جائے۔ یہ صورتِ حال بابر کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ ابا نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ وہ کورا کو گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ نتیجتاً بابر کو کورا سے تنہائی میں بات کرنی پڑی اور کورا کے متعلق اُس پر بہت سے حقائق کا انکشاف ہوا۔ کورا تبت کے ایک مرحوم سردار کی اکلوتی لڑکی تھی اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد قبیلے کی سرداری کی جائز حق دار تھی، بشرطیکہ اُس کی شادی ہو جاتی۔ اُس کے چچا نے سرداری پر غاصبانہ قبضہ کر کے اُسے قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اُس کا اتالیق بوڑھا انجین اُسے لے کے ہندوستان چلا آیا۔ یہاں وہ شہروں شہروں گھومتے رہے اور لوگ اُن کا تعاقب کرتے رہے۔ کورا کی رُوداد سُن کے بابر نے اُس سے کہا کہ وہ رات کو تیار رہے۔ دن بھر بابر نے چپکے چپکے ایک سوٹ کیس میں سامان جمع کیا اور آدھی رات کے وقت کورا کو ساتھ لے کے گھر سے نکل گیا۔

اُمنگوں — حوصلوں — آنسوؤں — اور — آہوں — کی — داستان

ف۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں بھاگتے رہے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے ایک تانگے والے کو آمادہ کیا اور وقت سے پہلے اسٹیشن جا پہنچے۔ کورا برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ بابر کو خوف تھا کہ اسٹیشن پر اُس کا کوئی شناسا نہ مل جائے۔ اتنی رات گئے سولہ سترہ سال کے ایک لڑکے کے ساتھ برقع پوش عورت کا ہونا خاصی چونکا دینے والی بات تھی۔ وہ دونوں دہشت سے لرز رہے تھے۔ کورا نے اصرار کیا کہ وہ اب بھی گھر واپس جا سکتے ہیں لیکن بابر نے جو ایک فیصلہ کر لیا تھا اُس پر جما رہا۔ وہ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر ایک نیم تاریک بینچ پر بیٹھ گئے۔ جو لوگ وہاں سے گزرے انھوں نے غور سے اُن دونوں کو دیکھا۔ برقع سے کورا کے چمکیلے ہاتھ صاف نظر آ رہے تھے اور کوئی بھی اہلِ نظر یہ دعوا کر سکتا تھا کہ برقع کے اندر ایک حسین و جمیل لڑکی موجود ہے۔ بابر زماں خاں کے پاس ایک چاقو اور چند سو روپے نقدی تھی۔ جس وقت گاڑی اسٹیشن پر آئی جیسے طوفان آگیا۔ بابر نے تحمل کیا اور وہ ایک زنانہ ڈبا تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں اُسے اُس کا ایک ہم جماعت ٹکرا گیا لیکن بابر بہانہ بنا کے آگے بڑھ گیا۔ کورا کو زنانے ڈبے میں بٹھانے سے پہلے اُس نے احتیاطاً یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ کسی عورت سے بات نہ کرے بلکہ گونگی بنی رہے۔ کورا کی ہندوستانی صاف نہیں تھی۔ ڈر تھا کہ اُس کے لب و لہجے سے کوئی مشکوک نہ ہو جائے۔ اُسے خود برابر کے مردانہ ڈبے میں بڑی مشکل سے کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک مولوی صاحب سے ہوئی جو پہلے تو بڑی درشتی سے پیش آئے لیکن بعد میں شاید بابر کے مسلمان ہونے اور شائستگی سے گفتگو کرنے پر اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوگئے۔ بابر کی کوئی منزل نہیں تھی۔ اُس نے کلکتے کا نام سُنا تھا۔ اس وقت یہ گاڑی چونکہ کلکتے جا رہی تھی اس لیے اُس نے کلکتے کا ارادہ کر لیا۔ راستے میں بابر مختلف اسٹیشنوں پر اُتر اُتر کے کورا کا احوال پوچھتا رہا۔ وہ خوف زدہ اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ ہاوڑا اسٹیشن پر مولوی صاحب ازراہِ ہمدردی اُن کے پاس ٹھہر گئے۔ بابر نے بتایا تھا کہ کلکتے میں اُن کے ماموں رہتے ہیں جنھیں تار کے ذریعے پہلے سے اطلاع دے دی گئی ہے لیکن وہاں کوئی ماموں ہوتے تو انھیں اسٹیشن پر لینے کے لیے آتے۔ ماموں نہیں آئے اور مولوی صاحب بھی نہیں ٹلے۔ مجبوراً بابر کو مولوی صاحب کے ساتھ اُن کی قیام گاہ پر جانا پڑا جو ایک مسجد سے ملحق مدرسے کی عمارت میں واقع تھی۔ اس شہر سے انھیں ڈر لگا کیونکہ یہاں تو ہر شخص بھاگ رہا تھا اور کوئی کسی کا پُرسانِ حال معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اِدھر انھیں مولوی صاحب کا ڈر تھا کہ اُن سے جھوٹ کب تک نبھایا جائے گا۔ مولوی صاحب بابر کو لے کے ماموں جان کی تلاش میں نکل پڑے اور ظاہر ہے ناکام واپس آگئے۔ رات کو جب مولوی صاحب سو گئے تو اُسے کورا سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملا اور وہ دونوں خوب روئے۔ ایک رات تو جیسے تیسے گزر گئی۔ صبح ہوتے ہی بابر نے مولوی صاحب کو اپنے گھر کا غلط پتہ دے کر تار دینے روانہ کیا اور اُن کے نام ایک رسمی خط لکھ کے وہاں سے فرار ہوگیا۔ وہ رکشے میں بازار بازار گھومتے رہے اور ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ بابر نے رجسٹر میں اپنا نام انور علی درج کرایا۔ ٹھیرنے کو تو وہ یہاں ٹھیر گئے لیکن اُن کا دل اس اجنبی ماحول میں دھڑکتا رہا۔ مشکل یہ تھی کہ بابر کورا کو چھوڑ کے کہیں ملازمت کی تلاش میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کہاں ملازمت ملے گی؟ کہاں گھر؟ کس طرح یہ باور کرایا جائے کہ برقع میں لپٹی ہوئی یہ لڑکی اُس کی بہن ہے؟ اس بڑے شہر میں کوئی جاننے والا نہیں۔ گلیاں، عمارتیں، ماحول، سب کا سب نیا اور ہیبت ناک۔ انھیں اندازہ ہوا کہ زندگی کا سفر اتنا آسان نہیں جتنا انھوں نے سمجھا تھا۔ کلکتے میں اُن کے ہر خواب کی تعبیر مختلف نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص کی نگاہ کورا پر ہے اور وہ اُس کا برقع چیرنے پھاڑنے کے لیے مضطرب ہے۔ اس ہوٹل کا بیرا یہ سمجھا کہ لکھنؤ کا کوئی نواب زادہ کلکتے میں عیش و عشرت کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ اُس نے بابر سے بے حجاب باتیں کیں اور اُسے شراب تک پیش کی۔ بابر نے یہ ہوٹل بھی چھوڑ دیا۔ اِدھر اُن کے ساتھ ایک اور حادثہ پیش آگیا تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور اُن کا نیا پن تاڑ کے کسی ویران علاقے میں لے گیا۔ بابر نے اُسے یوں ہی بڑے بازار کا نام بتا دیا تھا۔ ایک سُنسان جگہ ٹیکسی روک کے ڈرائیور نے کورا پہ دست درازی کی۔ نتیجتاً بابر کو اُسے اپنا چاقو دکھانا پڑا۔ بابر کا خطرناک ارادہ دیکھ کے ڈرائیور کے ہوش گم ہوگئے اور وہ معافی مانگتا ہوا انھیں واپس شہر میں لے آیا۔ دوسرا ہوٹل پہلے سے مختلف نہیں تھا۔ دونوں بُری طرح گھبرا گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ کس سے فریاد کریں۔ دوسرے دن صبح کی بات ہے، وہ دونوں ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے آ رہے تھے کہ ایک شخص نے کورا کو ٹکر ماری۔ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی دور تک چلی گئی۔ چوٹ تو اُس کے آئی ہی تھی، وہ بے نقاب بھی ہوگئی اور پہلی بار ہوٹل کے لوگوں نے دیکھا کہ وہ حسن و جمال کے کس درجے پر فائز ہے۔ انھوں نے اُس چیختی ہوئی کلی کو دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ اُس کا نتیجہ جو نکلا وہ بڑا بھیانک تھا۔ ایک شخص کریم گل بابر پر بے تحاشا مہربان ہوگیا۔ اُس نے کچھ ایسے خلوص اور تپاک کا اظہار کیا کہ بابر کو کچھ کہتے نہ بنی۔ کریم گل نے اُسے اپنی خالہ سے ملوایا۔ خالہ ایک طرح دار اور خوش اخلاق عورت تھی۔ وہ بابر اور کورا پر ایسی وارفتہ و فریفتہ ہوئیں کہ بس۔ کورا کی بلائیں لیتے اُن کے ہاتھ نہ تھکتے تھے۔ وہ انھیں کلکتے کے متعدد مقامات کی سیر کرانے لے گئیں۔ دو دن تک ایسا بابا جاگا میلا ٹھیلا رہا کہ انھیں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ ایک رات وہ سینما لے گئیں اور یہاں بابر کا ماتھا ٹھنکا۔ یہاں خالہ نے اُن دونوں کا تعارف ایک اور جوڑے سے کرایا جس نے کورا پر بڑی ہوس ناک نگاہیں ڈالیں۔ اُن کے درمیان چند معنی خیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ بابر وہاں سے کورا کو لے کے بھاگنا چاہتا تھا مگر بھاگ نہ سکا۔ صاف ظاہر تھا کہ کورا کے بارے میں اُن کی نیت بُری تھی، وہ اُسے بابر سے چھین لینا چاہتے تھے۔ ہوٹل واپس آ گئے جب خالہ اور کریم گل جدا ہوئے، بابر نے سب سے پہلا کام وہاں سے فرار ہونے کا کیا۔ انھوں نے کچھ دیر بعد ہوٹل چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے انھیں جلد ہی ایک ٹیکسی مل گئی لیکن ابھی وہ کچھ ہی دور نکلے ہوں گے کہ انھیں محسوس ہوا کہ کوئی گاڑی اُن کا تعاقب کر رہی ہے۔ دونوں گاڑیوں میں آگے پیچھے تیز رفتاری کا مقابلہ ہوتا رہا۔ ایک موڑ پر چند لمحوں کے لیے وہ پیچھے والی گاڑی سے اوجھل ہوگئے، بابر اور کورا ٹیکسی سے اُتر کے ایک تنگ گلی کے اندھیرے میں تحلیل ہوگئے۔ کچھ دیر بعد وہ مولوی صاحب کے حجرے پر کھڑے تھے۔ انھوں نے چند باتیں حذف کر کے اپنی تمام روداد مولوی صاحب کو سُنا دی اور فیصلہ اُن پر چھوڑ دیا۔ کورا نے مولوی صاحب سے پردہ بھی نہیں کیا۔ مولوی صاحب نے اُن دونوں کو گلے سے لگا لیا۔ بابر کا اصرار تھا کہ وہ جلد از جلد کلکتہ چھوڑ کے اپنے شہر مراد آباد چلیں لیکن مولوی صاحب نے مزید تین دن ٹھیرنے اور تفریح کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ انھوں نے اُن دونوں کے نئے نئے کپڑے بنوائے، کچھ سامان خریدا اور ایک رات دریا کا منظر دکھانے لے گئے۔ ابھی انھیں دریا پر آئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ چار بدمعاشوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ کورا اِدھر بھاگی، مولوی صاحب اُدھر بھاگے۔ ایک بدمعاش نے بابر کو پکڑ لیا۔ بابر نے اپنے چاقو سے وہیں اُس کا کام تمام کر دیا اور کورا کی طرف لپکا۔ دوسرا بدمعاش اُس کی راہ میں مزاحم ہوا تو اُس نے اُسے بھی ختم کر دیا۔ باقی دو بدمعاش کورا کو پکڑے ہوئے دور چلے گئے۔ مولوی صاحب اُن کے پیچھے بھاگتے رہے۔ بابر کو دیر ہوگئی۔ وہ بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے ٹانگ مار کے اُسے بے توازن کر دیا اور ہر طرف سیٹیاں بجنے لگیں۔

اُن میں ایک اور کانسٹیبل کا اضافہ ہوگیا۔

پہلے کے تین کانسٹیبل میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کے مجھے قابو میں کرنے کی فکر میں تھے۔ آنے والے کانسٹیبل نے آتے ہی میرے شانے پر اپنے وزنی بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ میں یہ ٹھوکر برداشت نہ کر پاتا لیکن اُدھر بہت دُور سے کہیں کورا کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پھر اُن کے حصار سے نکلنے کے لیے پر تولے۔ کانسٹیبل نے دوسری ٹھوکر کے لیے پیر اُٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے بے دم کر دیتا، میں نے اُس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ بے توازن ہو کے زمین پر گر پڑا، دوسرا کانسٹیبل چیختا ہوا میری طرف جھپٹا تو میرا چاقو اُس کے پیٹ میں کمر تک اُتر گیا۔ پھر مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں چاقو نکالنے کی کوشش میں تھا کہ اُنھوں نے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ میری فریاد اور چیخ پکار پر اُن کی گرفت اور سخت ہوگئی اور کسی نے پیچھے سے میری کمر میں اس زور کا گھٹنا مارا کہ میں بلبلاتا ہوا زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میں کچھ دیر زمین پر تڑپا لیکن پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

آنکھ کھلی تو میں ننگی اور کھردری زمین پر پڑا ہوا تھا۔ سارے جسم میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ کروٹ بھی نہیں بدلی جاتی تھی۔ سر کے بال کیچڑ اور خون میں سَنے ہوئے تھے۔ شیروانی پر سفیدی برائے نام رہ گئی تھی۔ ہر طرف خون کے دھبے تھے، ہاتھوں پر، چہرے پر، پیروں پر، خون ہی خون جما ہوا تھا۔ کمرے میں ایک مدھم سی روشنی کا بلب ٹمٹما رہا تھا اور آہنی سلاخوں کے پیچھے دو مسلح سنتری پہرا دے رہے تھے۔ میری آہٹ پر انھوں نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی پاگل کتا ہوں۔ اُن کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت تھی۔ "جاگ گیا، جاگ گیا، حرامی بچہ۔" انھوں نے صدا لگائی۔

اُن کے صدا لگانے کی دیر تھی کہ سلاخوں پر بہت سے سپاہیوں کا اجتماع ہوگیا، وہ سب حیرت اور غصے سے مجھے گھور رہے تھے۔ کسی کی نظر میں ہمدردی نہیں تھی۔ طرح طرح کی گالیاں دی جا رہی تھیں۔ میری ماں اور بہن کے متعلق شرم ناک تبصرے ہو رہے تھے۔ "سالا شکل سے کیسا معصوم نظر آتا ہے۔"

"ایک دم دس نمبری ہے۔ ابھی اس کی عمر تو دیکھو۔"

"چڑھ جا بیٹا سُولی پر رام بھلی کریں گے۔"

یہ سب آوازیں میرے کانوں میں چبھ رہی تھیں۔ میرا رُواں رُواں لرزنے لگا۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ یہ تو ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ ابھی آنکھ کھُل جائے گی اور میں اپنی دنیا میں واپس آجاؤں گا۔ میں نے دہشت سے زمین پر ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حالات کی سخت اور کھُردری زمین سے میری جلد چھل گئی۔ اُن کی ہنسی نکل گئی۔ "سالا بالکل جنگلی ہے۔"

میں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ پھر اچانک اُن کی زبانوں پر فالج گر گیا۔ ایک بھاری بھرکم آواز نے ڈپٹ کر انھیں سلاخوں سے دُور ہونے کا حکم دیا۔ میں نے درماندگی سے سر اُٹھا کے دیکھا۔ پولیس کی وردی میں ملبوس لمبے قد کا ایک شخص مجھے زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی انسپکٹر ہوگا۔ "اسے باہر لاؤ۔" اُس نے درشتی سے سنتری کو حکم دیا۔

سنتری دروازہ کھول کے دروازے ہی پر کھڑا رہا۔ "چل بے صاحب بُلا رہے ہیں۔" اُس نے مجھے نفرت سے مخاطب کیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مجھ میں کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ "اُٹھتا ہے یا نہیں، یا دماغ ٹھکانے لگا دوں؟" میں نے کسمسا کے اُٹھنا چاہا مگر اُٹھ نہ سکا۔ "سالا بن رہا ہے۔"

"تم اسے اُٹھا کے سیدھے میرے پاس لاؤ۔" انسپکٹر نے شاید میری مخدوش حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ "خبردار اسے کوئی ضرب نہ پہنچانا۔ بہت احتیاط سے دفتر میں پہنچاؤ۔"

سنتریوں کو نرمی اور احتیاط کا مشورہ دیا گیا تھا مگر انھوں نے مجھے کسی جانور کی طرح گھسیٹا۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں اُٹھا تو میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے دروازے کے پاس لائے۔ اِس وقت میرے ذہن میں اپنی ٹیسوں اور کراہوں کے احساس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں دو قدم چلا ہوں گا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میری آمد پر کوٹھری سے باہر بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں انتشار سا پیدا ہوا۔ مجھے ایک مختصر تنگ راستے سے گزار کے انسپکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہلے ہی دو کالے پولیس افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ "اِسے پانی پلایا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ابھی نہیں جناب! یہ ابھی تو جاگا ہے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"کیا یہ بیان دینے کے قابل ہے؟" دوسرے پولیس افسر نے پوچھا۔

"دیکھ لیتے ہیں۔"

میں نے پوری طرح بیدار ہونے اور منتشر اعصاب یک جا کرنے کی کوشش کی۔ بیان؟ کس بات کا بیان؟ میں نے دو آدمیوں اور ایک کانشیبل کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی بیان کی ضرورت ہے؟ یہ مجھ سے میرا نام، خاندان، پتہ اور پوری کہانی پوچھیں گے۔ میں انھیں کیا بتاؤں؟ کیا سارا واقعہ سچ سچ بتا دوں؟ انسپکٹر نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا تھا۔ اب مجھ سے سوالات کیے جائیں گے۔ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ پتہ نہیں، رات کیا ہوا؟ مولوی صاحب کا کیا حشر ہوا؟ کورا کہاں گئی؟ میں انھیں کس طرح کا بیان دوں؟ "تمھارا نام؟" انسپکٹر نے کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

میں خاموش رہا۔ ایک سپاہی نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔ "صاحب نام پوچھتے ہیں۔ سیدھے کھڑے ہو۔"

میں نے ویران نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ "میرا نام... میرا نام ظہیر خاں ہے۔" میری لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

"ظہیر خاں۔" اُس نے دُہرایا۔ "باپ کا نام؟"

"حسن خاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"پتہ؟"

"میرا کوئی پتہ نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تمھارا گھر کہاں ہے؟" کانشیبل نے مجھے ٹھوکا مار کے پوچھا۔

"گھر؟" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میرا کوئی گھر بھی نہیں ہے۔"

"تم کلکتے کب آئے؟" انسپکٹر کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے پولیس افسر نے دل چسپی سے پوچھا۔ "دیکھو میاں صاحب! تم نے رات تین قتل کیے ہیں۔ سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ تمھارا یہ پہلا بیان بہت اہم ہوگا۔ گھبراؤ نہیں، کھل کر بات کرو۔ تم کلکتے کب آئے؟"

"بہت دن ہو گئے۔" میں نے بے خیالی کے انداز میں کہا۔

"یہاں کہاں رہتے تھے؟" انسپکٹر کو میرے جوابات پر غصہ آنے لگا تھا۔ "کہیں نہیں، یہیں اِدھر اُدھر۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"صاحب اس طرح یہ نہیں بولے گا۔ اگر حکم ہو تو اس کی زبان کھولنے کا انتظام کروں؟" کانشیبل نے میرے بازو پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

"تم چُپ رہو۔" انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاں ظہیر خاں! کلکتے سے پہلے تم کس شہر میں تھے؟"

"میں کسی ایک شہر میں نہیں رہتا، گھومتا رہتا ہوں۔" میں پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پوچھتے ہیں یا نہیں؟

"ماں باپ زندہ ہیں؟"

"مر گئے۔" میں نے کرب سے کہا۔

"کوئی عزیز رشتے دار؟"

"سب مر گئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"ہونہہ۔" انسپکٹر نے اپنے ساتھی پولیس افسروں کی جانب دیکھتے ہوئے منہ بنایا۔ "شاید کانشیبل کے مشورے پر عمل کرنا پڑے گا۔"

"نہیں۔" افسر نے سختی سے منع کر دیا۔ "اس کی حالت پہلے ہی خراب

ہے۔" اُس نے انگریزی میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں زیادہ الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک صاف مقدمہ ہے۔ مطلب کی بات پوچھو۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کچھ پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟"

میں جواب دینے میں جھجکا۔ "نہ جاننے کے برابر۔"

"یہ چاقو کس کا ہے؟" اُس نے میرا چاقو لہرا کے کہا۔

"میرا ہے۔" میں نے نقاہت سے جواب دیا۔

"اور یہ موتیوں کی مالا؟" اس نے میری آنکھوں کے سامنے مالا گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی میری ہے۔"

"چرائی ہے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"جی نہیں، یہ میری ماں کی نشانی ہے۔"

"ماں کہاں ہے؟"

"ماں بھی مر گئی۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"کب؟ کہاں؟"

"لکھنؤ میں۔" میرے ذہن میں یہی نام آیا۔

"تو گویا تم لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہو؟"

"جی نہیں، میری ماں کو مرے ہوئے بہت برس ہو گئے ہیں۔ اُس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ وہ لکھنؤ شہر میں مری تھیں۔ ہم دونوں ریل میں سفر کر رہے تھے۔ کوئی چور سامان میں یہ مالا دیکھ کے ہمارے پیچھے پڑ گیا، چنانچہ ماں نے احتیاطاً اسے میرے گلے میں بنیان کے نیچے چھپا دیا۔ اس کے بعد میں ریل میں سوتا رہا۔ اور اُٹھا تو ماں نہیں تھی اور وہ چور بھی نہیں تھا۔ میں نے ماں کو بہت تلاش کیا۔ اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔"

"ماں کو چور لے گیا؟" انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔

"انسپکٹر صاحب!" میں اپنی پوری توانائی سے چیخ پڑا۔ "تمھاری بھی کوئی ماں ہوگی۔ مجھے جتنا بُرا کہو، میری ماں کے بارے میں ایک لفظ نہ کہنا ورنہ میں تمھارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ کسی مجبور کی مجبوری کا مذاق مت اُڑاؤ۔ میں تمھارے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوں لیکن میری بھی ایک ماں تھی۔"

"کیس دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ خاصا تیز لڑکا ہے۔ اچھی داستان سناتا ہے۔" پولیس افسر نے انگریزی میں تبصرہ کیا۔ "پھر تم یہ مالا لیے شہروں شہروں گھومتے رہے؟" میں نے جواب نہیں دیا، گردن جھکالی۔

"اچھا ظہیر خاں!" انسپکٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "رات کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"کچھ نہیں، بس میری قسمت خراب تھی۔"

"وہ تو ہے لیکن ہمیں اس کاغذ پر کچھ لکھنا ہے اور عدالت میں پیش کرنا ہے تم چاہو تو سوچ سکتے ہو۔" اب تک اُنھوں نے مولوی صاحب اور کورا کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے ضرور سوال کرتے۔ میں نے چند لمحوں میں ہزاروں باتیں سوچیں۔ کاش مجھے جواب دینے سے پہلے یہ معلوم ہو جاتا کہ اُن دونوں پر کیا گزری؟ میں دو آدمیوں کے قتل سے انکار کر سکتا تھا۔ انکار کرنے میں کیا حرج ہوتا لیکن کانسٹیبل کے قتل کے تین چشم دید گواہ موجود تھے اور مقتول کانسٹیبل کے پیٹ سے جو چاقو برآمد ہوا تھا، اُس سے صاف ظاہر تھا کہ ریت پہ آگے پیچھے جو دو لاشیں پڑی ہوئی ملی تھیں، وہ بھی اسی سے شکار کی گئی ہوں گی۔ وہ وجہ جاننا چاہتے تھے۔ میں انھیں کیا وجہ بتاتا۔ مجھے خاموش دیکھ کے انسپکٹر نے غضب ناک آواز میں کہا۔ "ہمارے سوال کا جواب دو۔"

"میں؟" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ دو آدمیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اُن پر جوابی حملہ کر دیا۔"

"کیا تم انھیں پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں۔ میں نے اُن کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

"وہ تم سے کیا چاہتے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا انھوں نے تمھیں چھیڑا تھا؟" انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"انھوں نے آتے ہی مجھ پر حملہ کر دیا۔ شاید وہ میری مالا مجھ سے چھین لینا چاہتے تھے۔" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ تمھارے پاس ایک قیمتی مالا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اور انھوں نے کیا کیا؟"

"انھوں نے میرے گریبان پہ ہاتھ ڈالا۔ ایک نے میرے گال پر مکا مارا۔ میں نے چاقو دکھایا مگر وہ نہیں مانا۔"

"تم اعتراف کر رہے ہو!" پولیس افسر نے کہا۔

"میں سچ بیان کر رہا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ جھوٹ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"اور دوسرا آدمی؟ وہ تو پہلے آدمی سے خاصی دُور مرا ہوا پایا گیا تھا؟" انسپکٹر نے تجسس سے پوچھا۔

"جب میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو دوسرے آدمی نے میرا تعاقب کیا، پھر میں نے اُسے بھی مار دیا۔"

"اور کانسٹیبل؟"

"مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے دو آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ میں بھاگنا چاہتا تھا کہ کانسٹیبل نے میرا راستہ روک لیا؟" یہ کہہ کے میں خاموش ہو گیا۔

"کچھ اور پوچھنا ہے؟" انسپکٹر نے پولیس افسر سے پوچھا۔

"بظاہر کافی ہے لیکن صرف خانہ پُری کے لیے مجھے یہ معاملہ پیچیدہ

نظر آرہا ہے۔" پولیس افسر نے انگریزی میں کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس نیز لڑکے نے جو بیان دیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ بہرحال اس نے اعتراف کر لیا ہے، ہمیں اپنے طور پر تفتیش جاری رکھنی چاہیے۔ کیا یہ معلوم ہوا کہ باقی دو مقتول کون تھے؟"

"نہیں۔ ابھی اُن کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلا۔"

"اس لڑکے کی زبان اور لہجہ صاف ہے۔ تم نے اس خاص بات پر توجہ دی؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"توجہ تو ابھی بہت سی باتوں پر دینی ہے، میرا خیال ہے، ہمیں آج صبح اسے عدالت میں پیش کرنے کے لیے خاصی معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔"

"اسے خاص سنتریوں کی حفاظت میں رکھا جائے۔ پولیس میں اشتعال پھیلا ہوا ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"اس مالا کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟" انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"میں سمجھتا ہوں، یہ ایک بیش قیمت مالا ہے۔"

"مجھے تو نقلی نظر آتی ہے، ذرا غور سے دیکھو۔" انسپکٹر نے اُسے افسر کی طرف اُچھال کے کہا۔

افسر نے گھما پھرا کے مالا کا جائزہ لیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پھر پہلے افسر نے مالا دوسرے افسر کی طرف بڑھا دی۔ "کیا خیال ہے؟"

"یہ قتل کا کیس ہے۔" اُس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہمیں یہ مالا فی الفور سیل کر دینی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ ....."

"تمھاری رائے صحیح ہے۔" انسپکٹر نے بات اُس کی زبان سے اور مالا اُس کے ہاتھ سے تقریباً چھین لی اور لفافے میں بند کر کے اُسے سیل کر دیا۔ لفافے پر تینوں پولیس افسروں نے دستخط کیے اور اسے ایک الماری میں مقفل کر کے الماری بھی سیل کر دی گئی۔ "تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟" انسپکٹر نے گرج دار آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "ورنہ ہم تمھیں تمھارے اس ابتدائی بیان کے بعد عدالت میں پیش کر دیں گے؟"

"مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

میری اُنگلیوں کے نشانات لے کے مجھے پھر حوالات کی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میں ایک کونے میں سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ میں نے تھانے اور حوالات کے بہت قصے سنے تھے اور بہت کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں گیا میں روزانہ تھانے کی عمارت سے گزرتا تھا لیکن اندر سے تھانا کبھی نہیں دیکھا تھا اور میری کسی پولیس والے سے بھی دوستی نہیں تھی، محلے کا ایک شخص پولیس میں ملازم تھا۔ مجھے اُس کے چہرے سے ڈر لگتا تھا۔ گیا کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ اس وقت حوالات میں بیٹھا تھا۔ ایک ہفتے میں کیا سے کیا ہو گیا۔ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ اگر کسی طرح ابا اور امی کو خبر ہو گئی کہ اُن کا بیٹا قاتل ہو گیا ہے تو اُن دونوں کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ کمزور ٹانگوں سے اتنی تیز دوڑنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اب پچھتانے کا کیا موقع ہے۔ میں نے اعتراف کر لیا ہے اور مجھے قتل کی سزا بھی معلوم ہے، کاش سزا پانے سے پہلے مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کورا محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ کاش ایسا ہی ہو، ورنہ میری رُوح بے چین رہے گی۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، میں نے تو مولوی صاحب کو منع کیا تھا کہ وہ رات کے وقت دریا کے کنارے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں، حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو بہت سے دریاؤں کے کنارے جا کے سیر کریں گے مگر مولوی صاحب نے ضد کی اور مجھے یہاں جہنم میں پھنسا کے نہ جانے کدھر چلے گئے۔

ممکن ہے، مولوی صاحب کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو، وہ تنہا دو بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ صحیح و سلامت ہیں تو مجھے ضرور پوچھنے آئیں گے، شاید آ جائیں یا شاید نہ آئیں جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون ہے تو وہ وہیں میرا نوشتہ پڑھ لیں گے اور کسی اُلجھن سے بچنے کے لیے میری خیر خبر لینے نہیں آئیں گے اور اگر وہ کورا کو غنڈوں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جس کا امکان بہت کم ہے، تو بھی وہ ادھر نہیں آئیں گے، انھیں سارا معاملہ معلوم ہے، وہ مجھ سے کسی طرح اپنا تعلق ظاہر کرنا نہیں چاہیں گے۔ پھر پولیس اُن کے سراغ میں لگ جائے گی اور کورا تک پہنچ جائے گی، مولوی صاحب کا نہ آنا ہی بہتر ہے، وہ بے چارے میری وجہ سے کیوں اُلجھن میں پڑیں؟

علی الصباح سنتری مجھے انسپکٹر کے کمرے میں لے جا رہے تھے۔ میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا لیکن اب کسی زخم کا احساس نہیں تھا۔ مردہ آدمی کو زخم کہاں ستاتے ہیں، میں نے شیروانی اُتار کے دُور پھینک دی، حوالات کی کوٹھری سے بھی اجنبیت ختم ہوتی جا رہی تھی، ایک سنتری نے سلاخوں سے پانی کا گلاس اندر کر دیا۔ "منہ دھو لے۔" اُس نے حقارت سے کہا۔

"منہ کس کے لیے دھوؤں؟ سنتری اور تھانے دار کے لیے؟" میں نے گلاس لے کے دو تین چھینٹے منہ پر مارے اور کرتے سے پانی پونچھ کے پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ سنتری نے پھر ایک گلاس چائے سلاخوں سے میرے ہاتھ میں تھما دی، شکر میں کالا پانی گھول دیا گیا تھا۔ کبھی گلاس میں چائے نہیں پی تھی مگر کبھی حوالات میں بھی نہیں رہا تھا۔ صبر و شکر کر کے ایک گھونٹ بھر کے حلق سے اُتار لی۔ گھر یاد آنے لگا۔ بہنیں، بھائی، ابا، امی اور کورا۔ نہ جانے کورا پر کیا گزری ہوگی؟ میں نے اُسے دُکھ ہی دُکھ دیے۔ مجھے بے اختیار رونا آ گیا۔ سنتریوں نے بھی میری ہچکیوں کی آواز سن لی، آنسو ایسے اُمڈ اُمڈ کے آتے کہ یہ خبر ہی نہیں ہوتی کہ کون دیکھ رہا ہے اور کون ہنس رہا ہے، مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ پھر میں اپنے حال سے بیگانہ ہو گیا۔

تھے ورنہ میں اُن کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ مجھے آخری بار دُور سے کورا کی ایک چیخ سنائی دی تھی جو شاید انھوں نے نہیں سُنی۔ اگر مولوی صاحب کورا کو چھڑانے میں کامیاب بھی ہوگئے اور پولیس نے مطلوبہ بدمعاشوں سے رابطہ بھی قائم کرلیا تو اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں جائے واردات پر اپنی موجودگی کا اقرار کرلیں گے، پھر مجھے بار بار بلایا جاتا رہا اور مجھے بتایا گیا کہ مقتولین کی لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے ظاہر ہے کہ زخموں کے نشانات اُسی چاقو سے لگائے گئے ہیں جس کی ملکیت کا میں نے پہلے ہی اقرار کرلیا تھا۔

ایک دن گزر گیا، میرے معدے میں غذا کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔ دوسرے دن دوپہر مجھے جبراً کھانا کھلایا گیا اور شام کو میرے منہ پر طمانچے مارے گئے تاکہ میں اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤں۔ وہ لوگ مجھے زچ سمجھاتے رہے اور مجھ پر تشدد بھی کرتے رہے لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ میں اپنے پچھلے بیان پر اصرار کرتا رہا۔ میں نے چیخ چیخ کر اُن سے کہا۔ "جب میں نے اعتراف کرلیا ہے تو تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تمھارے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتے ہیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے، تم جو سزا مناسب سمجھتے ہو مجھے دے دو بار بار کیوں پریشان کرتے ہو۔" میں نے پہلی بار اُن سے تلخی کے ساتھ بات کی۔

"تمھیں پھانسی ہوجائے گی۔"

"پھر کیا ہوگا۔" میں نے زہرخند سے کہا۔

"تم مر جاؤ گے۔"

"مجھے اب زندگی کی تمنا بھی نہیں ہے۔"

"لڑکے!" ایک ادھیڑ عمر افسر نے شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "پولیس تمھاری دوست ہے تمھیں اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ ممکن ہے تم ہمیں کوئی ایسا نکتہ بتادو جس سے تمھاری سزا کم ہوجائے، ہم عدالت میں تمھاری سفارش کرسکتے ہیں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے اُس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"کیا تمھیں کسی کا خوف ہے؟ کسی بدمعاش کا۔" اُس نے ملائمت سے پوچھا۔ "تم یقیناً کچھ چھپا رہے ہو۔"

وہ خوف کی بات کررہا تھا۔ اگر میں اُسے بتا دیتا کہ مجھے کورا کا خوف ہے۔ کورا جو ایک معصوم اور ستم رسیدہ لڑکی ہے جس کے لیے میں نے گھر چھوڑ دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی جسے چھپانے کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ کیا میں اُسی کو طشت ازبام کردوں؟ میں اپنے خاندان کی رسوائی کا سبب بنوں اور اپنے باپ کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑوں؟ میں مولوی صاحب کو پریشان کروں کہ اُنھوں نے میرے ساتھ سلوک کیا تھا۔ میں نے دو قتل تو کیے ہی تھے۔ کانسٹیبل کو بھی ہلاک کردیا تھا۔ اس کے تین گواہ موجود ہیں، خود پولیس گواہ تھی۔ زیادہ باتیں کرنا فضول تھا، جو ہوگیا تھا، وہ تو ہو گیا تھا اور ممکن تھا میں انھیں بتا دیتا، اگر مجھے کلی طور پر یقین ہوجاتا کہ کورا کو غنڈے ہی لے گئے ہیں، مولوی صاحب ناکام ہوگئے۔ ایک بیراہ پکڑ لیتے تو دُور تک پہنچ جاتے۔ بات گیا تک جا پہنچتی۔ میں نے انھیں اپنا پتا ہی نہیں دیا۔

تین دن بعد مجھے دوبارہ عدالت میں پیش کردیا گیا۔ میری حالت ان تین دنوں میں مسلسل جاگنے اور فاقے کرنے سے ایسی ابتر ہوگئی تھی کہ مجسٹریٹ کو مجھے پہچاننے میں دشواری ہوئی۔ "کیا یہ وہی لڑکا ہے؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے تم نے اسے بہت مارا ہے اور کھانا بھی نہیں کھلایا۔"

"ہم نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے جناب عالی! مگر یہ بہت ڈھیٹ لڑکا ہے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔" انسپکٹر نے اپنی تلخی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

وہی سوال، وہی جواب، آخر مجسٹریٹ نے فائل کا بغور جائزہ لینے کے بعد دستخط کردیے، پیش کار نے مہر لگادی اور مجھے حوالات سے جیل منتقل کردیا گیا۔

حوالات کے ماحول سے جیل کی فضا بہت بہتر تھی۔ اس چار دیواری میں آکے میں نے سکون کی سانس لی، میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور مجھے ایک تاریک کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ کوٹھری میں پہلے سے ایک شخص مقیم تھا۔ مجھے دیکھ کے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک ابھری۔ میں چُپ چاپ ایک گوشے میں سمٹ گیا وہ اپنی بیڑیاں کھڑکاتا ہوا میرے پاس آیا، میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے درشتی سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور غور سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "لاڈلے! تو بھی یہاں آگیا؟" میری آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ "کمال ہے۔ تُو نے اتنی عمر میں کمال کردیا، کسے مارا ہے؟" وہ تجسس سے بولا۔

"خود کو مار دیا۔"

میری آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور میرے کانوں کے قریب منہ لاتے ہوئے رازداری سے بولا۔ "ایک یا دو؟"

"تین۔"

"تین؟" وہ اچھل پڑا۔ "شاباش۔ اپنی قسمت بھی کیسی نیاری ہے۔ میرے رب!" وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی زٹیل قسم کا آدمی ادھر نہ ڈال دیا جائے۔ جی دار آدمی دیا۔ تیرے صدقے جاؤں مالک۔" اُس نے اُچک کے میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ میں نے گھور کے اسے دیکھا وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا ہوگیا تھا لاڈلے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے بگڑ کے کہا۔

وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ "بالکل نیا نیلا ہے زندگی میں نیا نیا ہے۔ سب چیز تیری نئی معلوم ہوتی ہے پیارے اجیل میں بھید بھاؤ کیسا۔ بتادے میری جان، بتادے ایمان سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔ اب تو

اس کوٹھری میں آگیا ہے تو اپنے کو یار سمجھ۔ رونا چاہتا ہے تو پہلے رو لے پھر بعد میں تجھے بڑی ہنسی آئے گی۔ تو میری طرح ہنسے گا۔ تجربے کی بات ہے لاڈلے!"

"تم کون ہو؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

اُس کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔ "واہ رب واہ، پوچھتا ہے تم کون ہو؟ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ ارے جو تو ہے وہی میں ہوں۔ ہم دونوں کی ایک ہی ذات ہے، ایک ہی دھرم، ایک ہی مقدر۔ لو بھئی یہ لڑکا تو کمال کا ہے۔"

وہ عجیب آدمی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کنکھیوں سے اُسے سر سے پیر تک دیکھنے کی کوشش کی، وہ میری طرح جیل کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے پیروں میں بھی بیڑیاں تھیں، میرے پیروں میں بھی۔ شاید اُس نے داڑھی بہت دن سے نہیں بنائی تھی۔ اُس کے دانت بھی زرد ہو گئے تھے۔

"تم یہاں کیسے آئے؟" میں نے اُچٹتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

"خوب میرے بھولے بادشاہ۔" اُس نے میرے گال کی چٹکی لے لی۔ "اس سوال سے دودھ کی خوشبو آتی ہے۔ ارے لاڈلے!" اُس نے اپنی ہنسی روک کر کہا، "یہ جگہ انھی لوگوں کے لیے بنی ہے جو کچھ کر سکتے ہیں۔ کچھ کھیل دکھا کے آتے ہیں۔ ایک دو کو مار سکتے ہیں۔"

"تو کیا تم بھی، تم نے بھی کسی کو قتل کیا ہے؟"

"مگر تو مجھ سے بازی لے گیا۔ مجھ سے تو ایک آدمی بھی ٹھیک طرح نہ سو پایا۔ تو نے بھلا کیسے ان نازک ہاتھوں سے تین کو مار دیا؟"

"میں نے تینوں کے پیٹ میں چاقو مار دیا۔"

"ارے واہ۔" اُس نے کھل کھلا کے کہا۔ "جواری تھے؟"

"نہیں۔" میں نے منہ بنا کے کہا۔

"پھر کوئی دھوکا کیا تھا؟" اُس نے آنکھ مار کے کہا۔ میں نے وہی بیان دُہرانا شروع کیا جو میں نے پولیس کو دیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب کانسٹیبل کے پیٹ میں چاقو اُتارنے کی بات آئی تو اُس نے دونوں ہاتھ بڑھا کے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ "ایک بار پھر سے سنا میرے شیرا!" اُس نے مجھے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "یقین نہیں آتا۔" میں نے کانسٹیبل والا واقعہ اُسے دوبارہ سنایا۔ "تو نے تو یار بڑے بڑے اُستادوں کی ایسی کی تیسی کر دی مگر یہ تو بتا اُن دو شہدوں نے تجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟ دیکھ کچھ چھپانا نہیں۔ یہ تھانا نہیں ہے۔ یاروں کا گھر ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم، بس اچانک اُنھوں نے مجھ پر وار کر دیا۔"

"ایسے کوئی وجہ تو ہوگی یا وہ سالے پاگل ہو گئے تھے؟"

"پتہ نہیں، وہ مجھے کیا سمجھے تھے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"میں بتاتا ہوں، وہ تجھے لونڈا سمجھے تھے۔ تو نے ضرور جھگڑا کیا ہوگا لاڈلے، تُو نے اُنھیں ٹھکرا دیا ہوگا۔"

"کیا بات کر رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے جانے دے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "دریا کا کنارہ ہو، تنہائی ہو، رات ہو اور نیت خراب ہو۔ تو جو بھی نہ ہو، تھوڑا ہے۔"

"تم سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"ارے نہیں۔" وہ اپنے کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "تو ہی سچ بول رہا ہے۔ خیر اب نہیں تو پھر بتا دے گا، شرم آتی ہے۔"

"کیسی شرم؟"

"اب یہ ذکر چھوڑ، یہ بتا کیس میں جان کتنی ہے؟"

"میں اعتراف کر چکا ہوں۔"

"کیا؟ یہ کیا کچی بات کہہ دی تُو نے۔" وہ بگڑتے ہوئے تیوروں سے بولا۔ "یعنی تُو نے حامی بھر لی ہے؟"

"ہاں کانسٹیبل کے قتل کے وقت تین اور کانسٹیبل بھی موجود تھے، انکار کا کیا سوال تھا۔"

"انکار کا کیا سوال تھا۔" وہ برہم ہو کے بولا۔ "ابے ہم تو پھانسی کے پھندے پر بھی انکار کرتے رہیں گے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"حاصل واصل کیا، ذرا آنکھ مچولی رہتی ہے اور کبھی کبھی تُکا بھی لگ جاتا ہے۔ بیان بدل دینا۔" اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"تم جیل میں پہلی بار آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پہلی بار!" وہ قہقہہ لگا کے بولا۔ "تو ابھی مجھے نہیں جانتا، بے عزتی کرتا ہے۔ کٹھڑے، یہ تو اپنا گھر ہے۔ اس بار ذرا اوچھا ہاتھ پڑ گیا تو اس بدبودار کوٹھری میں رہنا پڑ گیا ہے، باہر بڑی یاد اللہ ہے۔ سرکاری وکیل نے جان لڑا دی ہے لیکن اپنا ٹنڈا وکیل بھی کچھ کم نہیں ہے۔ تیرا ڈرے اتا کام ہو گیا تو دلانے والے کو ترسے گا۔"

"گویا تم بچ جاؤ گے؟"

"ایسے اگر بچیں گے نہیں تو بچنے کی آس کیوں توڑیں۔"

"کیا تمھارے خیال میں میں بچ سکتا ہوں؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"کوئی وکیل کیا ہے؟"

"میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔"

"دیکھ بڈّے سے بات کریں گے۔ سالا کیا داؤ پیچ جانتا ہے سرکاری وکیل کو ترتگنی کا ناچ نچا دیتا ہے۔ ایسے ایسے پائنٹ ڈھونڈ کے لاتا ہے کہ بھری عدالت چکرا کے رہ جاتی ہے۔"

"مگر۔" میں نے مایوس لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے نہیں بچا سکے گا۔"

"ایسی ناامیدی؟" وہ میری کمر پہ ہاتھ مارتے ہوتے بولا۔ "کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے بڈّے کو آنے دے میں بات کرتا ہوں۔"

"نہیں، کسی سے بات نہ کرنا، پھر بہت سی باتیں پھیلیں گی۔"

"زندگی بڑی چیز ہے لاڈلے! اتنی جلدی گھبرا گیا؟ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے اپنا حال دیکھ آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ پھر بھی جینے کی آرزو ہے۔ کچھ نشہ وشا کرتا ہے؟" اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں، میں نے آج تک سگریٹ بھی نہیں پی۔"

"بالکل کورا ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"تم بار بار ہنستے کیوں ہو؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔ "لاڈلے! کیا ہنسنا بھی بند کر دیں؟ یہ ہنسی ہی تو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اپن تو ساری باتیں ہنسی میں اُڑا دیتے ہیں ورنہ اس دُنیا میں کیا رکھا ہے۔ یہ دُنیا۔" وہ کرب ناک لہجے میں بولا۔ "بڑا رلاتی ہے پیارے! بہت ظالم ہے یہ، میں اسے ہنسی میں ٹال دیتا ہوں۔"

اُس کا نام ٹھٹّل تھا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں کی داڑھی اور گھنی مونچھوں والا ٹھٹّل آواز گرج دار، لہجہ تلخ، ہنسی بھی زہریلی۔ میں شروع شروع میں اُس سے جھجکتا رہا، مجھے اُس سے خوف آتا تھا لیکن پہلے ہی دن شام تک اس نے اتنی باتیں کیں کہ مجھے اُس کے متعلق اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ ایک قتل کر کے آیا تھا۔ کلکتے کے ایک بدمعاش کا قتل، وہ خود بھی بہت بڑا بدمعاش تھا اور غنڈوں کے ایک بڑے گروہ کا سرغنہ۔ ٹھٹّل پٹنے سے تعلق رکھتا تھا، پٹنے میں اُس کے ساتھ پے در پے ایسے حادثے پیش آتے کہ اُس نے اپنا آبائی شہر چھوڑ دیا اور کلکتے چلا آیا اور یہاں ترقی کرتے کرتے وہ بدمعاشوں کا بادشاہ بن گیا۔ وہ اُونچی اونچی کڑوی کسیلی باتیں کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ بار بار جیل آتا تھا۔ یہاں کے سب لوگ اُس سے واقف تھے، ہماری کوٹھری پر تعینات سنتری بھی اُسے اچھی طرح جانتا تھا، جب رات کا کھانا آیا تو سنتری نے چپکے سے ایک تھیلا اُس کی طرف اُچھال دیا۔ اس میں سموسے رکھے تھے۔ ٹھٹّل نے کھانے پر مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور چار دن بعد نہ جانے کیوں میں نے بہت اطمینان سے جیل کا کھانا کھایا پتلا شوربہ، ادھ پکی روٹیاں اور دال۔ پیالے مٹی کے تھے۔

رات کو ہم دونوں ساتھ ساتھ لیٹ گئے میرے ساتھ ٹھٹّل کے رویّے میں خاصی تبدیلی آگئی تھی ہم اپنے بازوؤں کا تکیہ بنائے ایک دوسرے کے سامنے کروٹ لیے لیٹے تھے۔ اگر ٹھٹّل نہ ہوتا تو مجھے جیل کے آداب سمجھنے میں بڑی دشواری ہوتی اور اس مختصر تاریک کوٹھری میں میرا دم نکل جاتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے کہیں گم ہو جاتا ہے اور چھت گھورتے گھورتے آہیں بھرنے لگتا ہے پھر اچانک ہڑبڑا کے مجھ سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے بارے میں اسے کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ اُسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے۔ وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے لگتا تھا۔ اُس نے میرا نام بھی نہیں پوچھا تھا مجھے مسلسل لاڈلے کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں آدھی رات کے وقت اُٹھ کے کوٹھری میں ٹہلنے لگا، بیڑیوں کی آواز سے سنتری چونک گئے۔ اُنھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں چپ چاپ لیٹ جاؤں۔ شاید ٹھٹّل بھی جاگ رہا تھا سنتری کی آواز سن کے اُس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ سناٹے میں اُس کی ہڈیاں چٹخنے کی آواز دور تک گئی ہو گی۔ اُس نے کھردرے لہجے میں آواز بلند کی۔

"کیا ہے سنتری! کیوں بگڑ رہے ہو؟ ابھی نیا نیا ہے، پہلی رات اسی طرح گزرتی ہے، رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سو جا لاڈلے! سو جا۔ یہ تو باہر ہی سے حکم بلند کرتے رہتے ہیں، اندر آ کے دیکھیں تو نانی یاد آجائے۔ زمین کتنی سخت ہوتی ہے۔"

میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ سیلن اور تاریکی کی وجہ سے کوٹھری میں طرح طرح کے کیڑے مکوڑے موجود تھے۔ ٹھٹّل بھی میرے قریب آ کے بیٹھ گیا "لاڈلے!" اُس نے نرمی سے کہا۔ "تو تو واقعی کوئی شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ اِس نامراد شہر میں کیسے پھنس گیا؟"

"بس جو لکھا تھا، وہ پورا ہوا۔" میری آواز بھرا گئی۔

"لے یہ چادر اوڑھ لے کیڑوں سے بچا رہے گا ورنہ تیری نازک جلد خراب ہو جائے گی۔ اب گھر کے بستر کا خیال چھوڑ دے۔"

"کیسا گھر؟" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اُس نے اپنی چادر میرے جسم پر ڈال دی۔ یہ سنتریوں کی مہربانی ہے رات کو چادر مجھے دے دیتے ہیں اور صبح ہوتے ہی واپس لے لیتے ہیں۔"

"نہیں پھر تم کیا اوڑھو گے؟ تم سچ کہتے ہو، مجھے سب چیزوں کا عادی ہونا چاہیے۔" میں نے چادر اُسے واپس کرتے ہوتے کہا۔

احمد کے اسکواش ۔ موسم کے اسکواش
LEMON SQUASH
ORANGE SQUASH
احمد اسکواش
آرینج | لیمن | مینگو

MNJ

"اب جی مت جلا لاڈلے! تکلف برت کر جو بات میں کہوں، مان لیا کر، مجھے حکم دینے کی کچھ عادت ہو گئی ہے۔"

شمعل اور میں یوں ہی ساکت و صامت رات گئے تک بیٹھے رہے۔

دوسرے دن تعطیل تھی۔ اس لیے مجھے عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔ شمعل نے بتایا کہ اب مجھے سیشن کورٹ کے سپرد کیا جائے گا۔ بیانات، جرح اور پورے واقعے کی اکھاڑ پچھاڑ ہوگی۔ وکیل عدالت میں عورتوں کی طرح ایک دوسرے کو کوسنے دیں گے اور پہلوانوں کی طرح عدالت کے اکھاڑے میں داؤ پیچ آزمائیں گے۔ وہ مجھے کچہری کی اصطلاحیں اس طرح سمجھاتا رہا جیسے کوئی وکیل ہو۔ دوسرے دن اس کا ٹنڈا وکیل اس سے ملنے کے لیے جیل آیا۔ وہ واقعی ٹنڈا تھا، سیاہ فام اور پستہ قد، اس کے گال اندر دھنسے ہوئے تھے اور ناک پر موٹی سی عینک رکھی ہوئی تھی۔ پہلے تو ٹنڈا وکیل شمعل سے اس کے کیس کی پیچیدگی کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ شمعل کے ہاتھ پوشیدگی تک نہیں آئی۔ پھر شمعل نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وکیل میری مختصر روداد سن کے کچھ دیر سوچتا رہا۔ شمعل نے مجھے کہنی ماری۔ "دیکھا، کوئی پائنٹ لا رہا ہے۔ پست کر دے گا سرکاری وکیل کو ناک چنے چبوا دے گا۔ چھوٹا ہے مگر کھوٹا نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے جسم میں عقل ہی عقل بھری ہوئی ہے۔"

چند لمحے غور و فکر کرنے کے بعد ٹنڈے وکیل نے مجھے مشورہ دیا کہ میں عدالت میں اپنے بیان پر جما رہوں اور بہت کم بات کرنے کی کوشش کروں۔ اس پر شمعل وکیل کو برا بھلا کہنے لگا کہ وہ غلط مشورہ دے رہا ہے۔

"دیکھو ٹنڈے صاحب اگر کوئی ایسا تیر چلاؤ کہ سیدھا جج کے دل میں جا کے لگے اور وہ ترس کھا کے اسے ایک دم رہا کر دے۔"

"یہ نا ممکن ہے، شمعل!" وکیل نے سکون سے کہا۔

"نا ممکن؟" شمعل ناراض ہو کے بولا۔ "مجھے اس لفظ سے نفرت ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ وکیل کا یہی جواب ہوگا۔ اس نے میرے معاملے میں دلچسپی نہیں لی۔ شمعل اس پر گرم ہوتا رہا اور اسے گالیاں دینے لگا مگر ٹنڈا وکیل شمعل کا مزاج خوب سمجھتا تھا اس لیے اپنا بیگ دبا کے چپ چاپ چلا گیا۔

اگلے دن مجھے اور شمعل، دونوں کو ساتھ ہی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ کچہری میں ہم جدا ہو گئے۔ مجھے ایک جج کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ پھر پیشیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرکار کی طرف سے مجھے اپنی صفائی کے لیے ایک وکیل دیا گیا۔ وکیل نے مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہا۔ اس نے کچھ اگلوانے کے لیے مجھ سے جھوٹ بھی بولے، مجھے ڈرایا دھمکایا بھی، عاجزی سے بھی پوچھا اور غصے سے بھی لیکن میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ مجھے عدالت میں پیش کیا جاتا رہا اور ان سوالات کی تکرار ہوتی رہی جو تھانے میں کیے گئے تھے۔ ایک ایک نکتے پر بحث ہوتی۔ تینوں کانسٹیبل گواہوں نے میرے خلاف بیانات دیے۔ چاقو اور مالا دونوں چیزیں عدالت میں پیش کی گئیں۔ چاقو پر میری انگلیوں کے نشانات تھے اور مالا جوہریوں کی رپورٹ کے مطابق سچے موتیوں کی ایک بیش قیمت مالا تھی۔ جج کی ہدایت پر مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا، جس نے مختلف طریقوں اور آلوں سے میرے جسم کا معائنہ کیا۔ پیشی والے دن شمعل مجھے دیر تک سمجھاتا اور میری ہمت بندھاتا رہتا۔ شمعل کے کرخت لہجے سے مجھے اب ایک انسیت سی ہو گئی تھی۔ ادھر میرا وکیل مقدمے کو نئے نئے رنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب تک تم مجھے پوری تفصیل سے واقعہ نہیں بتاؤ گے، میں اندھیرے میں رہوں گا اور صحیح طرح تمھاری وکالت نہیں کر سکوں گا۔ پیشیاں، سوالات اور بیانات ہوتے رہے۔ بیس دن گزر گئے۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق میری جسمانی اور ذہنی حالت نارمل تھی لیکن اس نے میری رپورٹ میں کوئی ایسی بات ضرور لکھی تھی جو کئی دنوں تک بحث کا موضوع بنی رہی۔ اس نے لکھا تھا کہ مجھے کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے لیکن میں عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قوت برداشت اور دماغی صلاحیتیں رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر نے میری عمر سولہ سال سے زیادہ بتائی تھی۔ مقتولین کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، ان کے ساتھیوں کے بیانات، جن باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا، دونوں وکیلوں کے درمیان بھی نوک جھونک ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے کالج کا کوئی تقریری مقابلہ ہے جس میں سب سے اچھی تقریر کرنے والے کو انعام ملنے والا ہے اور موضوع میری ذات ہے۔

میرے وکیل نے سارا زور بیان اس نکتے پر صرف کیا تھا کہ میں نے مجرمانہ حملے سے مدافعت کرتے ہوئے پہلے دو آدمیوں کو قتل کیا۔ پھر اسی دہشت کا اثر تھا کہ مجھے پولیس والوں کی نیت پر بھی شبہ ہوا۔ گو میرے لیے یہ بہت شرمناک بات تھی۔ میری زبان سے اپنے بارے میں ایسے لفظ ادا نہیں ہو سکتے تھے مگر شمعل، اس کے ٹنڈے وکیل اور اپنے وکیل صفائی کے پیہم اصرار پر میں اپنے بیان میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بڑی مشکل سے عدالت میں میری زبان کھلی۔ بات بھی یہی تھی کہ میں نے اپنی مدافعت میں ان غنڈوں پر چاقو چلایا، وہ مجھ سے کورا کو یعنی مجھ سے مجھی کو چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ تو صرف دو سامنے آئے تھے اگر چار ہوتے، اگر دس بھی ہوتے تو میں ان سب کے جسموں میں چاقو اتار دیتا۔

وکیل صفائی عدالت میں میرے ماضی کے متعلق عدالت کی رائے مشکوک اور متزلزل کرنے کا کام انجام دیتا رہا۔ اس نے اتنی باتیں کیں کہ ہر بات مبہم اور مشکل نظر آنے لگی۔ میں کٹہرے میں حیرت زدہ ہو کے اس کے دلائل سنتا رہتا تھا۔ اس نے بار بار میری عمر کی طرف توجہ دلائی، میرے چہرے کی شرافت پر اصرار کیا۔ جج سے اپیل کی کہ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرے۔ اس نے مجھے زمانے کا ستایا ہوا ایک مظلوم شخص قرار دیا

روزن روزن

ابوظفر زین

ایک مجلس میں شہنشاہ اکبر کے وزیر شیخ ابوالفضل کا ذکر تھا۔ ایک صاحب بولے، اگر وہ اس زمانے میں ہوتا تو شاید عدالتوں میں عرضی نویسی کر کے اپنا پیٹ پالتا۔ ہم نے کہا، اگر وہ اس زمانے میں ہوتا تو کم سے کم ایم اے یا ایل ایل ڈی کی ڈگری ضرور حاصل کر لیتا اور کچھ نہیں تو لندن کے کسی نامی گرامی اخبار کا نامہ نگار ضرور ہو جاتا کیوں کہ ابوالفضل کی ذات میں زمانے کا ساتھ دینے کی بڑی قابلیت تھی۔

میر تقی میر کی عادت تھی کہ جب وہ گھر سے باہر جاتے تو تمام دروازے کھلے چھوڑ دیتے تھے اور جب گھر واپس آتے تو تمام دروازے بند کر لیتے تھے۔ ایک دن کسی نے اُن سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب دیا "میں ہی تو اس گھر کی واحد دولت ہوں"۔

اسٹالن کی سترویں سال گرہ پر مُبارک باد کے جو پیغامات آئے تھے، وہ روزنامہ "پراودا" میں ایک سال تک چھپتے رہے لیکن اُس کی موت پر جو پیغامات آئے تھے، وہ مشکل سے ایک ہفتے چھپ سکے۔

تو اپنا وکیل بھی نہیں کر سکتا تھا، اس نے ایسی جوشیلی باتیں اتنے پُر اثر انداز میں کیں کہ اگر میں جج ہوتا تو اُسے ضرور انعام دیتا۔ بلاشبہ وکیل بھی مشوروں میں اُس کے ساتھ شامل تھا۔ وکیلِ صفائی نے عدالت میں شبہ ظاہر کیا "ممکن ہے میرا موکل طویل عرصے پہلے کسی زبردست حادثے میں اپنی یادداشت کھو چکا ہو اور اب ماضی کے محض دھندلے دھندلے نقوش اُس کے ذہن میں رہ گئے ہوں یا اسے اپنے معزز خاندان کی نیک نامی کا اس قدر شدید احساس ہو کہ وہ اس شرم ناک واقعے میں ان اہم ناموں اور شخصیتوں کو رسوائی سے بچانے کے لیے ایثار پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یقیناً اس نے جھگڑوں اور رسوائیوں سے بچنے کے لیے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی حیثیت بھی مشکوک کر لی ہے۔

اُس نے عدالت پر زور دیا کہ اُس کے موکل کا کوئی خراب ریکارڈ کہیں موجود نہیں ہے جب کہ مقتولین کا ماضی اور کردار بے حد گھناؤنا تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکے تھے اور متعدد مقدمات میں ماخوذ تھے، بدمعاشوں کے ساتھیوں اور رشتے داروں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وکیلِ صفائی نے اس نکتے کی طرف جج کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی اُس نے پُر زور آواز میں کہا "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے موکل اور مقتولوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ انھوں نے اسے دریا کے کنارے تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا تو اُن کے غلیظ کردار کی رگ جاگ اُٹھی۔ وہ وحشی ہو گئے۔ جب سرکاری وکیل نے میرے پاس چاقو کی موجودگی کا ذکر کیا تو وکیلِ صفائی نے ان گنت عذر پیش کر دیے کہ وہ چاقو میں نے اپنی حفاظت کے خیال سے رکھا تھا کیونکہ میں دُنیا میں تنہا تھا۔ میرے وکیل نے اصرار کیا کہ غنڈوں نے اپنے شرم ناک منصوبے میں ناکامی کے بعد مجھ سے مال چھیننی چاہی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ آخر مجھ پر باقاعدہ جرح کا وقت آیا۔ سرکاری وکیل نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں ویسے بھی تھک گیا تھا۔ پھر وہ مجھ سے حیاسوز سوالات کرنے لگا۔ جہاں تک بنا، میں شرماتا اور جھجکتا ہوا بہت مختصر جوابات دیتا رہا لیکن پھر حد ہو گئی، سرکاری وکیل کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے؟ وہ اُس شخص سے مخاطب تھا جسے اب زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اُس کے سوال و جواب بہت جارحانہ ہو گئے تو میں نے بھری عدالت میں چیخ کر کہا "ایسے سوال مت کرو، مجھے پھانسی دے دو میں قتل کا اعتراف کر چکا ہوں۔ ایک آدمی موت قبول کرنے کے لیے تیار ہے تم اُسے سزا دینے سے کیوں کترا رہے ہو؟ موت کے لیے بہ رسمیں کیوں ادا کی جا رہی ہیں؟ اب بہت ہو چکا، بس کرو، بس کرو"۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سیدھی اور صاف بات ہے، تنگ کیوں کرتے ہو؟ میں نے تین قتل کیے ہیں۔ مجھے اس کی سزا موت کی صورت میں دے دو۔ مجھ پر رحم مت کرو"۔ میں نے چلّا چلّا کے عدالت سر پر اُٹھا لی۔ مجھے خاموش کرنے کے لیے جج کو کئی بار میز پر ہتھوڑی مارنی پڑی۔ میرا وکیل مجھے صبر و تحمل کے اشارے کر رہا تھا۔ عدالت میں اس آخری دن میری حالت خاصی خراب ہو گئی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے روتے ہوئے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے پھانسی دے دیں اور اِدھر اُدھر کے فضول سوالوں میں وقت ضائع نہ کریں،

جج نے فیصلے کے لیے چھ دن بعد کی تاریخ ڈال دی تب مجھے قرار آیا۔ میں نے جیل پہنچتے ہی یہ خوش خبری مچل کو سنائی۔ وہ مقدمے کی ساری کارروائی کے درمیان مجھے مشورے دیتا اور تبصرے کرتا رہا تھا۔ ادھر خود مچل کا مقدمہ طول اختیار کر گیا تھا۔ میں اُس کے بعد جیل میں آیا تھا۔ میرے مقدمے کا فیصلہ اُس کے فیصلے سے پہلے ہونے والا تھا۔ مجھ پر اُس کی مہربانیاں بتدریج بڑھتی رہی تھیں۔ ان بیس پچیس دنوں میں ہم کیا باتیں کر سکتے تھے۔ مچل نے اپنی کالی زندگی کے ہزاروں واقعات مجھے سنائے۔ اس

دوران میں اُس نے میرا ایسا خیال رکھا تھا جیسے میں اس کا مہمان ہُوں۔ اُس نے میرے متعلق خود ہی بہت سی رائیں قائم کر لی تھیں۔ اُس کا خیال تھا کہ میں کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ سنتری بھی اُس کی وجہ سے میرا خیال رکھنے لگے تھے اور خود میں نے بھی کبھی اُنھیں پریشان نہیں کیا تھا۔ میرا فیصلہ ہونے والا تھا۔ بھتّل اور سنتریوں کو حیرت تھی کہ میرے چہرے پر فکر اور تشویش کی کوئی علامت کیوں نہیں ہے جب کہ ممکن ہے مجھے موت کی سزا دے دی جاتے۔ میں ہنس کر انھیں جواب دیتا۔ "موت کیا چیز ہے۔ کون شخص ایسا ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے"۔ اس پر بھتّل مجھے بے اختیار گلے سے لگا لیتا اور میرے ہاتھوں اور پیشانی کو بوسے دیتا۔ "تو بڑا بے جگرا ہے لاڈلے!" وہ مجھ سے کہتا۔ "تو نے تو بھتّل کو بھی مات کر دیا۔"

بھتّل ایک ایک دن گن رہا تھا۔ جیسے میرے نہیں، اُس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا ہو، جیسے مجھے نہیں اُسے موت آ رہی ہو۔ آخری دو دنوں میں میری حالت غیر سی ہونے لگی۔ شاید فیصلے کے بارے میں بھتّل کے بار بار ذکر کرنے سے مجھ پر اثر ہونے لگا تھا۔ میں کچھ اُداس اُداس اور خاموش خاموش رہنے لگا۔ فیصلے میں ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اور وہ زمین پر لیٹے ہوئے تھے کہ بھتّل کہنے لگا۔ "لاڈلے! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تیری طرف سے کوئی اور موت قبول کر لے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"مطلب یہ ہے شہزادے کہ اگر ایسا ہو جاتے کہ تیری جگہ میں پھانسی کے تختے پر چلا جاؤں اور تو آزاد ہو جائے۔"

"اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تو میں اسے قبول نہ کرتا۔"

"پتہ نہیں، اپنا کیا فیصلہ ہو۔ بڈا کہتا ہے کہ وہ مجھے بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دے گا، بڈا کہتا ہے تو سچ ہی کہتا ہو گا۔ سالے کی زبان میں تاثیر ہے، جو کہہ دیتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ مجھے صاف بچا لے جائے گا لیکن اگر تو زندہ نہ رہا تو مجھے اپنے فیصلے سے کوئی خوشی نہیں ہو گی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تیرے بجائے وہ مجھے سزا دے دیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں موت سے زیادہ قریب ہوں۔ اسے کچھ اور قریب کر لوں گا۔"

"ہونہہ" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیسی خوابوں کی باتیں کرتے ہو۔"

"لاڈلے! کل بڈا کہہ رہا تھا، تیرا مقدمہ اب بھاری نہیں رہا۔"

"یہ تو کل پتہ چل جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ آخر کوئی فیصلہ تو ہو جائے گا، اِدھر یا اُدھر۔"

"لاڈلے! اگر قاتلوں کے لیے یہ کوٹھڑیاں نہ ہوتیں تو میں تجھے فرار کرا دیتا اور شہر میں میرے لونڈے تجھے اس طرح اُڑنچھو کر دیتے کہ پولیس کو قیامت تک خبر نہ ملتی۔"

"جو باتیں ہو نہیں سکتیں، اُن پر سوچتے کیوں ہو؟"

اُس رات ہم دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آئی۔ رات سے دل پر ہول طاری ہو گیا تھا۔ صبح ہوئی تو میں ڈگمگانے سا لگا اور میرا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ بھتّل نے گلے لگا کے مسکراتے ہوئے مجھے رخصت کیا۔ ایک ایک پل عذاب گزر رہا تھا۔ کوئی میرے جسم سے طاقت کھینچے لے رہا تھا۔ میں خود کو لاکھ سمجھاتا تھا کہ جو ہو گا، اُسے ہمت سے قبول کرنا چاہیے مگر اُس دن عدالت لے جانے والی گاڑی کی رفتار بھی شاید بہت سُست تھی۔ ہر طرف ایک شور سا مچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سارے جسم میں سنسناہٹ تھی۔ ایک سرد لہر آتی تھی، گزر جاتی تھی۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب گاڑی عدالت کے احاطے میں ٹھہری اور کب مجھے جج کے کمرے میں پہنچایا گیا۔ میں تو گم سم، بے جان سا بیٹھا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے سنبھالا ورنہ میں زمین پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ پاتا۔ آخر وہ گھڑی آ گئی جب جج نے اپنا فیصلہ سنانا شروع کیا۔ عدالت میں غیر معمولی خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر شخص دم بخود تھا لیکن میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ شاید میں بہرا ہو گیا تھا۔ شاید جج مقدمے کی نوعیت اور مختلف مدارج کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ مجھے ہوش اُس وقت آیا جب جیل کے ایک سنتری نے میرا بازو جھنجوڑ کے مجھے چونکایا۔ جج کہہ رہا تھا۔ "قتل کی ناکافی شہادتوں، پہلے دو مقتولین کے گندے ریکارڈ، ڈاکٹری رپورٹ اور مجرم کی کم عمری دیکھتے ہوئے عدالت اس کے لیے چودہ سال قید بامشقت کی دُہری سزا تجویز کرتی ہے۔ دونوں سزاؤں کا اطلاق ایک ساتھ ہو گا۔"

جیسے ہی جج نے فیصلہ سُنایا، وکیلِ صفائی دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ "بس ان حالات میں تمھارے لیے یہی کر سکتا تھا، تمھیں زندگی مبارک ہو۔" عدالت میں بیٹھا ہوا ہر شخص میری طرف لپکنے لگا لیکن سپاہیوں نے انھیں مجھ سے ملنے کا موقع نہیں دیا۔ کمرۂ عدالت میں ایک انتشار سا پیدا ہو گیا تھا۔ بڈے وکیل سے سپاہیوں کی پرانی شناسائی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھے جیل کی گاڑی تک پہنچانے آیا اور مبارک باد دیتا رہا۔ "میں بھتّل کو جا کے بتاؤں گا تو وہ کتنا خوش ہو گا۔"

"میں خود بھتّل کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب تمھاری جگہ بدل دی جاتے گی۔ بھتّل سے تمھاری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ شاید وہ تم سے پھر کبھی آ کے ملے۔"

۱۴ سال قیدِ بامشقت۔ موت کے بجائے زندگی، آدھی زندگی زنجیروں میں بند زندگی۔ ۱۴ سال کس نے دیکھے ہیں۔ ۱۴ سال کے بعد کیا ہو گا؟ وہ سب خوش تھے کہ میں موت سے بچ گیا لیکن مجھے نہ خوشی تھی، نہ غم بلکہ غم ہی کچھ زیادہ تھا۔ ۱۴ سال تک جہنم کا عذاب، زندہ درگور۔ اس احساس کے ساتھ زندہ رہوں گا کہ کورا ابھی اس دنیا میں کہیں ہے اور کہاں ہے؟ یہ مجھے شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے۔ کورا کا غم سینے میں چھپاتے زندہ رہوں گا۔ صرف ایک رات کے سفر کے فاصلے پر میرا گھر اور گھر والے موجود ہیں۔ مجھے ستانے کے لیے

زندگی کی سزا دی گئی ہے میرے ساتھ ایک بے رحم مذاق کیا گیا ہے۔

"تڑے وکیل کی بات درست نکلی۔ میری جگہ تبدیل کر کے مجھے عام قیدیوں کی بیرک میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں کا پہلا تجربہ ہی ناخوش گوار ثابت ہوا۔ کوٹھری میں مجھے صرف تھپڑ ملا تھا مگر یہاں بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے۔ میری آمد پر سبھی نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ ایک نوجوان قیدی میرے جسم کے چاروں طرف گھوم کے میرا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے قیدی یہ تماشا دیکھتے رہے اور ہنستے رہے۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں نے غصّے سے کہا۔ جواب میں اُس نے ایک بے ہودہ جملہ کہا اور ہاتھ بڑھا کے میرے بال پکڑ لیے۔ پھر غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا اور بال پکڑے پکڑے اُس نے چہرہ تمام قیدیوں کے سامنے کیا اور میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ میرا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس کے پیٹ میں گھٹنا مارنے میں مجھے کچھ دیر نہیں لگی۔ وہ چیخا اور بلبلاتا ہوا فرش پر گر گیا۔ پھر جیسے ہی اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی، میں نے اُس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کر دیا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اُس نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کی۔ میرے گھونسوں اور لاتوں نے اسے تباہ حال کر دیا۔ ایک دوسرا قیدی اُسے بچانے کے لیے آگے بڑھا مگر قیدیوں نے اسے روک لیا۔ وہ تجسس اور حیرت سے اپنے ساتھی کو پٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہنے کیا کہنے، سبحان اللہ سبحان اللہ۔" ایک شخص نے آگے بڑھ کے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور میرا ہاتھ بلند کر کے مجھے فتح یاب قرار دے دیا۔ قیدیوں میں تالیاں بجنے لگیں۔ جس نوعمر قیدی کو میں نے گرایا تھا، اُسے اٹھا کے میرے پاس لایا گیا تھا۔ اُس کے مُنہ سے خون جاری تھا۔

"چلیے ہاتھ ملائیے صاحب زادے ہاتھ ملائیے۔"

اُس نے بہت لفت اور غصّے سے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "جناب کا نام؟" ادھیڑ عمر کے شخص نے شائستگی کے ساتھ پوچھا۔

"ظہیر خاں۔" میں نے بے رُخی سے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ، کیا ہاتھ دکھاتے ہیں جناب نے۔ خادم کو عظمت خاں عرف نصیب میاں کہتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "کب تک قیام رہےگا؟"

"۱۴ سال۔" میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

یہ سُن کے تمام قیدی میرے اطراف اکٹھے ہو گئے۔ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو چار۔" نصیب میاں نے کہا۔ "جناب کا وطن؟"

"پوری دنیا۔" میں نے جواب دیا۔

"آہا ہا، کیا شاعرانہ بات ہے۔" پھر اُس نے مجھ سے مختلف قیدیوں کا تعارف کرایا۔ "یہ بندھو ہے، یہ سارٹے ہے، یہ چھمن میاں ہیں، یہ جگو ہے، یہ لیلا ہے، نام اس کا لیلا ہے مگر کام مجنوں کا کرتا ہے، یہ ہرچرن ہے ہم اسے ہرچری کہتے ہیں۔ یہ تیجا ہے، چاقو کے فن میں ماہر، یہ شولی ہے کم بخت گانا خوب گاتا ہے۔ اور اس کا کوئی نام نہیں ہے، نمبر ہے، جو ہمیں۔ یہ نواس ہے جیب تراشی کے فن میں یکتا۔ یہ گھوش ہے، ایسے ایسے پینترے بدلتا ہے کہ گرگٹ بھی شرما جاتے۔ یہ لالہ ہے دولتی مارتا ہے اور یہ جیسے جناب نے شکستِ فاش دی ہے اس کا نام کانتے ہے۔ اس بیرک میں ایک سے ایک نامی گرامی شخصیت

پاکستان کی مایہ ناز مارس سلائی مشین

رعایتی قیمت پر دستیاب ہے

بجلی کے پنکھے، ریڈیو

ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر

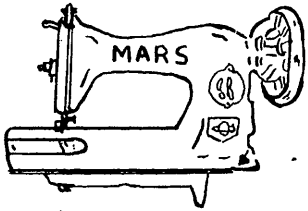

مارس سلائی مشین

مارس سیونگ مشین کمپنی بندر روڈ کراچی۔ فون ۲۲۱۷۷۱

برانچ: لیاقت آباد ڈاکخانہ۔ فون ۸۱۹۰۸۱ (۲) بالمقابل ٹنکی ملیر کالونی کراچی

ایجنسی: پریڈی اسٹریٹ صدر کراچی۔ فون ۵۱۲۹۲۵

موجود ہے۔ اب اپنے بارے میں بتائیے۔ جناب کا آنا کیسے ہوا؟"

"قتل۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیا خوب، وہ تو جناب کے تیوروں سے نظر آتا ہے کس کی بن آئی تھی؟ کچھ تفصیل سنا کے ہمیں بھی لطف اندوز ہونے کا موقع دیجیے گا۔"

"لمبی داستان ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"تو پھر سوتے میں سنائیے گا۔ جناب خاصے تھکے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔" نصیب میاں کا انداز مضحکہ خیز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب میرا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ نصیب میاں مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ "دیکھ کیا رہے ہو۔ مہمان کی خاطر کرو۔" نصیب میاں نے اُن سب کو اشارہ کیا۔

جس شخص کا نام جگو تھا، اُس نے بیڑی کا بنڈل میرے آگے کر دیا۔ میں نے نفرت سے منہ سکیڑ لیا، اُس نے بھی منہ بگاڑا مگر ایک دوسرے شخص نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں ڈال کے سگریٹ نکالا اور مجھے پیش کیا۔ "نہیں، میں تمباکو نہیں پیتا۔"

پہلے ہی تجربے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں اور طریقے سے زندگی بسر کرنی ہو گی۔ شکل و شباہت سے اُن میں کوئی معقول آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک ایک چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ میں اُن سب سے کم عمر تھا۔ نصیب میاں البتہ کچھ مختلف قسم کا شخص تھا، اُس کا رنگ گندمی تھا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اُس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی، بہت چہک چہک کے باتیں کرتا تھا۔ جس شخص کو میں نے مارا تھا، اُس کی عمر بھی چھتیس سال ہو گی، رنگ سانولا اور جسم فربہ تھا لیکن اُس کا قد میری طرح نکلا ہوا نہیں تھا۔ چہرے پر چاقو کے دو واضح نشانات موجود تھے۔ اُس کی مونچھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے اُس کا چہرہ ہیبت ناک ہو گیا تھا۔ بعد میں مجھے اُن کی گفتگو سے پتہ چلا کہ کالنتے کو فرش بوس کر دینا اُن کے نزدیک بڑے دل گردے کی بات تھی۔ خود کالنتے کا یہ حکم تھا کہ جب وہ کسی سے مقابلہ کر رہا ہو تو کوئی درمیان میں دخل دینے کی جرأت نہ کرے۔ سب حیرت زدہ تھے کہ میں کالنتے پر غالب کیسے آ گیا؟ وہ نہیں جانتے تھے کہ کالنتے میں وہ غصہ اور اشتعال نہیں تھا جو اُس نے مجھے دلا دیا تھا۔ اگر میں ٹھل کے ساتھ چند دن نہ گزار چکا ہوتا تو مجھے اُس پر ہاتھ اُٹھانے کی ہمت کبھی نہ ہوتی۔

ایک دن میں وہ مجھ سے خاصے مانوس ہو گئے حالانکہ میں نے اُن سے اپنے سلسلے میں بہت کم باتیں کی تھیں۔ میں رات بھر اپنی سوچوں میں گم رہا۔ دوسرے دن صبح تمام قیدی میدان میں لائے گئے اور انھیں مختلف کاموں پر لگا دیا گیا۔ میرے لیے یہ بات نئی تھی۔ میدان میں دوسرے بیرکوں کے قیدیوں سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ دو ایک قیدیوں نے مجھ سے گندا مذاق کیا اور کھلنے کی کوشش کی تو میں نے کالنتے والا تجربہ آزمایا۔ محافظوں نے سزا کے طور پر بیدوں سے میری کھال ادھیڑ دی لیکن میں نے بھی اُف تک نہیں کی۔

صرف دس دن میں ہر طرف یہ مشہور ہو چکا تھا کہ میں ہی وہ لڑکا ہوں جس نے کالنتے کو گرایا ہے اور میں اکٹھے تین قتل کر کے یہاں آیا ہوں۔ اُن میں مختلف چھوٹی بڑی سزاؤں کے قیدی تھے۔ مجھے سب سے پہلے زمین کھودنے کے کام پر لگایا گیا۔ صبح سے سہ پہر تک میں مٹی ایک جگہ سے کھود کے ڈلیا میں بھرتا اور دوسری طرف ڈال آتا۔ ذرا بھی غفلت ہوتی تو سنتری کا بید میری کمر پر پڑتا، دو دن میں میرے ہاتھ چھل گئے۔ میں یہ سمجھ کے اپنے ہاتھ دوسرے قیدیوں سے چھپاتا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑائیں گے۔ بوجھ اُٹھانے، پانی بھرنے اور مٹی کھودنے سے میرے جسم میں درد ہونے لگا اور ہر پر لمحے کورا کا چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔ کاش وہ مجھے ایک نظر دیکھ لیتی کہ میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ اُس سے بچھڑے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔

تیسرے دن صبح ہی صبح ایک سنتری نے بیرک میں مجھے ٹھل کا پیغام سنایا۔ ٹھل نے کہلوا کے بھیجا تھا کہ "لاڈلے کا خیال رکھنا۔"

"کون لاڈلا؟" نصیب میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ نیا لڑکا جو آیا ہے۔" سنتری نے میری طرف اشارہ کیا۔

کالنتے پہلی بار جوش میں میرے پاس آیا اور تیزی سے پوچھنے لگا "تم اُستاد ٹھل کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

اُس نے مجھے اُٹھا کے سینے سے لگا لیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا یار۔ اُستاد کا آدمی ہے۔ میں بھی تو کہوں یہ چھت سے اچانک کون ٹپک پڑا۔ اُستاد نے اس کے لیے پیغام بھیجا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہو گا۔"

"واہ لاڈلے میاں! تم نے بھی کیسا تکلف کیا۔" نصیب میاں نے بھڑک کے کہا۔ "ٹھل بھائی کا آدمی آئے اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ ہائے ٹھل بھائی جب سے وہ گئے ہیں، جیل کی رونق ہی چلی گئی۔ سنتری بھی اب منہ آنے لگے ہیں۔ اُن کی کیا بات ہے، جب آتے ہیں جیل کے در و دیوار کانپ جاتے ہیں۔"

"سنا ہے استاد اس مرتبہ کچھ گہرے ہی پھنس گئے ہیں؟" لیلا کی آواز بھی اُس کے نام کی طرح نسوانی تھی۔

"ہاں مگر انھیں یقین ہے کہ وہ چھوٹ جائیں گے کیونکہ اُن کا وکیل یہی کہتا ہے۔" میں نے بدیہے سے کہا۔ "اُن کا فیصلہ بس ہونے والا ہے۔"

"پھر وہ اِدھر ہی آئیں گے۔" نصیب میاں نے کہا۔

پہلے ہی دو چار واقعوں سے میں تمام قیدیوں کا مرکزِ نگاہ بن چکا تھا، اب ٹھل کے حکم نے کچھ اور اثر دکھایا۔ وہ سب میرے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ میں ایک مہینے کی قلیل مدت میں اس نئے ماحول کا عادی ہو گیا۔ صبح اُٹھنا، کام پر لگ جانا، شام کو بیرک میں رہزنی، ڈکیتی، اغوا، قتل، چوری اور جیب کاٹنے کے واقعات، شولی کا گانا اور نصیب میاں کے پھڑکتے ہوئے

شعر سنتا۔ ہر قیدی کے ساتھ ایک عجیب داستان وابستہ تھی نصیب میاں کسی زمانے میں لکھنؤ کے چھوٹے موٹے نواب تھے۔ پھر ایک حسین و جمیل طوائف پر عاشق ہوگئے اور ساری دولت لٹا بیٹھے اور بالکے بن کے اپنی محبوبہ کے کوچے کا طواف کرنے لگے۔ وہ طوائف لکھنؤ میں اُن سے محبت کا دعوا کرتی تھی مگر ایک آشنا کے ساتھ کلکتے بھاگ آئی نصیب میاں اپنا سب کچھ اُس پر لٹا چکے تھے، کلکتے میں اُسے مار کے ہی اُنھیں چین ملا۔ وکیل نے کوشش کر کرا کے اُن کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کروادی۔ یہ واقعہ سناتے وقت نصیب میاں کی آواز بھر بھرانے لگی تھی۔ وہ تصورات میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے، شولی اپنی پُرسوز آواز میں گانا گاکے انھیں جیل کی دنیا میں واپس لایا۔ جب بھی نصیب میاں ماضی میں جاتے، شولی یہی کرتا تھا اور وہ واپس آکے پھر ہنسنے بولنے لگتے تھے۔

ہل چلانا، مار کھانا، بوجھا ڈھونا، پانی بھرنا، چادریں، دریاں اور کھادی کے دوسرے کپڑے بنانا۔ جیل کے کارخانے میں مشقت کرانے کے کئی طریقے ایجاد کیے گئے تھے۔ اس چار دیواری میں صرف مرد رہتے تھے اور مرد بھی وہ تھے جو چار دیواری کے باہر علیحدہ پہچانے جاتے تھے، جگہ جگہ کے منتخب لوگ یہاں جمع تھے، کوئی ہمیشہ ہنستا رہتا تھا، کوئی ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ کوئی زمانے کو ہر بات انگوٹھے سے ٹھکراتا تھا، کوئی باہر کی دُنیا کی یاد میں گم رہتا تھا۔ سب کے چہرے ڈھلکے ہوئے تھے، آنکھیں اندر دھنسی جاتی تھیں، ہر طرف گندگی تھی، مچھر، کھٹمل، پسینہ، ناکافی ہوا، گرمی، سنتریوں کی گالیاں، قیدیوں کی باہمی لڑائیاں، بات بات پر تکرار، کبھی دال روٹی، کبھی چاول اور پتلی دال، ہفتے میں دو بار پانی کا شوربہ، بدبو، ہر سمت ایک سیلی ہوئی بُو، حبس، گھٹن۔ ایک مہینے میں جیل کے ماحول سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود مجھے بہت وحشت ہونے لگی۔ ایسی وحشت کہ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جب یہ سوچتا کہ مجھے ۱۴ سال تک اسی چار دیواری میں زندگی بسر کرنی ہوگی اور اس زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی تو میرے اعصاب جواب دینے لگتے تھے، میری یہ حالت دیکھ کے کانتے، جگتو، لیلا، شولی نصیب میاں اور دوسرے لوگ میرے گرد اکٹھے ہو جاتے اور فحش مذاق کر کر کے پوچھتے "کون یاد آرہا ہے لاڈلے؟ کچھ ہمیں بھی تو بتا یار!"

لاڈلا کیا بتاتا؟ لاڈلے کے تو سارے لاڈ ختم ہوگئے تھے۔ ایک ایسی ہی چار دیواری میں لاڈلے کا گھر کا تھا جس میں آزاد قیدی رہتے تھے۔ فہمیدہ رہتی تھی، شبو رہتی تھی۔ ایک امّی رہتی تھی، ایک ابا رہتے تھے، نہ جانے لاڈلے کے جی میں کیا آئی کہ ایک رات اُس نے سب کو اُس چار دیواری میں دفن کر دیا اور خود بھاگ کے چلا آیا۔ وہ سب اپنی اپنی کہانی سناتے تھے۔ میں نے اُنھیں کچھ نہیں بتایا تھا مجھے خوف تھا کہ پھر میرے پاس کچھ نہیں رہے

گا۔ میں تو خالی ہو جاؤں گا۔ جیسے کورا کو میرے سینے سے کوئی چُرا کے لے جائے گا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ جیل کی چار دیواری میں اُنھیں جو یہ میرا جسم نظر آتا ہے یہ تو ایک ڈھانچا ہے۔ اس کی جان تو باہر ہی بھٹک رہی ہے۔ اس کی روح تو کورا کو تلاش کر رہی ہے۔ کاش کورا کا کچھ نشان مل جائے، اب کچھ نہیں رہا، صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ ورنہ یہ سانس اٹکی رہے گی۔

ڈیڑھ مہینے بعد جیل کے پُرسکون سمندر میں جوار بھاٹا آگیا۔ معلوم ہوا کہ ٹھل آگیا ہے اور اس بار چار سال کے لمبے قیام کے لیے آیا ہے۔ اُس نے آتے ہی مجھے پوچھا اور مجھے دیکھ کے حیرت زدہ رہ گیا۔ "لاڈلے!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ڈیڑھ مہینے میں تجھے کیا ہوگیا؟ تیرا رنگ روپ کون چھین لے گیا؟" پھر وہ قیدیوں سے غصّے میں مخاطب ہوا۔ "کیا تمھیں میرا پیغام نہیں ملا تھا حرام کے جنو؟ اس کا کیا حال کر دیا ہے؟ کیا تمھیں سنتری نے نہیں بتایا تھا کہ یہ میرا لاڈلا ہے"۔

ٹھل کی گرج سے سب کانپنے لگے۔ نصیب میاں سب کے نمایندے کی حیثیت سے آگے بڑھے اور نیاز مندی سے بولے۔ "ٹھل بھائی! آپ کا حکم ملا تھا، خدا جانتا ہے، لاڈلے کا پورا خیال رکھا، ہم نے اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی، اسے کہانیاں سنائیں، اس کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ شولی نے اسے روز گانا سنایا مگر یہ روز بہ روز اداس اور خاموش ہوتا چلا گیا۔ اس نے ہم سے بات کرنی تقریباً بند کر دی ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے، کڑھتا رہتا ہے، نہ کسی سے کچھ کہتا ہے، نہ کسی کی سنتا ہے۔ ٹھل بھائی! بھلا آپ کا حکم ہو اور آپ کے جاں نثار اس کی تعمیل نہ کریں"۔

"تم نے اسے کام کیوں کرنے دیا کم بختو! تم نے اس کے ہاتھ نہیں دیکھے تھے؟ اس کا رنگ نہیں دیکھا تھا؟ تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا جو تم سب حرام زادوں سے الگ نظر آتا تھا" ٹھل گرجنے لگا۔ "تم نے میرے لاڈلے کو کیا سے کیا بنا دیا"۔

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب نے گردنیں جھکا لیں کیونکہ ٹھلّ سخت طیش میں تھا۔ اُس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بُلایا اور اپنے پہلو میں بٹھا کے کہنے لگا۔ "لاڈلے جانی! بڈّے نے اب کے دیر لگا دی۔ میں تو پہلے ہی آجاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھ پر کیا بیت رہی ہو گی۔ اب تو فکر کرنا چھوڑ دے۔ یہ جیل ضرور ہے مگر یہاں ٹھلّ موجود ہے۔ ٹھلّ کی موجودگی میں تو اداس ہوتا ہے شہزادے؟ اب ہنس دے۔ قسم خدا کی ہنس دے، ٹھلّ کو خوش کر دے۔" وہ مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "اتنا ہنس کہ آنسو نکل آئیں تیرے آنسو بھی تو ٹھیک سے نہیں نکلے ہیں پگلے ہنس ورنہ . . ."

میں نے بہ مشکل تمام اُس کے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کی ہنسنے کا چہرہ بنایا تو وہاں موجود سب لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ ٹھلّ بھی ہنسنے لگا۔ ٹھلّ کے آنے کے بعد جیسے جیل کا نظم و نسق تبدیل ہو گیا۔ ہر چیز میں باقاعدگی آگئی۔ لڑائی جھگڑے کم ہو گئے۔ ٹھلّ کے گروہ کے آدمی سگریٹ، پان اور کھانے کی دوسری چیزیں اُسے پہنچا دیتے تھے اور ٹھلّ انہیں سارے قیدیوں میں تقسیم کر کے پھر خود کھاتا تھا۔ اب میں برائے نام کام کرتا تھا۔ سنتری بھی ٹھلّ کی وجہ سے درگزر کرتے تھے لیکن چار مہینے کی یکسانی سے اُکتا کے میں نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں قیدیوں کو یہ پتہ لگ گیا تھا کہ میں تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتا ہوں۔ پہلے وہ اپنے خط نصیب میاں اور دوسرے معمولی پڑھے لکھے لوگوں سے لکھواتے تھے، اب اُن کا یہ کام میں کرنے لگا۔ ٹھلّ نے پہلوانی، چاقو زنی اور لٹھ بازی کے بہت سے داؤ مجھے سکھا دیے تھے۔ وہ کہتا تھا۔ "وہ آدمی مُردار ہے جو اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا۔ زندہ رہنے کے لیے جرأت ثابت کرنا پڑتا ہے لاڈلے!" ٹھلّ کے حکم سے سرتابی ناممکن تھی۔ اُس کے گروہ کے لوگ اور وہ لوگ بھی جو اُس کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، جیل میں شاگردوں کی طرح اُس کی اطاعت کرتے تھے۔ اُسے اُستاد مانتے تھے۔ اُن لوگوں نے بھی مجھے فنونِ حرب سے آراستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

ٹھلّ مجھے اپنے قریب ہی رکھتا تھا۔ اُس سے میری قربت کے باعث جیل میں ہر شخص میری بڑی عزت کرتا تھا۔ عزت کرتا تھا یا خوف زدہ تھا، کچھ بھی ہو مگر ٹھلّ کے آنے سے پہلے اور آنے کے بعد اُن کے رویّوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح چھ مہینے کٹ گئے۔ جب میں راتوں کو اچانک بے چین ہو جاتا اور اُٹھ اُٹھ کے بیرک میں ٹہلنے لگتا تو دوسرے قیدی ٹھلّ کو میرا احوال سُناتے اور وہ میری گردن پکڑ کے اصرار کرتا کہ "لاڈلے! گھُن لگ جائے گا، زنگ لگ جائے گا، اتنا مت گھُلا کر۔ دِق ہو جائے گی میری جان! مجھے بتا دے کہ تجھے کیا غم ہے؟ قسم ہے اپنے رب کی، ٹھلّ سات تہہ خانوں سے تیرے لیے خوشی لائے گا۔" ٹھلّ اسی قسم کے وعدے کرتا رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی کورا کی خبر نہیں لا سکتا۔ میرا دل اب بالکل نہیں لگتا تھا۔ دن اچھے گزرتے تھے پھر نہ جانے کیا ہو جاتا تھا۔ دیواروں سے سر پھوڑنے کو جی چاہتا تھا۔ میں کھانا جوں کا توں واپس کر دیتا تھا، پانی نہیں پیتا، راتوں کو جاگتا رہتا تھا، بہت سخت محنت کرتا تھا، دھوپ میں اپنے کو تپاتا رہتا تھا۔ ٹھلّ آ کے مجھے سمجھاتا، ڈانٹتا ڈپٹتا، جھڑکتا، گالیاں دیتا، پیار کرتا، میرے گالوں پر طمانچے مارتا، پھر سینے سے بھی لگا لیتا۔ ہر طرف ایک اندھیرا سا نظر آتا تھا۔ ایک دن بڈّا وکیل ٹھلّ سے ملنے آیا تو اُس نے مجھ سے پوچھا، مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ میں نے اُس سے کتابوں کی فرمائش کر دی۔ اگلی ملاقات میں بڈّا کتابیں لے آیا۔ قصّے کہانیوں کی کتابیں۔ کتابوں سے میرا دل خوب بہلا۔ ٹھلّ کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی اور اُس نے جیل میں اُس سے ملنے کے لیے آنے والے گروہ کے ہر شخص کو نئی نئی کتابیں لانے کا حکم دیا۔ میرے لیے یہ مشغلہ خاصا سود مند ثابت ہوا۔ ٹھلّ پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ کبھی کبھی رات کو مجھ سے فرمائش کرتا "لاڈلے! کوئی اچھی سی کہانی ہو تو ہمیں بھی سُنا۔" میں اُسے بلند آواز میں کہانی سنایا کرتا۔ بیرک کے دوسرے قیدی بھی دل چسپی سے کہانیاں سُنتے۔ جیل میں قیدیوں کو ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ پھر ایک دن بڈّے نے مجھ سے کہا کہ میں جیل میں اپنا تعلیمی سلسلہ کیوں نہ شروع کروں؟

"کیا ایسا ہو سکتا ہے۔؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ میں تمھیں اس کی اجازت دلوا دوں گا۔" بڈّے نے گرم جوشی سے کہا۔ حالانکہ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا اور فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا لیکن جیل میں میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ میں نے بڈّے سے جب یہ کہا کہ میں میٹرک کا امتحان دینا چاہتا ہوں تو وہ ہنسنے لگا۔ "میٹرک بہت اُونچی کلاس ہوتی ہے لاڈلے! ابھی مڈل کی سوچو۔"

"ٹھیک ہے مگر تم میٹرک ہی کی اجازت لو اور مجھے کتابیں لا کے دے دو۔"

"میٹرک مشکل ہوتا ہے لاڈلے میاں۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔"

بڈّے نے حامی بھر لی اور جیل کے حکام سے مجھے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت دلوا دی۔ اُس نے مجھے میٹرک کا پورا کورس بھی لا کے دے دیا جو میرے لیے بہت آسان تھا، پھر بھی میں شب و روز، جب بھی وقت ملتا، پڑھتا رہتا اور ٹھلّ میری ہمت بڑھاتا رہتا۔ سنتری بھی اس بات سے خوش تھے کہ میں عام قیدیوں کی صحبت میں بیٹھنے کے بجائے تعلیم کی طرف توجہ دے رہا ہوں اور میٹرک کی تیاری کر رہا ہوں۔ میں نے چار مہینے کی مسلسل محنت کے بعد امتحان دیا اور جب نتیجہ آیا تو جیل میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تھا۔ ٹھلّ کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا، وہ بار بار اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا۔ "دیکھا میرے لاڈلے کا کمال۔" وہ قیدیوں سے

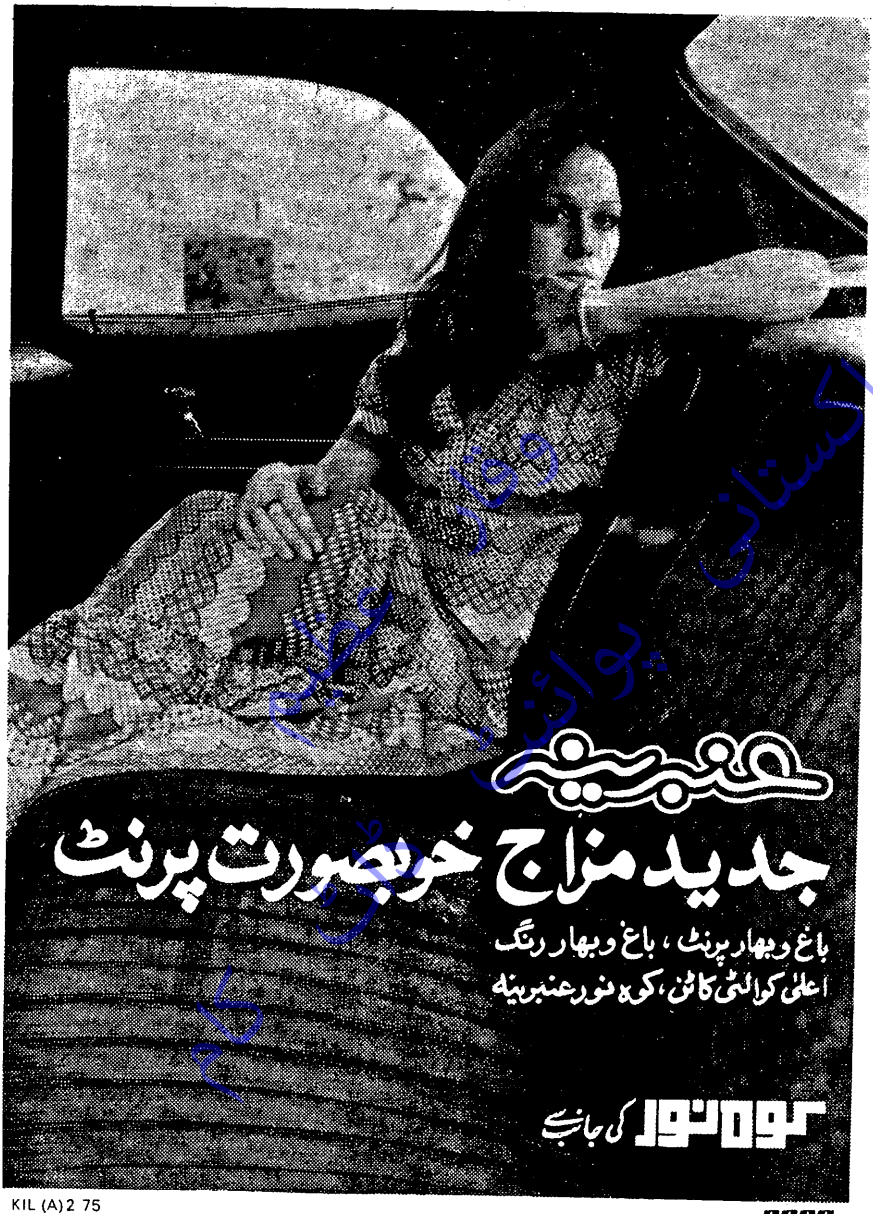

KIL (A) 2 75

SCAN

مخاطب ہو کے کہتا "یہ بُھلّن کا لاڈلا ہے کسی اور کا نہیں۔"

جیل میں ہر طرف سے قیدی مجھے دیکھنے آنے لگے۔ جن کے گھروں سے مٹھائیاں آتی تھیں، وہ انھوں نے بُھلّن کی خدمت میں پہنچا دیں اور اسے مبارکباد دینے لگے۔ بُھلّن چودھری بنا ہوا افتخار کے ساتھ مبارکبادیں قبول کرتا رہا۔ بڈّا وکیل بھی حیران تھا کہ میں نے پہلی ہی سیڑھی پر میٹرک کا امتحان کیسے دے دیا۔ "لاڈلے! تُو نے بُھلّن کا نام روشن کر دیا۔" وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے کہتا۔ "تو نے بُھلّن کے زندہ رہنے کا سامان کر دیا۔"

ادھر نصیب میاں سب سے کہتے پھرتے تھے "خدا کی قسم! جیل میں پہلا جی دار آدمی آیا ہے۔" بیرک میں سنتریوں کی اجازت سے ایک جشن منایا گیا۔ کالنتے اور دوسرے قیدیوں نے رقص کیا، شولی نے گانا گایا، طبلے کے طور پر تالیاں بجائی گئیں، منہ سے آوازیں نکالی گئیں اور انگلیاں چٹخائی گئیں۔ میں دولھا بنا ہوا درمیان میں بیٹھا تھا۔ بُھلّن کو اگربتیاں بہت پسند تھیں۔ اس موقع کے لیے خاص طور پر اگربتیاں منگوائی گئی تھیں۔ بُھلّن بار بار افسوس کا اظہار کرتا۔ "ہائے! میں باہر نہ ہوا ورنہ ایک ہفتے کا جشن مناتا۔"

جیل میں یہ بڑی بات تھی۔ اس رات تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم آزاد ہونے کی خوشیاں منا رہے ہیں اور یہ جیل نہیں ہے کلکتے کا کوئی محلّہ ہے۔ دوسرے دن ہی ہم واپس جیل آ گئے۔ کھیتی باڑی، وہی مشقتیں، چادریں اور دریاں بنانا اور سنتریوں کی ڈانٹ اور بید کھانا۔ وہی چاروں طرف اونچی دیواریں۔ تقریباً ہر قیدی کو سزا کے طور پر ایک یا دو ہفتے کے لیے تنگ و تاریک کھولی میں تنہا رکھا جاتا تھا۔ اس طرح اس کے اوسان ٹھکانے آ جاتے تھے اور وہ واپس آ کے پوری تن دہی سے محنت کرنے لگتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں ابھی تک اُس کوٹھری میں نہیں گیا تھا اور میرا مجموعی ریکارڈ نہایت اچھا جا رہا تھا۔ امتحان میں کامیابی کے بعد جیلر اور دوسرے حکام کی نگاہوں میں میرے لیے ایک نرمی آ گئی تھی۔ جب میں نے بُھلّن سے یہ کہا کہ میں آگے بھی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں تو اُس نے اپنا سینہ کھول دیا۔ "لاڈلے! میں بھی تجھ سے یہی کہنے والا تھا۔ تُو نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ اپنا بڈّا بھی کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ میں تجھے وکیل بناؤں گا، جب تک بڈّا مر چکا ہو گا۔ بھلا وکالت میں کتنے دن لگ جائیں گے لاڈلے؟"

"کوئی چھ سال۔" میں نے جواب دیا۔

"اُس وقت تک تو بڈّا ضرور زندہ رہے گا مگر اسے مال پانی زیادہ دینا پڑے گا۔ سالے کی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔"

"تو تم راضی ہو؟" میں نے جوش سے کہا۔

"میں راضی، میرا خدا راضی لاڈلے!"

ایک سال بعد میں نے فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کر لیا اور دوسرے سال ابھی میں امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ بُھلّن کی سزا کے دن پورے ہو گئے۔ جیل میں اُداسی سی چھا گئی۔ اس درمیان کئی نئے قیدی آئے، کچھ چھوٹ گئے، کالنتے ایک بار باہر جا کے چھ مہینے بعد پھر اندر آ گیا۔ بُھلّن نے اُسے مار مار کے ادھ مُوا کر دیا۔ اُس نے کوئی غلط داؤ لگا دیا تھا۔ رخصت کے وقت بُھلّن نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اُس کی عدم موجودگی میں اُداس نہیں ہوں گا اور مسلسل پڑھتا رہوں گا۔ اُس نے تمام قیدیوں کو حکم دیا کہ وہ میرا خاص خیال رکھیں۔ اگر کسی سے ذرا بھی شکایت ہوئی تو اُس کے باہر آنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا، جیل کے اندر ہی سزا دی جائے گی۔ بُھلّن کے جانے کے بعد جیل کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی سرپرست درمیان سے اٹھ گیا ہو۔ نصیب میاں اُس کی نمائندگی ضرور کرتا تھا مگر اُس کا لہجہ اور انداز بانکوں کے سے تھے۔ اُس میں وہ گھن گرج نہیں تھی جو بُھلّن میں تھی۔ دو سال میں میرے بازو خاصے مضبوط ہو گئے تھے اور قد پہاڑ کی طرح نکل آیا تھا۔ داڑھی کے بھورے بھورے بال اُبھرنے لگے تھے اور مَسوں کی جگہ مونچھوں نے لے لی تھی۔ میں نے ایف اے کا امتحان دیا اور ساری جیل، جیلر اور پولیس کے دوسرے حکام کو چونکا دیا، میں پھر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔

بُھلّن ہفتے میں ایک بار ضرور مجھ سے ملنے آتا تھا۔ یہ خبر سُن کے وہ باقاعدہ جیل میں آ گیا۔ اُس نے خود کو چوری کے الزام میں گرفتار کرا لیا تھا۔ اُسے تین مہینے کی سزا ہوئی۔ ڈیڑھ دو ماہ گزارنے کے بعد وہ پھر واپس چلا گیا اور میں اپنی تعلیم میں مصروف ہو گیا۔

میرا کام بہت آسان کر دیا گیا تھا۔ ایف اے میں میری کامیابی کے بعد جیلر کا رویّہ بھی بدل گیا تھا۔ اُس نے مجھے کلرکی کا کام سونپ دیا۔ وہ جیل میں آنے والے پولیس کے حکام کے سامنے مجھے فخر سے پیش کرتا تھا۔ دوپہر کو وہ مجھے دفتر میں بُلا کے اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا کھلاتا تھا۔ بی اے کے پہلے سال میری مارکس شیٹ دیکھ کے وہ پہلے تو دنگ رہ گیا پھر ایسا جوش میں آیا کہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ بہت دنوں بعد میں نے ایک گھر دیکھا، وہی بستر، وہی الماریاں، وہی آنگن، وہی گلاس اور سگھڑا، سب کچھ وہی تھا جو میرے گھر میں تھا۔ مرچ مسالوں اور کپڑوں کی خوش بو سارے گھر میں رچی ہوئی تھی۔ جب بھی گھر کا خیال آتا، میں سر جھٹک کے اُسے کوڑے میں پھینک دیتا، یہ کوڑا خود میرے جسم کے اندر رہتا، ایک ملبا اندر جمع ہو گیا تھا۔ یہاں آ کے میرا جی گھبرانے لگا۔ جیلر ساتھ نہ ہوتا تو میں بھاگ جاتا۔ اُس نے مجھے اپنی بیوی سے ملایا۔ "یہ ہے وہ قیدی، لاڈلا! اِس کا نام ظہیر خاں ہے مگر جیل میں سب اسے لاڈلا کہتے ہیں۔"

میں نے گھبرا کے اُسے سلام کیا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی حیرت تھی جو چڑیا گھر میں ریچھ دیکھ کے بچّوں کو ہوتی ہے۔ ریچھ نے سلام کیا، لہٰذا اُس کا ڈرنا اور سہمنا لازم تھا۔ اُسے جیلر نے ضرور بتایا ہو گا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون قرض ہے جو میں یہ سخت سزا کاٹ کے اُتار رہا ہوں۔

سلام کا جواب اُس نے ہچکچاہٹ سے دیا۔ وہ سُرمئی رنگ کی ایک ۴۵، ۴۶ سال کی عورت تھی۔ "بیٹھ جاؤ" اُس کے حکم میں کچھ خوف شامل تھا۔ میں نے کچھ تامل کیا مگر جیلر نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ "یہ ایک نیا آدمی بن کے جیل سے جائے گا۔" وہ افتخار سے بولا۔ "لاڈلے کا ریکارڈ بھی اچھا ہے۔ میں اسے جلد سے جلد رہا کرانے کی کوشش کروں گا۔ بچے کہاں ہیں؟"

عورت ونددیدہ اور مشتاق نگاہ سے مجھے دیکھ رہی تھی اور مجھے یہ سب نیا اور حیرت انگیز لگ رہا تھا۔ کسی عورت کو دیکھے یا اُس سے بات کیے ہوئے ایک مدت گزر گئی تھی۔ جیل کی کڑی سزاؤں میں سب سے سخت سزا یہی ہے کہ مرد عورتوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ اپنی ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے وہ باہر چلی گئی اور چند لمحوں بعد واپس آئی تو اُس کے ساتھ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ اُن میں سب سے بڑی لڑکی کا رنگ سونے کا تھا۔ دوسری کی عمر کورا کے برابر ہوگی۔ وہ استری کے بغیر کپڑے کی طرح رسّی پر لٹکی ہوئی تھی۔ لیکن بڑی لڑکی ایک مکلف استری کی ہوئی لڑکی تھی۔ تیکھے نقش، نگار بدن کا ہر حصّہ قرینے اور سلیقے سے اپنی جگہ رکھا ہوا تھا۔ متناسب، بے داغ، متوازن اور توانا۔ لڑکا سب سے چھوٹا تھا۔ "لاڈلے یہ ہے میری بڑی بیٹی سونیا۔" جیلر نے کہا۔ "ایف اے کے آخری سال میں ہے اور یہ ہے چھوٹی نٹ کھٹ بلو۔ بملا، پڑھنے میں اس کا جی بالکل نہیں لگتا۔ یہ ابھی تک آٹھویں میں ہے اور یہ لڑکا ونود چھٹی کلاس میں پڑھتا ہے۔ چلو بھئی سب نمسکار کرو لاڈلے کو۔" سب نے ایک ساتھ ہاتھ جوڑ لیے مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آج وہ کسی قاتل کو پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ وہ سب گنگ تھے۔ "ارے تم سب خاموش کیوں ہو؟" جیلر نے ناراضی سے کہا۔ "لاڈلے سے باتیں کرو، یہ بہت اچھا لڑکا ہے۔"

بڑی مشکل سے سونیا کے لب کھلے اور اُس نے مجھ سے بی اے میں میرے مضامین کے بارے میں پوچھا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور پسینہ سا آ رہا تھا۔ اُس کی آواز سُریلی تھی۔ کورا کی آواز میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ وہ اسی طرح ٹھہر ٹھہر کے، سنبھل سنبھل کے بولتی تھی۔ کورا اب سونیا کے مانند بڑی ہو گئی ہوگی اور بڑی ہو کے وہ کیسی عظیم الشان لڑکی بن گئی ہوگی۔ وہ تو قلوپطرہ کی طرح حسین ہو گی، میں تصوّر میں اُس کے خاکے بناتا تھا۔ میری کسمساہٹ، کم گوئی اور گریز سے اُن کی جھجک کچھ دُور ہوئی اور وہ سب مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ میرا گھر کہاں ہے؟ میری ماں کیسی ہیں؟ میرے کتنے بہن بھائی ہیں؟ جیلر نے انھیں مجھ سے ایسی باتیں پوچھنے سے منع کیا۔ آدمی کو گھر کی قیمت کا پتہ جیل میں چلتا ہے۔ جیلیں شاید اسی لیے بنائی گئی ہیں کہ لوگ گھروں اور گھر والوں کی قدر و منزلت سے آشنا ہو سکیں، نصیب میاں کہتا تھا کہ بیوی کی اہمیت کا اندازہ طوائف کے پاس جا کے ہوتا ہے۔ اُنھوں نے مجھے انناس کا شربت پلایا اور بڑی ہمدردی اور محبت سے باتیں کیں۔ منہ ایسی غذائیں کھانے اور کان ایسی باتیں سُننے سے ناآشنا ہو گئے تھے، میں نے اُن کا شکریہ ادا کر کے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہا لیکن جیلر نے روک لیا۔ جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ میں ایک قاتل اور قیدی کے علاوہ ایک انسان بھی ہوں، تب کہیں اُن کا خوف دُور ہوا اور اُنھوں نے آہستہ آہستہ مجھ میں دلچسپی لینی شروع کی۔ سونیا نے سب سے زیادہ باتیں کیں۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے میں آزاد ہو گیا ہوں اور کورا کے سامنے سے باتیں کر رہا ہوں لیکن میں پھر قید ہو گیا۔ اپنی بیرک میں آ کے میں خاموش لیٹا رہا۔ نصیب میاں مجھے چھیڑتا رہا۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ کچھ ایسا لگتا رہا کہ کسی نے جسم کو دیا سلائی لگا دی ہے اور وہ بھڑک اُٹھا ہے اور کسی نے پھونک مار کے دبی ہوئی آگ کو ہوا دے دی ہے۔

"یہ سُرخی ہے۔" نصیب میاں نے میری آنکھیں دیکھ کر کہا۔ "میں اسے خوب جانتا ہوں لاڈلے صاحب! یہ کب اُبھرتی ہے۔ خدا کی قسم آپ کو دیکھ کے بڑی تسلی ہوتی ہے کہ جوانی کے دن ضائع نہیں گئے۔ جو کچھ ہو گیا، وہ تو خیر ہو گیا پر کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی۔ یقین کرنا، اس عمر میں نظریں ٹھہرتی ہی نہیں تھیں۔ صبح کچھ اور رنگ ہوتا تھا، شام کو کچھ اور۔ جسم میں انگارے سے بھرے ہوتے تھے اور اُس آگ میں ایسا لطف آتا تھا کہ ہر وقت جلتے رہنے کو جی چاہتا تھا، لاڈلے میاں! ہم پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی اور ہم نے بھی ٹوٹ کر اُس سے پیار کیا تھا۔"

♠

نصیب میاں کی باتیں آج بہت دل کو لگیں۔ کچھ مجھے بھی ایسی چنگاریاں اُبھرتی محسوس ہوتی تھیں لیکن میں نے کتابوں کے بوجھ سے اُنھیں دبا دیا تھا۔ جیلر نے مجھے اپنے گھر بلا کے بہت بُرا کیا۔ میں رات کو پھر سلاخوں سے باہر سناٹا تکتا رہا اور اپنا بکھرا ہوا جسم سمیٹنے کی کوشش کرتا رہا۔ رات بھر میں کورا کے حصار میں رہا۔ وہ کبھی اِدھر سے، کبھی اُدھر سے، کبھی اِس طرف سے، کبھی اُس طرف سے آتی رہی۔ میں سلاخوں سے اپنا سر پھوڑنے اور چیخنے لگا۔ بیرک کے سارے قیدی جاگ گئے۔ نصیب میاں مجھے اپنے دامن سے ہوا دینے لگا۔ پھر جیلر کے گھر میں میری آمد و رفت بڑھ گئی اور سونیا مجھ سے اپنے مضامین اور کتابوں کے بارے میں مشورے کرنے لگی۔ یہ دیکھ کے جیلر نے مجھ سے سونیا کو پڑھانے کی باقاعدہ فرمائش کر دی۔ میں روزانہ دو گھنٹے اُس کے گھر میں بیٹھا سونیا کو پڑھاتا رہتا۔ سارے گھر والے میرا احترام کرنے لگے۔ یہ احترام رفتہ رفتہ ایسے تعلق میں بدل گیا جو عزیزوں کو عزیزوں سے ہوتا ہے۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی اور بی اے میں آ گئی۔ میں نے بی اے میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔

سنجیدہ، متین اور حسین سونیا بڑے انہماک سے پڑھتی تھی۔ ہم دونوں میں تعلیمی موضوعات کے سوا، دوسری باتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ میں جب دوپہر کو وہاں جاتا تو وہ کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوتی اور جب میں واپس ہوتا تو وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی۔ میں روز اُس کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے میری نظریں ٹکرا جاتیں تو وہ کچھ لرز کے اپنی لانبی اور گھنی پلکیں جھکا لیتی۔ اُس کی متانت میں ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی مگر وہ فوراً اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔

پڑھنے میں تو بہت آسان معلوم ہو رہا ہے۔

شروع شروع میں سونیا کی ماں بھی ہم دونوں سے کچھ دور بیٹھی اپنا کام کرتی رہتی تھی، پھر اُس نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

میں ڈیڑھ سال تک بلاناغہ وہاں جاتا رہا۔ اب میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ ٹھل کو بھی معلوم تھا کہ میں وکالت کا امتحان دے رہا ہوں۔ وہ چھوٹی موٹی چوریاں کر کے ایک ایک دو دو مہینے کے لیے میرے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔ میں جیل میں جس طرف سے بھی گزر جاتا، لوگ میرا حال پوچھتے، سلام کرتے ہر طرف لاڈلے میاں، لاڈلے صاحب کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جس دن نصیب میاں کو رہائی ملی، وہ میرے گلے لگ کے بہت رویا۔ "میں باہر آپ کا انتظار کروں گا لاڈلے صاحب۔" وہ جو ہر وقت شوخیاں کرتا اور ٹھل جھڑپتا رہتا تھا، مجھ سے رخصت ہوتے وقت بہت اُداس تھا۔ جیل کے بہت سے ساتھی چلے گئے لیکن یہ تو جیل تھی، قیدیوں کا بازار۔ جیل کی دُکان ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ آنے والوں کو اس کے دروازے کبھی مایوس نہیں کرتے مگر واپسی کے لیے یہی دروازے بڑے تنگ ہو جاتے ہیں۔

نصیب میاں بھی چلا گیا اور اُس کے جانے سے جیل خالی خالی معلوم ہونے لگی۔ نئے پنچھی آ گئے۔ پرانے قیدیوں میں میرے سوا چند ہی قیدی اور رہ گئے تھے۔ ساڑھے چار سال گزر گئے اور ایک دن سونیا نے مجھ سے کہا کہ جیلر کا تبادلہ ہو گیا ہے اور اب وہ لوگ جلد ہی یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔ یہ خبر سناتے ہوئے سونیا کی آواز بھرا رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میری زبان کو تالا لگ گیا۔ میں نے اپنی ریگ زار آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ اُس کی گھنیری پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ میرا دل سُن ہو گیا۔

"ہم یہاں سے شہر چلے جائیں گے۔ پتا جی کہہ رہے تھے کہ آپ کی سزا کے دن پورے ہونے والے ہیں۔" اُس نے اُنگلیوں سے اپنے دراز گیسوؤں کے لچھے بناتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "آپ وہاں تو آئیں گے نا؟"

"ہاں۔" میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

"آپ سیدھے وہیں آئیے گا؟" اُس نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" میں اُس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکا۔

"یہاں سے چھوٹنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں معلوم۔" میں نے سرد آہ بھر کے جواب دیا۔

"پتا جی کہتے تھے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے۔ وہ آپ کا بہت ذکر کرتے ہیں، آپ۔ آپ آئیں گے نا؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"آپ کب جائیں گی؟" میں نے اپنی آواز مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

"تین چار روز میں۔" اُس نے اُداسی سے جواب دیا۔

ہم دونوں دیر تک چُپ بیٹھے رہے۔ نہ کوئی سوال، نہ کوئی جواب۔ اُس کی ماں نے آ کے ہمیں چونکا دیا۔ سونیا نے ہڑبڑا کر آنسو خشک کیے اور کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُس کی ماں میرا حال پوچھتی رہی۔ صبا وصبد کا حال پوچھ رہا تھا۔

پُرانا جیلر چلا گیا، نیا جیلر آ گیا۔ نیا جیلر بہت درشت آدمی تھا۔ اُس کے آنے کے بعد جیل میں سخت احکام جاری ہوتے۔ قیدیوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بید، ہنٹر، کوڑے برسنے لگے۔ حالانکہ میرے متعلق پُرانا جیلر اُس سے سفارش کر گیا تھا اور میرا سابقہ ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا مگر وہ آدمی طبیعت کا جلاد تھا۔ جیل کے لیے انتہائی موزوں۔ ٹھل کے گروہ کے لوگوں کا بھی اُس نے ناطقہ بند کر دیا۔ قیدیوں کو بیرک کے باہر ٹہلنے پھرنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ مجھ سے کلرکی کا کام چھین لیا گیا اور مجھے دوبارہ مشقت پر لگا دیا گیا۔ دن میں کئی وقت جیل کے حکام معائنے کے لیے آتے اور نئے نئے احکام صادر کر کے چلے جاتے۔

ٹھل، شرلی، کانتے، جگو، بیلا، سارنگ، نصیب میاں اور بہت سے دوسرے ساتھیوں کے جانے سے جیل یوں بھی اُجڑ گئی تھی۔ نیا جیلر آ گیا تھا۔ سارا نقشہ پلٹ گیا۔ پھر سونیا بھی چلی گئی۔ جیل میں جو چند گھنٹے آزادی کے مل جاتے تھے، وہ بھی ختم ہو گئے۔ گھر گیا، گور اگئی، سب چلا جائے، یہ جو کچھ باقی ہے یہ بھی کیوں رہے۔ مجھے بعض اوقات خود پر حیرت ہوتی کہ میں کیوں باقی ہوں؟ میرے باقی رہنے کی اب کون سی ضرورت ہے؟

جیل میں سختی کے اُس زمانے میں ایک نیا قیدی داخل ہوا۔ وہ مجھے بیرک کے باہر نظر آیا تھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا لیکن وہ مجھے شناخت نہیں کر پایا کیونکہ میرا قد اونٹ کی طرح لمبا اور جسم گھوڑے کی طرح پھیل گیا تھا۔ میرے گالوں پر بھوری سی داڑھی تھی اور مونچھوں سے چہرہ اور بھی بدل گیا تھا۔ سنتریوں کا پہرا سخت تھا مگر میں اُس کے قریب پہنچ گیا اور جاتے ہی میں نے اُس کی گردن پکڑ لی۔ وہ فوراً گر پڑا۔ میں اُس پر چڑھ کے اُس کا نرخرا دبانے لگا۔ سنتریوں اور دوسرے قیدیوں نے اُسے میرے پنجے سے نجات دلائی۔ سب حیران تھے کہ آج یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اُسے دیکھ کے میری

آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا، میرے غیظ و غضب کی ایسی کیفیت قیدیوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کئی آدمیوں نے مجھے پکڑا لیکن میں اُن سب سے آزاد ہو کے اُس پر پل پڑا، وہ میری گرفت میں آتے آتے رہ گیا اور میدان میں اِدھر اُدھر بھاگنے اور شور مچانے لگا۔ پیچھے پیچھے سنتری دوڑ رہے تھے، انھوں نے سنگینیں تان لی تھیں مگر وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ ”میں تمھیں پہچان گیا ہوں مجھے معاف کر دو ــ مجھے معاف کر دو۔“ اُس نے گھگیا گھگیا کر کہا۔ ”تمھیں اپنی ماں اور بہن کی قسم، مجھے معاف کر دو۔“

میں نے اپنے مضبوط پیروں سے اِس پر ٹھوکر ماری۔ ”میں تجھے نہیں چھوڑوں گا کمینے!“ میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ سنتریوں نے مجھے پکڑ لیا تھا اس کے باوجود وہ میرے پیروں پر سر رکھ کے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔

وہ کریم گل تھا، وہ ظالم کریم گل جس نے اپنی چچی کے ساتھ مل کر کورا کو بیچنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سنتری مجھے پکڑ نہ لیتے تو میں وہیں اُس کا کام تمام کر دیتا۔

”وہ کہاں ہے؟“ میری گرج سے وہ لرز لرز گیا۔

”کون؟“ اس کی کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

”وہی، جسے تو، چچی بی اور اس حرام زادے کے ہاتھوں فروخت کر دینا چاہتا تھا کمینے! مجھے بتا دے وہ کہاں ہے؟ ورنہ میں تجھے یہیں زندہ دفن کر دوں گا۔“

”خدا کی قسم، مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ وہ عاجزی سے بولا۔

سنتری مجھے پکڑ کے ایک طرف لے گئے، کچھ میرے پرانے ریکارڈ کا اثر تھا کہ انھوں نے صرف تنبیہ کر کے مجھے چھوڑ دیا لیکن جیسے ہی میں اُن کی گرفت سے آزاد ہوا، میں نے کریم گل کی گردن دبوچ لی۔ ”مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔“ سنتریوں نے مجھے دوبارہ پکڑ کے جیلر کی خدمت میں پیش کر دیا اور جیلر نے کسی تاخیر کے بغیر مجھے ایک ہفتے کی قیدِ تنہائی سے نواز دیا۔ مجھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ سزا کاٹنے کے بعد جب میں اپنی بیرک میں واپس آیا تو وہاں بٹھل پہلے سے موجود تھا۔ ”لاڈلے!“ اُس نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ”جانی! یہ تجھے کیا ہو گیا؟ کہ تو اب پڑھ لکھ گیا ہے۔ تیرا حال سن کے مجھے فوراً یہاں آنا پڑا۔“ میری خاموشی پر اُس نے بتایا کہ اسے کریم گل کی زبانی سارا حال معلوم ہو گیا ہے۔ ”کون تھی وہ لاڈلے؟ تیرے لیے تو میں آسمان سے پری اتار لاؤں گا۔ جیلوں میں آدھے سے زیادہ قیدی عورتوں کی وجہ سے آتے ہیں، تو نے بہت چھپایا، لاڈلے! مجھے بتا تو سہی وہ کون تھی اور کہاں ہے؟“

”مجھے کیا معلوم کہ وہ اب کہاں ہے؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”تو اتنی عمر میں اُسے کہاں سے لایا تھا اور تیرا ارادہ کیا تھا؟ کیا تو پاگل ہو گیا تھا؟“

”مجھ سے کچھ مت بولو۔“ میں نے اشتعال میں کہا۔

بہن! تم ہولڈ کرو میں ذرا جارج کے لیے کھانا لگا آؤں۔

”میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں لاڈلے!“ وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ”تیرے ساتھ کیا گزری ہے؟ پر وہ کہتا ہے کہ اس نے بُری نیت ضرور کی تھی مگر اس کے بعد اُسے کچھ نہیں معلوم۔“

”جھوٹ بکتا ہے۔“

”وہ جھوٹ نہیں بول سکتا، یہاں اُس کی میرے مُریدوں نے جس طرح خاطر کی ہے، اُس میں آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

بٹھل کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک رات بیرک میں اُس کے آدمیوں نے ایک ساتھ اسے اتنا مارا کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ بیرک کے سارے قیدیوں کو سزائیں ملیں، اُن کی کمر ننگی کر کے کوڑے برسائے گئے مگر انھوں نے اُف تک نہیں کی، انھوں نے میرا انتقام لے لیا تھا۔ بٹھل نے اُسے میرے پیروں پر لا ڈالا۔ کریم گل نے اعتراف کر لیا تھا کہ میرے ہوٹل سے فرار ہونے کے بعد اُس کے آدمیوں نے ٹیکسی میں میرا تعاقب کیا تھا چونکہ اُسے یقین تھا کہ کورا میری بہن نہیں ہے لیکن راستے میں ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کیا۔

پھر وہ کون لوگ تھے، جو ہمارا پیچھا کرتے کرتے دریا کے کنارے تک پہنچ گئے؟ کریم گل اس سے زیادہ نہیں بتا سکا، وہ اب بھی ایک لڑکی کے اغوا کے جرم میں سزا کاٹنے آیا تھا۔ یقیناً وہ کوئی اور لوگ تھے جو ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ممکن ہے وہ ٹیکسی والا ہی مشکوک ہو گیا ہو، ممکن ہے وہ چچی بی اور اُس کے شوہر کے زر خرید غنڈے ہوں، کریم گل نے بتایا کہ ہوٹل والوں کو یہ خبر ہو گئی تھی کہ میں نے دو بدمعاشوں اور ایک کانسٹیبل کو قتل کر دیا ہے مگر اُنھوں نے میرے بارے میں پولیس کو کچھ بتانے کے بجائے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی کیونکہ اس طرح اُن کا ہوٹل بدنام ہونے اور پولیس کی نظروں میں آنے کا خدشہ بھی تھا۔ بٹھل دو مہینے کی سزا کاٹنے کے بعد مجھے سمجھا بجھا کے باہر چلا گیا۔ کریم گل اب دن رات میری خدمت میں لگا رہتا تھا، کبھی وہ میرے

پاؤں دباتا اور سر کی مالش کرنے لگتا، یا کبھی میرے قریب بیٹھ کے مجھے تکتا رہتا، میں نے بڑی مشکل سے اسے جھڑک کے اپنا پیچھا چھڑایا۔

کریم گل کے واقعے سے جیل کے حکام کی نظروں میں میری جو ساکھ خراب ہو گئی تھی، وہ ایم اے سال اوّل کے امتحان میں کامیابی کے بعد کچھ بحال ہو گئی۔ نیا جیلر بھی احکام دیتے دیتے تھک گیا تھا، جیل کا پہیا پھر اپنی رفتار سے چلنے لگا، قیدی آتے رہے اور اپنے جرائم کا جزیہ ادا کر کے واپس جاتے رہے۔ چھ سال میں جیل کے اندر میں نے رنگ رنگ کے چہرے دیکھے۔ جیل میں بھی درجے ہوتے ہیں، چھوٹا قیدی، بڑا قیدی، کمزور قیدی، طاقت ور قیدی، کالا قیدی، گورا قیدی۔ بٹھل اور اس کے آدمیوں نے مجھے جیل میں رہنے کا سلیقہ سکھایا۔

جیل کے باہر بھی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور جیل کے اندر بھی، کتابوں سے زیادہ میں نے اُن سے پڑھا اور اُن سے زیادہ خود سے پڑھا کہ میں اتنی طویل مدت کے بعد بھی "خود" کو نہ بھلا سکا۔ میرا "خود" میری کوراتھی۔ ان چھ سال میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا جب وہ مجھ سے دُور رہی ہو۔ میں جیل میں قید تھا، وہ میرے سینے میں قید تھی۔

میں ایم اے کے دوسرے سال کی تیاری کر رہا تھا کہ جیل میں ایک نیا قیدی وارد ہوا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک تنومند شخص تھا۔ اس کے چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی۔ وہ نہ کسی سے بات کرتا تھا، نہ کسی کی سنتا تھا، بس خاموش اور اُداس رہتا تھا، اپنے آپ میں گم۔ جو میرا حال تھا، وہی اس کا تھا۔ یہی بات مجھے اُس کے قریب لے گئی لیکن وہ میری طرح اپنا غم راز نہ رکھ سکا۔ اس نے اچھا ہی کیا، جیل میں ویسے بھی لُٹ پٹ کے سارے غم گڈمڈ ہو جاتے ہیں، وقت کی دھول اُن پر جم جاتی ہے۔ جس نے اپنے غم کا اظہار کر دیا، اس نے اسے ننگا کر دیا۔

میں نے اسے باہر ہی نہیں نکالا تھا کیونکہ وہ مجھے بہت عزیز تھا۔ نوجوان قتیل میری باتوں میں آ گیا۔ وہ بنارس کا گریجویٹ تھا اور اپنے مختصر خاندان کا واحد کفیل۔ وہ روزی کی تلاش میں کلکتے آ گیا تھا کہ ایک دن اس کی بڑی بہن ہگلی میں ڈوب گئی کیونکہ اُسے سوشیل کے ایک امیر دوست نے دھوکا دیا تھا۔ وہ غیرت مند لڑکی، جس نے اپنا سب کچھ اپنے بھائی کے عزیز دوست کے حوالے کر دیا تھا، اس صدمے کی تاب نہ لا سکی۔ سوشیل نے اپنے دوست کو قتل کر دیا لیکن قتل کرتے وقت اُس نے اپنی بوڑھی ماں، دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کے متعلق نہیں سوچا، اگر وہ انھیں ختم کر کے دوست کو قتل کرتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ وکیل نے اُسے پھانسی سے بچا لیا مگر سزا سے نہیں بچا سکا، اب کلکتے میں اس کا خاندان فاقے کر رہا تھا اور وہ جیل میں تھا۔

میں نے بٹھل سے کہہ کے اس کے خاندان کے لیے گزارے کا انتظام کرا دیا۔ سوشیل نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ ایک صبح بیرک میں اس کی لاش پائی گئی۔ وہ شدتِ غم سے مر گیا تھا۔ اس اعتبار سے وہ مجھ سے زیادہ غیرت مند ثابت ہوا، اُس نے مجھے شکست دے دی، مجھے مات دے کے چلا گیا۔

ساتویں سال جب میں فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کا امتحان پاس کر چکا تھا تو ایک دن مجھے جیلر نے طلب کیا اور آزادی کا مژدہ سنایا۔ مجھے یقین نہیں آیا، یہ تو صحیح تھا کہ اس سال کے اختتام پر شب و روز ملا کے میری سزا مکمل ہونے والی تھی لیکن اس قدر جلدی اور اچانک یہ پروانہ آ جائے گا، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے پڑھا اور آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے، جیلر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے نصیحتیں کر رہا تھا، مجھے اس کی کوئی بات یاد نہیں۔ اس خبر سے میرے اعصاب جواب دے گئے۔ رگ و پے میں جیسے برف گھل گئی۔

میں نے بیرک میں آ کے کسی کو نہیں بتایا کہ اب میں اُن سے بچھڑنے والا ہوں، یہ خبر بٹھل تک ضرور پہنچ جاتی اور وہ ایک جلوس کی شکل میں فرار ہے پر میرا استقبال کرتا، میں ساری رات بیرک میں ٹہلتا رہا اور صبح آٹھ بجے جیلر کے دفتر میں حاضر ہو گیا۔ اُس نے میری خون آلود شیروانی، کرتا، پاجامہ اور سات سال پرانے نوٹ، جو میری جیب سے برآمد ہوئے تھے، واپس کر دیے اور میری مالا بھی میرے سپرد کر دی۔ میں نے جیلر کے سامنے بے اختیار ہو کے اسے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اب پرانا لباس میرے جسم پر نہیں آ سکتا تھا۔ اُس سخت مزاج جیلر نے میری مجبوری محسوس کر لی اور اپنا کرتا پاجامہ مجھے دے دیا، پھر اُس نے میری کمر تھپتھپائی، میری ناک پکڑی اور مجھے اپنے دفتر کے دروازے پر رخصت کرنے آیا۔ "میں نے تمہارا چاقو واپس نہیں کیا ہے اس لیے کہ اب تمھیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اُس نے مسکرا کے کہا۔

"جناب۔۔۔" مجھ سے کچھ کہا نہ جا سکا۔

"جاؤ، میں دوبارہ تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"جناب۔۔۔" میں نے بے تابی سے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

سنتریوں نے مجھے جیل کے خاص دروازے تک پہنچا دیا۔

بازیگر

ایک شخص کی ناقابلِ فراموش سرگزشت

آنسوؤں، آہوں، اُمنگوں اور حوصلوں کی داستان

بابر زماں خان کی آپ بیتی ۔ جگ بیتی

باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

سنجیدہ، غیر سنجیدہ وقت کے لیے
دُنیا بھر سے اِدھر اُدھر سے پانچ
مختصر ترین مختصر کہانیاں

پال لیکس * اظہر کلیم

دکانداروں اور چوروں کے لیے
لیکن جو ان دونوں پیشوں سے وابستہ نہیں ہیں
وہ بھی اس تحریر سے
لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

زیورات کی یہ دُکان نقب زنوں اور ڈاکوؤں کی زد سے محفوظ تھی۔ اس کا مالک ہنری اکثر حیران ہوتا تھا کہ آخر اس پر ڈاکوؤں نے توجہ کیوں نہیں دی۔ دُکان کے سامنے ایک بس اسٹاپ تھا شاید اسی وجہ سے بُری نظر رکھنے والے لوگ اِدھر آنے سے کتراتے تھے۔ بس اسٹاپ پر مسافروں کی لمبی قطاریں رہتی تھیں نیز ہنری کا معاون دن بھر دُکان میں موجود رہتا تھا ہنری کو یقین تھا کہ دن کے وقت ڈکیتی کی کوئی واردات نہیں ہو سکتی۔ شام کے وقت واردات کے امکانات البتہ موجود تھے۔ گاڑی دُکان کے سامنے رکی، اطلاعی گھنٹی بجائی اور دُکان لُوٹ کر چلتے بنے۔ حملہ آوروں کے لیے اندر گھسنے کا صرف یہی ذریعہ تھا۔ ہنری نے سوچا کہ کسی بھی شام یہ حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔

ایک شام وہ دُکان کا وقت ختم ہونے کے بعد دروازہ بند کر کے لوٹا اور رقم گننے لگا۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اسے کوئی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ کسی نے گاڑی بڑی تیزی سے روکی تھی! اچانک بریک لگنے کی وجہ سے پہیے بُری طرح چیخ اُٹھے تھے۔ ہنری نے محسوس کیا کہ اُس گاڑی سے کچھ لوگ اُترے ہیں۔ پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز اُسے سنائی دی۔ ساتھ ہی اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔ ہنری کی بیوی ایما اُس وقت باورچی خانے میں تھی گھنٹی کی آواز سن کے وہ تنگ راہداری میں آ گئی۔ غالباً وہ یہ دیکھنے جا رہی تھی کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ ہنری ایما سے پہلے لپک کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اُس نے دُوری سے جھولتی ہوئی "دُکان بند ہے" کی تختی سرکا دی اور سوراخ سے

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جھانکا۔ باہر ایک بند گاڑی کھڑی تھی جس پر کسی کمپنی کا نام نہیں تھا۔ گاڑی کا انجن بند نہیں کیا گیا تھا۔ ہنری پھرتی سے کاؤنٹر کے عقب میں گھوم گیا۔ ابھی وہ راہ داری تک نہیں پہنچا تھا کہ ایما نے دروازہ کھول دیا۔ ہنری کا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ یقیناً اُسے بہت دیر ہو گئی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی ڈاکو اندر گھس آئے۔ ہنری نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ تین افراد تھے۔ اُن کے سرغنہ نے بھی اپنے ساتھیوں کی طرح چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو چمک رہا تھا۔ ایما کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ سرغنہ آگے بڑھا تو ایما حملہ آور اور ہنری کے درمیان دیوار بن گئی۔ ہنری نے اُسے نرمی سے ایک طرف ہٹا دیا۔ "تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" اُس نے اپنی آواز مضبوط کر کے کہا۔

"ہم گیس کا میٹر دیکھنے نہیں آئے ہیں بزرگوار!" سرغنہ نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ "انھیں پچھلے کمرے میں لے چلو۔"

"غالباً ہمارے باس کی بات تم نے سُن لی ہے۔" دوسرے شخص نے چاقو نکال کے لہرایا اور راہ داری کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر تم نے تعاون کیا تو محفوظ رہو گے۔" تیسرے نے کہا۔ ہنری نے ایک طویل سانس لی اور خاموشی سے راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔ ایما اُس کے آگے آگے چل رہی تھی۔

پچھلے کمرے میں داخل ہونے کے بعد سرغنہ نے سب سے پہلے ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا۔ دوسرے نے چاقو لہرایا اور کپڑے لٹکانے کی ڈوری کاٹ لی۔ یہ ڈوری کمرے کی ایک دیوار سے دوسری تک کھنچی ہوئی تھی۔ درمیان میں میز تھی جس کے پہلو میں بڑی تجوری تھی۔ مقفل تجوری جس میں ہنری کا تمام اثاثہ بند تھا۔

حملہ آور ڈوری سمیٹ کر ہنری کی طرف بڑھا تو ہنری خوف زدہ ہو گیا۔ "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں جناب کے آرام کا بندوبست کر رہا ہوں۔" جواباً کہا گیا۔ "اس طرح آپ کو خواہ مخواہ زحمت نہیں ہو گی اور ہم بھی اطمینان سے اپنا کام انجام دے سکیں گے۔"

"میری بیوی کو باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ہنری نے چیخ کر کہا۔

"تمھیں غلط فہمی ہے۔ ہمیں عورتوں کا خاصا تجربہ ہے۔"

"ایک عورت کو تکلیف پہنچا کر....."

ہنری کی بات ادھوری رہ گئی۔ چاقو اُس کے نرخرے سے ایک انچ کے فاصلے پر رک گیا تھا۔ سرغنہ کا لہجہ بہت خوف ناک تھا۔ "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم عورت پر ہاتھ اُٹھائیں؟"

"نہیں نہیں۔" ہنری نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، درست کرو، تیار ہو جاؤ۔" چاقو اُس کے نرخرے سے نصف انچ کی دوری پر تھا۔

"آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" ہنری نے کہا۔

"اب تمھیں بار بار یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تجوری کی چابیاں میرے حوالے کر دو۔"

ہنری نے چابیوں کا گچھا نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ "تجوری میں کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں ہے۔"

سرغنہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اُس نے چاقو کی نوک اُس کے نرخرے سے ہٹا لی اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ "تم بہت پُرلطف آدمی ہو۔" اُس نے چاقو لہرا کر ہنری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "ہم دیکھے بھالے بغیر کسی جگہ حملہ نہیں کرتے۔ تمھیں شاید علم نہ ہو مگر ہمیں معلوم ہے کہ اس تجوری میں قیمتی ہیروں کی بھی ایک دراز ہے۔ دو ایک روز پہلے تمھارا معاون ہمیں وہ ہیرے دکھا چکا ہے۔ ہم خریدار کی حیثیت سے یہاں آئے تھے اور انھیں دیکھ کر ہم نے مالیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔"

حملہ آوروں نے ہنری اور اُس کی بیوی کو کرسی سے باندھ دیا۔ ایما بُری طرح کراہ رہی تھی۔ اُنھوں نے بندشیں اتنی سخت رکھی تھیں کہ ڈوری کھال میں پیوست ہو گئی تھی۔ ہنری نے بے چارگی سے سر گھما کے تجوری کی طرف دیکھا۔ تجوری کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا گیا تھا۔ "مجھے تم لوگوں پر ترس آ رہا ہے۔" ہنری نے اپنی آواز بھاری کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تمھاری حالت مردہ بطخوں جیسی ہے۔"

کوئی اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ زیورات کے ڈبے کھل چکے تھے۔ ایک شخص جلدی جلدی طلائی انگوٹھیاں اور ہار اپنی جیب میں ٹھونس رہا تھا، دوسرا ہیروں کی دراز خالی کرنے میں مصروف تھا۔ سرغنہ تجوری سے ڈبے اور دیگر قیمتی سامان باہر نکال رہا تھا۔

"ہاں تم کیا بکواس کر رہے تھے مسٹر؟" سرغنہ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا اور سُرخ سُرخ آنکھوں سے ہنری کو گھورنے لگا۔

"تم سے ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔"

"اوہ..... کیا ہم نے پہلو کا دروازہ ذرا زور سے کھولا تھا؟"

"کچھ بھی ہو۔" ہنری کا لہجہ پُرسکون ہو گیا۔ "میں تمھارے پانچ ڈالر کے مقابلے میں سو ڈالر کی شرط لگاتا ہوں۔"

"کس بات پر؟" سرغنہ نے دل چسپی سے پوچھا۔

"تم اپنی گاڑی تک نہیں پہنچ سکتے۔" ہنری نے کہا۔

تینوں کے ہاتھ رُک گئے۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چند لمحے نگاہوں کا تبادلہ ہوا پھر سرغنہ نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کیا تم ہمیں خوف زدہ کرنا چاہتے ہو؟"

"میں خود بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہاری ناکامی اٹل ہے۔"

ہنری کا پُرسکون لہجہ کچھ دیر ان تینوں کے لیے اُلجھن کا باعث رہا، پھر سرغنہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔ ہنری نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک زندہ دل آدمی ہے۔ "تم ہمیں کا ایک سمجھ رہے ہو؟" سرغنہ نے ہنس کر کہا۔ "یقیناً اس دُکان میں کوئی کمپیوٹر لگا ہوا ہے جس کے ذریعے مقامی پولیس کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ تمہاری دُکان لُوٹی جا رہی ہے؟"

"احمقانہ باتیں نہ کرو ہنری!" ایما نے اُس کے بولنے سے پہلے کہا۔ "اُس طرح تم انہیں غصّہ دلا رہے ہو۔" ہنری نے ایک مرتبہ پھر ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

وہ سب ہنری اور اُس کی بیوی کو گھُور رہے تھے۔ اُن میں سے ایک کچھ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ ایما کا دل دھڑکنے لگا۔ چور اور ڈاکو خوف زدگی کے عالم میں اور خطرناک ہو جاتے ہیں۔ وہ رحم طلب نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ "تم جو کچھ لے جانا چاہتے ہو انہیں لے جاؤ۔" ایما نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ بروقت کہیں سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ زندگی رہی تو ہم اور بھی کما سکتے ہیں۔"

"تم ایک سمجھ دار عورت ہو۔" سرغنہ مسکرانے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ ہم نے تمہیں باندھ رکھا ہے بہرحال رخصت ہوتے وقت ہم تم سے ضرور معذرت کریں گے۔"

"کیوں مسٹر؟" دوسرا ہنری کی طرف متوجّہ ہو گیا۔ "خاموش کیوں ہو کیا کوئی نئی کہانی تراش رہے ہو؟"

"میں جانتا ہوں کہ ایما سچ کہہ رہی ہے۔" ہنری نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔ "یہاں کمپیوٹر نہیں ہے پھر بھی...."

"ٹھیک ہے۔" سرغنہ ہنس پڑا۔ "تمہارا رابطہ دُکان سے باہر کی دنیا سے قائم ہے کیوں یہی بات ہے نا؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" ہنری نے اُسے باتوں میں مصروف رکھنے کے لیے کہا۔ "دراصل میں وہ چیز خریدنا نہیں چاہتا تھا لیکن سیلز مین کوئی تجربہ کار آدمی تھا۔ اُس نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اُسے خرید لوں۔ سیلز مین کا خیال تھا کہ میری دُکان محفوظ ہے پھر بھی مجھے اس چیز کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے، وہ کچھ ٹھیک کہہ رہا تھا۔"

"سنو مسٹر!" ایک نے بگڑ کے کہا۔ "اگر تمہاری دُکان میں کوئی ایسا آلہ موجود ہوتا تو وہ اب تک کام کر چکا ہوتا۔ ایسے آلات عموماً تیس سیکنڈ میں کام کر گزرتے ہیں اور ہمیں اس دکان میں داخل ہوئے دس منٹ گزر گئے ہیں اور اب تک کوئی ناپسندیدہ بات سامنے نہیں آئی۔"

"بیکار وقت ضائع نہ کرو۔" دوسرے نے مشورہ دیا۔

"بہرحال میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کر چکا ہوں۔" ہنری نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" سرغنہ مُسکرایا۔ "ہمارے جانے کے بعد اُس سیلز مین کو اطلاع ضرور دے دینا کہ اُس کا آلہ ناکام ثابت ہوا ہے، میرا خیال ہے اُس نے تمہیں آلہ کارآمد ثابت نہ ہونے پر قیمت واپس کرنے کا چکما ضرور دیا ہو گا۔ تم اُس سے اپنی رقم واپس طلب کرنے کی کوشش کرنا۔"

اس بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔ ابھی قہقہے کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ پہلو کا دروازہ ہلنے لگا۔ کسی نے پوری قوت سے دروازے پر دستک دی تھی۔ سب سُن ہو گئے۔ "دروازہ کھولو۔ پولیس۔" ایک سخت آواز سنائی دی۔

ایک نے کمرے کے عقبی رُخ کی کھڑکی دیکھی اور اُچھل پڑا۔ "اوہ۔ دو پولیس والے عقبی دروازے تک پہنچ گئے ہیں اور تین احاطے کی دیوار پر چڑھ رہے ہیں۔"

ہنری اور اس کی بیوی ایما جلد ہی تنہا ہو گئے۔ رات کے کھانے کی میز پر ایما بہت چہک رہی تھی۔ ہنری پیار کی نگاہ سے اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک خوب صورت چڑیا کے مانند تھی۔ "کیا تم نے واقعی کوئی ایسا آلہ خریدا تھا ہنری؟" ایما نے اچانک ہاتھ روک کر دریافت کیا۔

"نہیں ڈارلنگ! میں تو انہیں متزلزل کر رہا تھا، میرا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے کام میں تاخیر کریں۔ ورنہ وہ بھگدڑ میں ہمیں نقصان پہنچا سکتے تھے اور عین ممکن تھا کہ وہ دُکان اور مکان میں ہر چیز اُلٹ پلٹ دیتے۔"

"لیکن تمہیں یہ یقین کیسے تھا کہ پولیس ہماری مدد کو آ جائے گی؟"

"یقین تو نہیں تھا۔" ہنری مُسکرایا۔ "البتہ میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے کوئی عقل مند آدمی سامنے بس اسٹاپ پر آ جائے۔ کسی ایسے ہی شخص کی وجہ سے ہم محفوظ رہ سکتے تھے۔"

"میں تمہاری بات اب بھی نہیں سمجھی۔"

"خیر۔" ہنری نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "کیا تم نے دوکان بند ہے کی تختی دیکھی ہے جسے چند روز پہلے ایک سیلز مین بڑے وثوق سے فروخت کر کے گیا تھا، میں نے جیسے ہی ان لٹیروں کو دیکھا تھا۔ وہ تختی اُلٹ دی تھی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" ایما نے حیرت سے کہا۔

میں ایک عرصے سے سوچ رہا تھا کہ ہماری دُکان شام کے وقت آسانی سے لُوٹی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس سیلز مین کی تختی خرید کر بے پناہ مسرت ہوئی تھی۔"

"آخر اس تختی میں کیا خصوصیت ہے؟"

"اُس کے اُلٹی جانب بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا ہے دکان لُوٹی جا رہی ہے، فوراً پولیس کو فون کر دو۔"

ملٹن کلے مین * وسیلہ خاتون

آپ روز دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے

مسٹر کونٹ کی کہانی جو ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں

مسٹر کونٹ سال ہا سال سے کاروبار کر رہے تھے۔ آپ نے گھٹیا قسم کے رسالوں میں چھوٹے چھوٹے بے شمار اشتہارات پڑھے ہوں گے۔ ان اشتہارات میں سرجری کے بغیر دُنیا کے ہر مرض کا علاج کرنے کا دعوا کیا جاتا ہے۔ ان میں پوشیدہ اور غیر پوشیدہ دونوں امراض شامل ہوتے ہیں۔ کوئی معقول شخص ان اشتہارات پر نظر ڈالنا تک پسند نہیں کرتا لیکن مسٹر کونٹ کی اچھی اور متواتر آمدنی دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو نہ صرف یہ اشتہارات پڑھتے ہیں بلکہ ان میں کیے جانے والے دعووں پر بھی یقین کر لیتے ہیں پھر اپنی بیماریوں کے علاج کے لیے مشتہرین سے رجوع کرتے ہیں۔ ان مشتہرین کا سارا کاروبار ڈاک کے ذریعے ہوتا ہے وہ رقم بھی ڈاک سے وصول کرتے ہیں اور دوائیں بھی ڈاک سے ارسال کرتے ہیں۔ اس طرح معالج اور مریض کا کبھی آمنا سامنا نہیں ہوتا۔ آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں کہ مسٹر کونٹ اپنے کاروبار اور آمدنی سے بے حد مطمئن اور خوش ہوں گے۔ بے شک وہ بہت خوش تھے۔ خاص طور پر اس لیے خوش تھے کہ ان کی لاگت ناقابلِ یقین حد تک کم ہوتی تھی۔ لاگت کی کمی کا سب سے بڑا سبب مزدوروں سے کم سے کم اُجرت پر کام لینا تھا۔

مسٹر کونٹ کا ایمان تھا کہ مطمئن اور آسودہ مزدور کبھی پورا کام نہیں کرتا، وہ کام چور بن جاتا ہے۔ یہ اُن کے بنیادی اُصولوں میں سے ایک اصول تھا۔ اسی اصول پر اُنھوں نے اپنے کاروبار کی عمارت کھڑی کی تھی۔ اس اصول کا اطلاق وہ مختلف طریقوں سے کرتے تھے۔ اس سلسلے میں جب بھی موقع ملتا وہ اپنے ملازمین کے کان کھولتے رہتے تھے۔ مسٹر کونٹ اپنے ملازمین سے اکثر کہتے تھے۔ ”تم لوگ جو وقت میرے دفتر میں گزارتے ہو اُس کے ایک ایک منٹ پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔ اس پورے وقت کا صرف میں حق دار ہوں۔ وہ یہ بات بھی اکثر دہراتے تھے۔“ مجھے اس بات کا پورا پورا

حق ہے کہ دفتر میں جو ٹیلی فون آئے وہ میرے لیے ہو اور جو خط دفتر میں آئے وہ بھی میرے لیے ہو کیونکہ یہ میرا دفتر ہے اور صرف میرے کاروبار کے لیے وقف ہے۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے ملازمین یہاں اپنے ذاتی کام نمٹائیں۔ یہاں میرے کاروبار کے سوا کسی دوسرے کام کی اجازت نہیں ہے۔" مسٹر کونٹ کو چند دوسرے فقرے بھی بہت پسند تھے۔ مثال کے طور پر۔ "پھل دار درخت کو پھل دینا چاہیے ورنہ ختم ہو جانا چاہیے۔ کتا کتے کو کھا جاتا ہے۔" "سخاوت کا لفظ صرف لغت میں پایا جاتا ہے" "میں خدمتِ خلق کے لیے کاروبار نہیں کرتا۔ اگر کوئی کام قانونی حدود میں ہے تو اس امر پر کبھی توجہ مت دو کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔"

♥

مسٹر کونٹ کے سر کے بال بہت پہلے اُڑ گئے تھے اور گنتی کے جو چند بال بچے تھے اُن کا رنگ اُڑ گیا تھا وہ اپنے بال نہایت احتیاط کے ساتھ کھوپڑی سے چپکائے رکھتے تھے۔ مسٹر کونٹ کی ایک بیوی بھی تھی۔ وہ بہت تیزی سے بوڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کا رنگ روپ پہلے ہی اُڑ چکا تھا۔ وہ ہر ہفتے گھریلو اخراجات کی رقم لینے کے لیے اپنے شوہر کے پاس دفتر آتی تھی۔ جہاں تک میاں بیوی کے تعلقات کا سوال ہے، مسٹر کونٹ اس معاملے میں کسی رُو رعایت کے قائل نہیں تھے، وہ بڑی سختی سے مساوات کے اصول پر کاربند رہتے تھے۔ اُن کا سلوک اپنی بیوی کے ساتھ بھی وہی تھا جو ملازمین کے ساتھ تھا۔ اس امر کی شہادت دفتر کا ہر ملازم دے سکتا تھا۔ اندرونی کمرے اور بیرونی دفتر کے درمیان لکڑی کا ایک چھ فٹ اونچا پارٹیشن حائل تھا۔ بیرونی حصے میں کام کرتے ہوئے ملازمین اندر ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن سکتے تھے۔ عام طور پر مسز کونٹ کی گفتگو چند مخصوص فقروں پر مشتمل ہوتی تھی جنھیں وہ ہر ہفتے دُہراتی تھی۔ "ہاں کونٹ۔ میں جانتی ہوں کونٹ۔ لیکن مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے کونٹ۔ ہر چیز کے دام دُگنے ہو گئے ہیں کونٹ۔ نہیں کونٹ۔ پلیز کونٹ۔"

مسز کونٹ جب باہر نکلتی تو بڑی کھوئی کھوئی اور پریشان نظر آتی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دبا ہوتا تھا جس میں گھریلو اخراجات کا چیک ہوتا تھا۔ اپنے شوہر کے ملازمین کو دیکھ کر وہ مُسکرانے کی ناکام کوشش کرتی پھر دبی دبی زبان سے الوداعی کلمات ادا کرنے کی کوشش کرتی اور تان اِس پُرانے جملے پر ٹوٹتی تھی۔ "مسٹر کونٹ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس بات کا خیال رکھیے کہ انھیں غصّہ نہ آئے۔ اُن کا دل بہت کمزور ہے۔ انھیں دل کی بیماری ہے۔"

مسز کونٹ کو غالباً اپنے شوہر کے ملازمین کی صحیح حالت کا اندازہ نہیں تھا ورنہ وہ کبھی اس بارے میں پریشان نہ ہوتی۔ دفتر میں کل تین ملازم تھے۔ ایک مرد ایڈ اور دو عورتیں مارتھا اور فرانسس تینوں بوڑھے تھے۔ ان کی حالت بوڑھے گھوڑوں جیسی تھی جن کی کمر ہنٹر مار مار کر توڑ دی گئی تھی جس کی وجہ سے اب وہ اپنا سر بھی اونچا نہیں کر سکتے تھے۔ اُن میں اتنی اہلیت نہیں رہی تھی کہ وہ مسٹر کونٹ کو کوئی صدمہ پہنچا سکیں یا انھیں غصّہ دلا سکیں۔ اس لیے مسٹر کونٹ کم از کم اپنے ملازمین کے درمیان قطعی محفوظ تھے۔

مسٹر کونٹ کا بس چلتا تو وہ ان تین مستقل ملازموں کے علاوہ کسی چوتھے آدمی کو اپنے دفتر میں قدم رکھنے کی کبھی اجازت نہ دیتے لیکن جب کام کی زیادتی ہوتی تھی اور ایسا سال میں تین بار ہوتا تھا تو بے حد مجبوری کی حالت میں انھیں عارضی طور پر ایک زائد ملازم کی خدمات حاصل کرنی پڑتی تھیں۔ اُنھوں نے ملازمت دلانے والی ایجنسی کو یہ ہدایت خاص طور پر کر رکھی تھی کہ اُن کے پاس صرف ایسے عمر رسیدہ اُمیدوار بھیجے جائیں جو عارضی ملازمت کرنے میں عار محسوس نہ کرتے ہوں۔ ایجنسی کو اُن کی ہدایت پر عمل کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مسٹر کونٹ کو اس کا خوب تجربہ تھا کہ بوڑھے آدمیوں کو کہیں ملازمت نہیں ملتی اور وہ عارضی ملازمت بھی غنیمت سمجھتے ہوئے قبول کر لیتے ہیں اور ایسے بوڑھے افراد بے حد ڈرپوک اور محنتی ہوتے ہیں۔ وہ مالکان کا ہر رویّہ خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں، البتہ کبھی کبھی مسٹر کونٹ سے اُمیدوار کے انتخاب میں چوک ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر مسز آرچی کا واقعہ لے لیجیے۔ وہ کہتی تھی کہ "مسٹر کونٹ پیسہ بچانے کے لیے کمینی اور گھٹیا حرکتیں کرتے ہیں۔" مسز آرنے یہ بات ایڈ سے یا شاید مارتھا سے یا شاید بوڑھی فرانسس سے کہی تھی۔ "میں اسے کبھی پسند نہیں کر سکتی۔ میں اس کمینگی کی وجہ سمجھ سکتی ہوں لیکن مسٹر کونٹ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ وہ محض لُطف اندوزی کے لیے کمینگی اختیار کرتے ہیں۔ دوسروں کو ذلیل کر کے انھیں مسّرت ہوتی ہے۔" اس بے لاگ تبصرے کے پیچھے یہ واقعہ پوشیدہ تھا کہ ایک بار ٹیلی فون کی گھنٹی بجی مسٹر کونٹ نے رسیور اُٹھایا پھر زور سے بولے "کیا؟ کون؟ کون؟ یہاں کوئی مسز آر نہیں ہے۔ غلط نمبر ہے میں کہہ رہا ہوں غلط نمبر ہے۔" لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کرتے، باہر مسز آر نے جلدی سے دوسرے فون کا رسیور اُٹھا لیا جس کا اندرونی ٹیلی فون سے سلسلہ قائم تھا۔

"کون؟ آنٹی بول رہی ہیں؟" مسز آر نے رسیور میں کہا۔ "ہاں آنٹی میں بول رہی ہوں۔ خیریت ہے؟ کیا ہوا؟" مسٹر کونٹ نے اپنے دفتر میں بے اجازت یہ ڈراما شروع ہوتے دیکھا تو خوب چیخے چلّائے۔ انھوں نے پورا دفتر سر پہ اُٹھا لیا لیکن مسز آر نے بھی گفتگو مکمل کیے بغیر ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع نہیں کیا۔ مسٹر کونٹ نے اُس باغی اور شر پسند عورت کو کھڑے کھڑے ملازمت سے نکال دیا لیکن وہ بھی بڑی خود سر تھی۔ جب وہ دفتر سے باہر نکل رہی تھی تو اس کا سر بلند تھا اور گردن تنی ہوئی تھی۔ مسٹر کونٹ کے تینوں مستقل ملازموں نے بہت حسرت سے مسز آر کو اس طرح رخصت ہوتے دیکھا اور اپنے دلوں میں شدید حسد محسوس کیا۔ کاش وہ بھی اس طرح سر بلند کر کے اور گردن اکڑا کے دفتر سے باہر نکل سکتے لیکن وہ تینوں بہت بوڑھے اور ڈرپوک تھے ان

امیر میں ایک خاص زاویے سے مشہور افراد کی فہرست کا مطالعہ کیا گیا۔ یہ فہرست ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ فہرست کے مطابق پیشہ ور افراد اور تاجروں کی عمریں عام آبادی کی اوسط عمروں سے زیادہ نکلیں۔ مشہور افراد کے تذکرے کی یہ کتاب ہر سال مُرتب کی جاتی ہے۔ اس میں ادیبوں، شاعروں، سائنس دانوں، سیاسی رہنماؤں، تاجروں، صنعت کاروں اور دُوسرے افراد کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ ان مشہور شخصیات میں سب سے زیادہ عمریں سائنس دانوں نے پائیں۔ بیشتر مذہبی رہنما پادری، معلّم اور فوجی اوسط عُمر سے قبل فوت ہو گئے۔ ڈاکٹروں، سرجنوں اور سرکاری افسروں کی عمریں اوسط سے کچھ زیادہ نکلیں۔ تجارتی اداروں کے عہدیدار جج، قانون داں انجینئر اور فن کار ٹھیک اوسط عمر پاکر فوت ہُوئے۔ جلد فوت ہونے والوں میں سب سے بڑی تعداد اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور خبر رساں ایجنسیوں کے نامہ نگاروں اور صحافیوں کی تھی۔ ان کے بعد جلد فوت ہونے والوں میں مُصنّف، مدیران اور ناقدین سرِفہرست تھے۔

امید ہمیشہ کا عطیہ

میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ مسٹر کونٹ کی ملازمت کو لات مار سکتے حالانکہ انھیں پورے امریکا میں سب سے کم تنخواہ ملتی تھی لیکن وہ یہ قلیل آمدنی بھی کھونے کے متحمّل نہیں ہو سکتے تھے۔ مسز آر کی جگہ مس رالف نے پُر کی۔ وہ ایک دراز قد عورت تھی۔ اُس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی اور اُس کا چہرہ کسی رحم دل گھوڑی جیسا تھا۔ پوری جوانی کنواری رہنے کے بعد مس رالف کو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اس عمر میں عشق کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ فریق مخالف نے بھی اُس کی محبت کا جواب بے حد گرم جوشی سے دیا۔ اُن کی منگنی ہو گئی۔ مس رالف جب بھی اپنے منگیتر کا ذکر کرتی تھی۔ اس کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگتا تھا۔ ایڈ، مارتھا اور بوڑھی فرانسس کو خزاں رسیدہ گلشن میں بہار کی واپسی دیکھ کے حقیقی مسرت ہوتی تھی۔ وہ دل و جان سے مس رالف کی خوشیوں میں شریک تھے۔

”وہ اس ہفتے یہاں آ رہا ہے میرا مطلب ہے میرا منگیتر ہارڈی۔“ مس رالف نے ایک روز انھیں یہ خوش خبری سنائی۔ ”مجھے ابھی اس کا علم نہیں ہے کہ وہ ہوائی جہاز سے آ رہا ہے یا ٹرین سے یا بس سے لیکن وہ آنے سے پہلے مجھے اس کی اطلاع ضرور دے گا۔ میں نے اُس سے کہا ہے کہ وہ مجھے دفتر کے پتے پر خط لکھ کر اپنی آمد کی اطلاع دے۔ اس طرح مجھے فوراً اُس کا خط مل جائے گا۔“

یہ خبر سُن کر مسٹر کونٹ کے مستقل ملازمین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ انھوں نے پہلے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھیں، پھر مس رالف کو دیکھا۔ ایڈ کھاتوں پر جُھکا ہوا بہت انہماک سے کام میں مصروف تھا۔ اُس نے اپنا قلم میز پر رکھ دیا اور سر اٹھا کے مس رالف کو دیکھا۔ ”مسٹر کونٹ کو“ اُس نے بے حد دھیمی آواز میں کہا۔ ”یہ پسند نہیں ہے کہ اُن کے ملازمین اپنے خطوط دفتر کے پتے پر منگوائیں۔“ ایڈ اپنے کوٹ کی طرح بے رنگ اور بوسیدہ ہو گیا تھا۔ مارتھا نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مسٹر کونٹ کو یہ بات ذرا بھی پسند نہیں ہے۔“ اُس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ اُس کی دہشت زدہ نظریں مسٹر کونٹ کے کمرے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ مارتھا کی زندگی میں کبھی کوئی منگیتر داخل نہیں ہوا تھا اور اب اس حادثے کا ظہور تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ مسٹر کونٹ جب بھی حلق صاف کرنے کے لیے کھنکارتے، وہ چونک کر بُری طرح اُچھل پڑتی۔

”تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مس رالف!“ بوڑھی فرانسس نے سرگوشی کی۔ اُس کا سر آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ بوڑھی فرانسس بہت پریشان ہے۔ جب وہ زیادہ پریشان ہوتی تھی تو اُس کا سر کچھ زیادہ ہلتا تھا۔ مسٹر کونٹ نے کئی بار بوڑھی فرانسس کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی تجربہ کار ڈاکٹر سے علاج کرائے۔ ساتھ ہی وہ یہ کہنا نہیں بھولتے تھے کہ وہ بیمار اشخاص کو اپنے دفتر میں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

مس رالف نے قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔ ”ایک خط اگر دفتر کے پتے پر آ گیا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ البتہ میں آیندہ خیال رکھوں گی۔“ اُس روز کے بعد مس رالف نے ڈاک پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی۔ اس کام میں شاید اُس سے کچھ زیادہ مستعدی کا مظاہرہ ہو گیا کیونکہ مسٹر کونٹ کھٹک گئے۔ انھوں نے مس رالف کو ڈاک میں آئے ہوئے خطوط کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پکڑ لیا۔ اُس وقت مارتھا ڈاک میں آئے ہوئے خطوط چھانٹ رہی تھی۔ مسٹر کونٹ میز کے قریب کھڑے اُس کی نگرانی کر رہے تھے۔ مس رالف اپنی میز سے ڈاک کے ڈھیر پر نظریں جمائے ہوئے بیٹھی تھی۔ ”آپ ڈاک کی فکر نہ کیجیے مس رالف!“ مسٹر کونٹ نے غراتے ہوئے کہا۔ ”اپنے کام سے کام رکھیے۔ ڈاک کی چھانٹی مارتھا کا کام ہے۔ میں آپ کو دوسروں کے کام کی نگرانی کرنے کی تنخواہ نہیں دیتا۔“

مس رالف نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔ ”مجھے ایک خط کا انتظار ہے جناب!“

”کسی کا کوئی ذاتی خط یہاں نہیں آ سکتا۔ یہاں جو بھی خط آتا ہے وہ میرے لیے ہوتا ہے، وہ میرا ہوتا ہے۔“

اس گفتگو کا یہ نتیجہ نکلا کہ دوسرے ہی روز سے مسٹر کونٹ نے ڈاکیے کو ہدایت کر دی کہ وہ ساری ڈاک انھیں دیا کرے اور سیدھا اُن کے کمرے میں آیا کرے۔ ڈاک کی چھانٹی مسٹر کونٹ خود کرنے لگے۔ مارتھا اس ذمّے داری سے سبک دوش کر دی گئی۔ پھر ایک روز مس رالف کے منگیتر ہارڈی کا خط آ گیا لیکن مسٹر کونٹ نے مس رالف کو اس کی اطلاع نہیں دی۔ بے چاری مس رالف پریشان ہوتی رہی، انتظار کرتی رہی۔ اُس کی راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ دفتر میں بھی اُس سے کوئی کام ٹھیک سے نہیں ہوتا تھا۔ اگر اُسے مسٹر کونٹ کے تینوں مستقل ملازمین کی ہمدردیاں حاصل نہ ہوتیں اور

وہ اُس کی پردہ پوشی نہ کرتے تو مسٹر کونٹ کب کا اُسے نکال دیتے۔

ایک روز مس رالف دفتر آئی تو اُس کی آنکھیں متورم تھیں جیسے وہ تمام رات روتی رہی ہو۔ ڈبوں میں شیشیاں بند کرتے ہوئے اُس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انتظار اب اُس کی قوّتِ برداشت سے تجاوز کر گیا تھا۔ وہ کھانے کے لیے دفتر سے اُٹھی تو اُس نے بڑی ہمّت کر کے ایک ٹیلی فون بوتھ سے اُس شہر فون کیا جہاں اُس کا بچپن بیتا تھا اور جوانی گزری تھی۔ اُس کے منگیتر ہارڈی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا اور فون پر اسے معلوم ہوا کہ اُس کا منگیتر تو وہاں سے کئی روز قبل اُس سے ملنے کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔

مس رالف کھانے کے وقفے کے بعد جب دفتر واپس آئی تو اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ "مسٹر کونٹ!" مس رالف نے باس کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو لرزتی ہوئی آواز میں انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"آج جتنے آرڈر آئے ہیں ان میں کتنے گاہکوں نے قیمت ڈاک کے ٹکٹوں کی شکل میں بھیجی ہے؟" مسٹر کونٹ نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے مارتھا سے پوچھا۔ "کیا ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میں ڈاک کے ٹکٹ فروخت کر کے اپنے اخراجات پورے کرتا ہوں؟" مسٹر کونٹ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ غصّے میں اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ مس رالف اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی مسٹر کونٹ کے پیچھے اُن کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

"کیا میں نے تمھیں بلایا تھا؟" انھوں نے جھلا کے پوچھا۔

"نہیں جناب مسٹر کونٹ! پلیز کیا میرا کوئی خط نہیں آیا مسٹر کونٹ؟ میرا خیال ہے کہ میرا ایک خط آنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے وہ ادھر اُدھر کہیں پڑا ہو۔ مہربانی فرما کے ایک بار میرا خط تلاش کر دیجیے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی مسٹر کونٹ!" مس رالف بس رونے والی تھی۔

مسٹر کونٹ نے پوری قوّت سے میز پر گھونسا مارا۔ باہر والے کمرے میں ایڈ اپنی نشست سے اچھل گیا۔ مارتھا کے ہاتھ سے دوات چھوٹ گئی۔ بوڑھی فرانسس کا سر زور زور سے ہلنے لگا۔ "نہیں، تمھارا کوئی خط نہیں آیا۔ تمھارا خط یہاں کیسے آ سکتا ہے؟ یہ دفتر ہے یا ڈاک خانہ؟ یہاں صرف کاروباری خطوط آتے ہیں۔ جاؤ اپنا کام کرو اور اگر کام نہیں کرنا چاہتیں تو اپنا حساب کر لو۔"

مس رالف جب مسٹر کونٹ کے کمرے سے باہر نکلی تو اُس کی حالت مار کھائی ہوئی کُتیا جیسی تھی۔ "لیکن میں دفتر کس طرح چھوڑ سکتی ہوں۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔ "جب تک ہارڈی کا خط نہیں آتا، میں کس طرح دفتر چھوڑ دوں؟" دوسروں نے اُسے چور نظروں سے دیکھا۔ کسی میں اُس سے بات کرنے کی ہمّت نہیں تھی۔

اُسی روز سہ پہر کے وقت مسٹر کونٹ اپنے کمرے سے باہر نکلے، اُن کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جسے بہت بدتمیزی سے کھولا گیا تھا۔ لفافے کے

امریکہ کے مشہور مزاح نگار مارک ٹوئن کو ایک دفعہ ریس کورس میں ایک پُرانا دوست مل گیا اور دوڑ کر اُس کے پاس آیا۔ "میں بالکل تباہ ہو گیا ہوں مارک! کوڑی کوڑی کا محتاج ہوں۔ تم سے صرف ایک درخواست ہے۔ مجھے ریل کا ٹکٹ دلوا دو تاکہ گھر جا سکوں"۔

مارک ٹوئن نے کہا۔ "میرے دوست! اتّفاق سے آج کل خود میرا حال بھی ابتر ہے۔ بہرحال ریل میں تم میرے ساتھ چلے چلنا اور میری نشست کے نیچے چھپ جانا۔ میں اپنی ٹانگیں پھیلا کر تمھیں پوشیدہ رکھوں گا۔"

اُس کے دوست نے بادلِ ناخواستہ اُس کی بات مان لی۔ مارک ٹوئن کاؤنٹر پر گیا اور چپکے سے دو ٹکٹ خرید لایا۔ ریل روانہ ہوئی۔ مارک ٹوئن کا دوست اُس کی نشست کے نیچے چھپ گیا۔ راستے میں ٹکٹ چیکر ٹکٹ چیک کرتا ہوا آیا مارک ٹوئن نے اُسے دو ٹکٹ پیش کیے۔ چیکر نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ "دوسرا آدمی کہاں ہے؟"

مارک ٹوئن نے انگلیوں سے اپنی کھوپڑی پر طبلہ بجایا اور بلند آواز سے کہنے لگا۔ "یہ میرے دوست کا ٹکٹ ہے۔ بیچارہ مخبوط الحواس ہے، ہمیشہ نشست کے نیچے چھپ کر سفر کرنا پسند کرتا ہے۔"

ساتھ ایک خط بھی تھا۔ سب کی نظریں بے اختیار مسٹر کونٹ پر جم گئیں۔ "تم لوگوں کو غالبًا کسی خط کی تلاش تھی؟" مسٹر کونٹ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "یہ ایک ایسا خط ہے جو میرے لیے نہیں لکھا گیا ہے کیونکہ یہ ایک عشقیہ خط ہے۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا ہوں کہ آخر یہ خط تم لوگوں میں سے کسے لکھا گیا ہے؟ کیا میں نے غلطی سے کسی بے حد خوب صورت حیوان کو ملازم رکھ لیا ہے؟ میری جان سے زیادہ عزیز ڈارلنگ کون ہے؟ تم ایڈ؟ تم مارتھا؟ تم فرانسس؟"

مسٹر کونٹ نے کسی کو نہیں بخشا۔ باری باری تمام ملازمین کے پرخچے اُڑاتے، اُن کی شخصیتیں کُچل کر اُنھیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے قدموں تلے خوب روندا۔ انھوں نے ایڈ کے چلنے کی نقل اُتاری کہ وہ کس طرح اپنا دایاں پیر گھسیٹ کر چلتا ہے۔ اُس نے اُنگلی سے ایڈ کے لباس کی طرف اشارہ کر کے اسے غلیظ قرار دیا۔ اُس نے مارتھا کو زرد چڑیا کا خطاب دیا اور بوڑھی فرانسس کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ اُسے کسی موسیقار سے شادی کرنی چاہیے۔ تاکہ وہ اُس کے ہلتے ہوئے سر کی حرکت کے ساتھ موسیقی ترتیب دے سکے۔

وہ فضا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بے تکان بولتے رہے۔ "تم میں سے آخر وہ کون خوش نصیب ہے جو ایک عاشق پھانسنے میں کامیاب ہو گیا ہے؟" انھوں نے تقریر ختم کر کے مس رالف کی طرف دیکھا۔ "تم مس رالف؟ تم اپنے معزز اور محترم دوست سے یہ درخواست کرو کہ وہ اپنے عاشقانہ اور بازاری خطوط یہاں نہ بھیجا کرے۔" انھوں نے لفافہ اور خط مس رالف کی طرف پھینک دیا۔ "اس دفتر میں کسی ملازم کا کوئی ذاتی خط نہیں آ سکتا۔ سب کان کھول کر سُن لیں۔ اگر کوئی خط آیا تو میں اُسے ضرور کھول لوں گا۔ آیا سمجھ میں؟ بس میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اپنا اپنا کام کرو۔" مسٹر کونٹ نے باہر جاتے ہوئے

بہت زور سے دروازہ بند کیا۔

مس رالف نے ہچکیوں کے درمیان آنسو پیتے ہوئے خط پڑھا پھر اپنا پرس اٹھا کر چلی گئی۔ دفتر سے نکلتے ہوئے اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور آنکھیں اشک بار تھیں۔ وہ ضبط کرنے کی بہت کوشش کر رہی تھی۔

مس رالف کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک سناٹا طاری رہا۔ ایڈ، مارتھا اور بوڑھی فرانسس اپنی اپنی جگہ گم صم بیٹھے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ عزت و وقار کا جو پھٹا پرانا لباس اُن کے جسموں پر تھا، اُسے مسٹر کوننٹ نے تار تار کر دیا تھا اور اب وہ خود کو ننگا محسوس کر رہے تھے۔ آخر ایڈ نے خاموشی کا طلسم توڑا۔ ”مسٹر کوننٹ زندہ رہنے کے قابل نہیں ہیں۔“ ایڈ نے دھیمی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اُنھوں نے اپنے انسان ہونے کا حق خود اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہے۔ کیا تم مجھ سے اتفاق کرتی ہو؟“

مارتھا نے اثبات میں سر ہلایا۔ دو موٹے آنسو بوڑھی فرانسس کی آنکھوں سے ٹپک کر اُس کے جھریوں بھرے ہوتے خشک رخساروں پر بہنے لگے۔

”میں مسٹر کوننٹ کے لیے موت کی سزا تجویز کرتا ہوں۔“ ایڈ نے کہا۔ اُس کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ”سنو، تم دونوں میرا منصوبہ غور سے سنو اور بتاؤ کہ کیا اس میں کوئی خامی ہے؟“

دوسرے روز مسٹر کوننٹ صبح اپنے دفتر میں داخل ہوتے تو اُن کی نظروں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ اُن کے تینوں مستقل ملازمین ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ یہ منظر اُن کے لیے اتنا غیر متوقع اور ناقابلِ یقین تھا کہ وہ غصہ کرنا بھی بھول گئے۔ ”یہ، یہ کیا ہو رہا ہے؟“

ایڈ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”مسٹر کوننٹ!“ اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”ہم ہڑتال پر ہیں۔“

”ہمارا مطالبہ ہے کہ ہماری تنخواہوں میں دس ڈالر فی ہفتہ اضافہ کیا جائے۔“ مارتھا کے حلق سے آواز نکلی۔

”جب تک ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کیا جاتا، ہم کام نہیں کریں گے۔“ بوڑھی فرانسس نے کانپتے ہوتے کہا۔

مسٹر کوننٹ کو ایسا شدید غصہ آیا کہ اُن کے چہرے کی رنگت سرخ ہوتے ہوتے زرد ہو گئی۔ بے اختیار انھوں نے اُنگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا پھر فوراً اُن کا ہاتھ نیچے گر گیا۔ ”میں تم سب کو ابھی اور اسی وقت ملازمت سے نکال سکتا ہوں۔“

”بے شک لیکن آپ ایسا کریں گے نہیں مسٹر کوننٹ!“ ایڈ نے کہا۔ ”یہ مہینہ کاروبار کے لیے بے حد مصروف اور منافع بخش ہے۔ اگر آپ نے فوراً ہمیں نکال دیا تو ہماری جگہ پُر کرنے کے لیے آپ کو بڑی دشواری ہو گی۔ نئے ملازمین اس کام سے ناآشنا ہوں گے اس لیے پہلے آپ کو انھیں کچھ عرصے تربیت دینی پڑے گی۔ اس طرح آپ کا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔“

مسٹر کوننٹ نے غصے سے دانت پیسے۔ ”میں تم لوگوں کو دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ دس منٹ کے اندر اندر تم لوگ ہڑتال ختم کر کے کام پر واپس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز جذبات کی شدت سے پھٹ گئی۔ اسی وقت ڈاکیا اندر داخل ہوا۔ وہ تازہ ترین فرمائشوں کا ایک بڑا سا پلندا اٹھائے ہوتے تھا۔ مسٹر کوننٹ نے ڈاکیے سے خطوط کا پلندا جھپٹا اور پیر پٹختے ہوتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ دروازے پر رُک کر اُنھوں نے مڑ کے اپنے ملازمین کو دیکھا۔ ”صرف دس منٹ۔“ پھر زور سے دروازہ بند کر لیا۔ مسٹر کوننٹ کا چہرہ غصے کی شدت سے اتنا خوفناک ہو گیا تھا کہ اُن کے ملازمین دہشت سے لرز گئے۔

ایک منٹ گزرا، دوسرا منٹ گزر گیا۔ پھر اندر سے ایک زوردار آواز آئی۔ دھوئیں کا ایک مرغولا لکڑی کے پارٹیشن سے بلند ہوتا ہوا کمرے کی چھت کی طرف چلا گیا۔ بوڑھی فرانسس کا سر زور زور سے ہلنے لگا۔

مسٹر کوننٹ کا کاروبار اب بھی اسی طرح چل رہا ہے۔ اُن کی بیوی روز صبح دفتر آتی ہے اور تمام ضروری کاغذات پر دستخط کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ وہ ایک عمدہ مالک ہے۔ تمام ملازمین اُس سے خوش ہیں۔ ایڈ، مارتھا، بوڑھی فرانسس اور مسز ہارڈی یعنی پہلے کی مس رالف نے کاروبار اچھی طرح سنبھالا ہوا ہے۔ کمپنی کے اشتہارات اب بھی باقاعدگی سے رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔ ڈاک کے ذریعے اب بھی دواؤں کی فرمائشیں آتی ہیں اور رقم بھی اسی طرح موصول ہوتی ہے اور ڈاک کے ذریعے مریضوں کو اب بھی اسی طرح دواؤں کے پیکٹ ارسال کیے جاتے ہیں۔

ایڈ کے خلاف مسٹر کوننٹ کے قتل میں ذرا بھی ثبوت نہیں ہے۔ پولیس بھی اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ اس سلسلے میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایڈ نے دفتر کے پتے پر مارتھا کے نام ایک ایسا مخصوص لفافہ بھیجا تھا جو ذرا سا کھلتے ہی زوردار دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔ ایڈ نے اس طرح مارتھا کو اپریل فول بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ لفافہ کسی کو زخمی نہیں کر سکتا تھا۔ زخمی ہونا تو دُور کی بات ہے، اُس کے پھٹنے سے کسی کو ذرا سی خراش بھی نہیں آتی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ لفافہ کھولنے سے پہلے مسٹر کوننٹ شدید غصے میں تھے اس لیے اُن کا کمزور دل متاثر ہو گیا تھا۔

اس کے باوجود انھیں کوئی گزند نہ پہنچتا، اگر وہ تہذیب و شائستگی کا دامن نہ چھوڑتے۔ انھیں کسی دوسرے کی ڈاک نہیں کھولنی چاہیے تھی۔ یہ تہذیب اور اخلاق کے منافی حرکت تھی، انتہائی گری ہوئی اور گھٹیا حرکت۔ انھیں مارتھا کے نام آیا ہوا وہ لفافہ نہیں کھولنا چاہیے تھا۔

چھو منتر

ایک تحریر کے کار ٹونے

فریڈرک براؤن * نرگس جمیل

جادو کی ایک نئی کہانی

ازراہِ کرم اس بدنصیب شخص کی اُلجھن دُور کیجیے

آپ نے پہلے بچے کی پیدائش پر کسی باپ کو زچہ خانے کے سامنے تیزی سے چہل قدمی کرتے اوپر تلے اوپر سگریٹیں سلگاتے دیکھا ہے؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ ایسے موقعوں پر وہ کتنا پریشان ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ کیفیت پریشانی تسلیم کرلیں تو وہ کیفیت کیا کہلائے گی جو جناتھن پر طاری تھی؟ جناتھن زچہ خانے کے سامنے نہایت تیزی سے چہل قدمی کر رہا تھا اور تلے اوپر سگریٹیں سلگا رہا تھا اور غلط کنارے سے سلگا رہا تھا یعنی جس طرف فلٹر ٹپ لگی ہوتی ہے۔ یہی نہیں وہ فلٹر والا سرا جلانے کے بعد باقاعدہ کش بھی لے رہا تھا۔ اُسے یہ احساس قطعی نہیں تھا کہ وہ تمباکو نوشی نہیں بلکہ فلٹر ٹپ نوشی کر رہا ہے اور ان دونوں کے ذائقے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کیفیت کے لیے ہم جناتھن کو قصوروار بھی قرار نہیں دے سکتے۔ بات ہی ایسی تھی۔ اگر اُس کی جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی فلٹر ٹپ نوشی کرنے لگتے۔

ایک شام جناتھن اپنی بیوی کے ساتھ آخری بار چڑیا گھر کی سیر کے لیے گیا تھا۔ اب جناتھن یا اُس کی بیوی کو دُنیا کی تمام دولت بھی پیش کر دی جائے تو وہ اور اس کی بیوی چڑیا گھر کے اندر قدم رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے، کبھی نہیں۔ ٹھہریے! میں وہ واقعہ سنانے سے پہلے آپ کو چند ضروری حقائق بتا دوں تاکہ آپ چڑیا گھر میں پیش آنے والا معاملہ پوری طرح سمجھ لیں۔ جناتھن کو نوجوانی میں جادو سیکھنے کا خبط ہو گیا تھا۔ اُس نے جادو سیکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن اِس دن رات کی محنت اور انتہائی مشکل چلہ کشی کے باوجود جناتھن اپنے منتروں میں وہ قوت پیدا نہیں کر سکا تھا جو پلک جھپکتے میں رات کو دن اور دن کو رات بنا سکے۔ البتہ وہ ایک منتر سیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے پڑھنے سے وہ کسی بھی آدمی کو کسی بھی جانور کی شکل میں تبدیل کر سکتا تھا اور وہی منتر اُلٹا پڑھنے سے اسے دوبارہ انسانی ہیئت میں لا سکتا تھا۔ یہ منتر اگر کسی کینے شخص کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اس سے بہت فائدے اُٹھاتا۔ کچھ اور نہیں تو وہ معاوضہ لے کر دوسروں کے دشمنوں ہی کو جانوروں میں تبدیل کر سکتا تھا لیکن جناتھن کینہ آدمی نہیں تھا اور نہ لالچی تھا۔ اُس نے شروع میں تجربے کے طور پر صرف چند بار وہ منتر آزمایا تھا لیکن اسے منفعت کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔

آخری بار یہ منتر اُس نے دس سال قبل استعمال کیا تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر بیس سال تھی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی کی گرہ گیر زلف کا شکار ہو کر اُس سے شادی کر چکا تھا۔ شادی کے بعد اُس نے اپنی نئی نویلی دلھن سے اپنے اس کمال کا ذکر کر دیا۔ اُس نیک بخت نے اپنے شوہر کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں، اُس نے اپنے شوہر سے کہا کہ اگر وہ سچا ہے تو اپنا دعویٰ عملاً ثابت کر کے دکھائے۔ آپ جانتے ہیں کہ بیوی کی زبان میں کیسی تاثیر ہوتی ہے اور وہ بیوی جس سے شوہر کو بے پناہ محبت ہو اور جو تازہ تازہ اس کے گھر آئی ہو (نکاح کے بعد) چنانچہ جناتھن نے منتر پڑھا اور اپنی بیوی کو ایک خوب صورت بلّی میں تبدیل کر دیا۔ کچھ دیر بعد جب اُس کی بیوی دوبارہ عورت بن گئی

تو اس نے اپنے شوہر سے وعدہ لیا کہ وہ آیندہ کبھی یہ حیرت انگیز منتر استعمال نہیں کرے گا۔ آپ کو معلوم ہے، نئی نویلی دلھن جس سے شوہر کو عشق ہو کتنی جلدی اُس سے کوئی بھی وعدہ لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ جناتھن نے اس وعدے کی پابندی بھی کی لیکن ایک بار اُسے اپنا وعدہ توڑنا پڑا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چڑیا گھر کے ایک سنسان راستے پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ اُس روز تعطیل نہیں تھی۔ شام بھی ہو گئی تھی اس لیے چڑیا گھر میں دُور دُور تک کوئی آدم زاد اُن دونوں کے سوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ ریچھوں والی کھائی کے پاس پہنچ گئے چڑیا گھر کے منتظمین نے یہ کوشش کی تھی کہ ہر جانور کو اُس کے مزاج کے مطابق جنگل جیسے ماحول میں رکھا جائے۔ ریچھوں کے لیے زمین کا ایک بڑا قطعہ خاصا گہرا کھودا گیا تھا اور اُن کی شب بسری کے لیے جگہ جگہ غار بنا دیے گئے تھے۔ وہ دونوں اُس کھائی کے پاس کھڑے ہو گئے۔ جناتھن کی بیوی ریلنگ پر جھک کر ریچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کھائی میں کوئی ریچھ نظر نہیں آیا۔ سارے ریچھ اپنے غاروں میں چلے گئے تھے۔ ریلنگ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ بدقسمتی سے جناتھن کی بیوی کا توازن بگڑ گیا اور وہ کھائی میں گر پڑی۔ یہ ایک تعجب خیز بات ہے کہ اتنی اونچائی سے گرنے کے باوجود اسے کوئی چوٹ نہیں آئی اور وہ فوراً اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی۔

جناتھن کی بیوی نے کپڑے جھاڑتے ہوئے اوپر نگاہ کی اور اپنے شوہر کی طرف دیکھا پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کے قریبی غار کی طرف دیکھا۔ جناتھن اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ جناتھن فوراً چڑیا گھر کے منتظمین کو مدد کے لیے بلائے اور یہ کام نہایت خاموشی سے ہو تا کہ غار میں سویا ہوا ریچھ بیدار نہ ہونے پائے۔ جناتھن نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ ہاتھ ہلا کر اپنی بیوی کو مطمئن رہنے کا اشارہ کر کے پلٹا ہی تھا کہ اُس نے نیچے سے اُس کی خوف زدہ چیخ سُنی۔ جناتھن نے جلدی سے نیچے دیکھا۔ ایک ریچھ غار سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ جُثے اور ڈیل ڈول سے نوجوان نظر آ رہا تھا۔ وہ خوف ناک انداز میں غراتا ہوا اُس کی بیوی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے تیور بے حد خطرناک تھے جیسے وہ اس عورت کے چیتھڑے اڑا دینے کے موڈ میں ہو۔ اب اپنی محبوب بیوی کی جان بچانے کے لیے جناتھن کے سامنے صرف ایک راستہ تھا کہ وہ منتر پڑھ کے اُسے وقتی طور پر ریچھنی بنا دے۔ ریچھ انسانوں کا دشمن ہوتا ہے اپنی مادہ کا دشمن نہیں ہوتا۔ جناتھن نے جلدی جلدی منتر پڑھا، منتر مکمل ہوتے ہی اُس کی بیوی ریچھنی میں تبدیل ہو گئی۔

منتر پڑھتے وقت جناتھن کو گمان بھی نہیں تھا کہ ایک نوجوان ریچھ کو اگر اچانک ایک نوجوان ریچھنی نظر آ جائے تو اُس پر کیا ردِعمل ہو گا۔ وہی ہوا جس کا جناتھن کو گمان بھی نہیں تھا۔ نوجوان ریچھنی کو تنہا اور بے یار و مددگار دیکھ کے ریچھ کی نیت خراب ہو گئی۔ جوان خون جوش مارنے لگا اور ریچھ تمام اخلاقی اقدار کی دھجیاں اُڑا کے بے حیائی اور بدکرداری پر اُتر آیا۔ جناتھن کی بیوی نے جو اُس وقت ریچھنی بنی ہوئی تھی ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ اس واقعے کا بدترین پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بدکرداری پوشیدہ رکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی حالانکہ ریچھ کا غار صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔ جناتھن ریلنگ پکڑے ہوئے ہونٹ کاٹ کاٹ کے اور پہلو بدل بدل کے یہ شرم ناک معاملہ ختم ہوتے ہوتے دیکھتا رہا۔ اُسے پورا احساس تھا کہ اس معاملے میں اُس کی بیوی کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ بے گناہ ہے اور فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ ریچھ کے سر سے بدمستی کا نشہ اتر گیا تو وہ اپنے غار میں چلا گیا۔ جناتھن نے فوراً الٹا منتر پڑھا اور اُس کی بیوی دوبارہ عورت بن گئی۔ جناتھن نے اُس سے کہا کہ "تم کھائی کی دیوار میں بنے ہوئے گڈھوں کی مدد سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔ اگر تم کچھ اوپر آ گئیں تو میں اپنی قمیص لٹکا کے تمھیں اوپر کھینچ لوں گا۔" دس منٹ کی کوشش کے بعد جناتھن کی بیوی کھائی سے باہر نکل آئی۔ اُس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور پورا بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔ واپسی میں راستے بھر اُن کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ گھر پہنچ کے انھوں نے مُعاہدہ کیا کہ وہ یہ واقعہ گفتگو کا موضوع کبھی نہیں بنائیں گے۔ اس میں قصور کسی کا بھی نہیں تھا۔ اگر جناتھن اُسے ریچھنی نہ بناتا تو ریچھ اُس کی بوٹیاں اُڑا کے رکھ دیتا۔ ریچھنی بننے کے بعد اُس کی بیوی ریچھ کی دست درازیوں کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس صورتِ حال کا تمام فائدہ ریچھ کو پہنچا۔ اُس کی قسمت میں مفت کا مال لکھا تھا۔

مُعاہدے پر چند ہفتوں سے زیادہ عمل نہیں ہو سکا۔ اُن کی شادی کو دس سال سے زیادہ ہو گئے تھے اور انھیں بچّوں کی بہت خواہش تھی لیکن دس سال کی طویل مدّت کے باوجود اُن کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ یہ مکروہ واقعہ پیش آنے کے صرف تین ہفتے بعد جناتھن کی بیوی نے اُسے یہ دہشت ناک خبر سُنائی کہ وہ اُمید سے ہے۔

کیا آپ نے پہلے بچّے کی ولادت پر کسی باپ کو زچّہ خانے کے باہر تیزی سے ٹہلتے اور ایک سگریٹ سے دُوسری سگریٹ جلاتے ہوئے دیکھا ہے؟ اس موقع پر وہ دنیا کا پریشان ترین آدمی نظر آتا ہے۔ اگر ہم یہ کیفیت 'پریشانی' تسلیم کر لیں تو وہ کیفیت کیا کہلائے گی جو جناتھن پر طاری تھی؟ وہ زچّہ خانے کے باہر نہایت تیزی سے چہل قدمی کر رہا تھا اور تلے اوپر سگریٹیں پھونک رہا تھا اور انھیں غلط کنارے سے جلا رہا تھا۔ یہی نہیں وہ فلٹر ٹپ والا کنارہ جلانے کے بعد باقاعدہ کش بھی لے رہا تھا اور انتظار کر رہا تھا، لیکن کس کا؟

اُس کی عمر ۹۹ سال تھی۔ ۹۹ سال کی عمر میں زندگی کو زندگی سمجھنا کتنا مشکل اور عظیم کام ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے شہر میں رہتی تھی وہاں کا ہر شخص اُسے بوڑھی ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ ۹۹ سال کی عمر میں بھی اس طرح مسکراتی تھی جیسے اب بھی زندگی کو زندگی سمجھ رہی ہے اور زندہ رہنے کی مکمل خواہش رکھتی ہے۔

جان بوڑھی ماں کے چھوٹے سے شہر کا مشہور وکیل رہ چکا تھا۔ اُس کی عمر چالیس سال سے کچھ اُوپر تھی۔ بہت پہلے ایک حادثے میں اُس کے لڑکے کی موت واقع ہوگئی تھی۔ اُس وقت سے جان وکالت ہی سے نہیں زندگی سے بھی بیزار ہوچکا تھا۔ وہ بہت اُداس اور بیکار زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اپنے جوان بیٹے کی موت کا غم غلط کرنے کے لیے بے تحاشا شراب پینے لگا تھا۔ اُس کی وکالت تباہ ہوچکی تھی اور اُس کی بچی کھچی پونجی شراب کے عارضی نشے اور غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کی نذر ہوتی جا رہی تھی۔

بوڑھی ماں نوعمری میں مدتوں پہلے اپنے چچا کا سہارا لینے کے لیے بہت دُور سے اس شہر میں آئی تھی لیکن جیسے ہی وہ چچا کے گھر پہنچی اُس کا استقبال چچا نے نہیں بلکہ چچا کے قتل کی خبر نے کیا۔ اُس کے چچا کو ڈاکوؤں نے مال و زر کے لالچ میں مار ڈالا تھا۔ بوڑھی ماں نے واپس جانے کے بجائے یہیں رہنا پسند کیا اور بچوں کو پڑھانے لگی۔ کچھ دنوں بعد اُس نے ایک شخص سے شادی کرلی اور چھ بچے پیدا کیے۔ یہ بچے بڑے ہوئے اور اُن کی بھی اولادیں ہوئیں۔ بوڑھی ماں کے اکثر بیٹے اپنی اولاد چھوڑ کے انتقال کرچکے تھے مگر بوڑھی ماں اب تک زندہ تھی۔ وہ اپنی ایک پوتی کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک دفعہ اسّی سال کی عمر میں اسے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ بوڑھے لوگوں کی طرح ماضی کے تصورات میں گم رہتی ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کسی سے کہا تھا: "جب تم ماضی کے تصورات میں گم رہنے لگو تو سمجھ لو کہ تم بوڑھے ہوگئے ہو یعنی زندگی سے اُکتا گئے ہو اور تم دوسروں کو خوش نہیں رکھ سکتے۔"

بوڑھی ماں زندہ رہنا اور صحیح معنوں میں زندگی برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے اُس نے ایک کتاب لکھنی شروع کردی۔

خاندان کے افراد کو بوڑھی ماں کے ٹائپ رائٹر کی ٹِک ٹِک سنائی دیتی رہتی۔ وہ یہ ٹک ٹک مسلسل دو تین گھنٹے تک سُنتے رہتے مگر بوڑھی ماں کسی کو، حتیٰ کہ اپنی پوتی کو بھی اپنی کتاب کے نامکمل ابواب دیکھنے یا پڑھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک جاری رہتی، رفتہ رفتہ لوگوں نے اُس کی ٹک ٹک کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا۔ عمر کی طوالت نے بوڑھی ماں کو اندھی اور بہری بھی بنا دیا تھا لیکن اُس میں زندہ رہنے کی ہمت جوانوں کی طرح موجود تھی اب بوڑھی ماں ۹۹ سال کی ہوچکی تھی۔ ایک دن اُس کی پوتی بیمار ہوئی اور اُسے اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ پوتی کی دو ننھی بچیاں دوسروں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوگئیں مگر بوڑھی ماں نے اُس کا گھر چھوڑ کر دوسروں کا سہارا قبول کرنے سے انکار کردیا۔ وہ کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی اور نہ اُسے یہ منظور تھا کہ کوئی شخص کسی طرح اُس کی مدد کرے۔ اُس کے پاس کوئی بڑی رقم بھی نہیں تھی۔ اس لیے پڑوسیوں کو اُس کی فکر لاحق ہوگئی۔ ایک روز بوڑھی ماں کو معلوم ہوا کہ اُس کی پوتی کی بچیاں آج کل جہاں مقیم ہیں، وہاں وہ خوش نہیں ہیں۔ یہ خبر اُس کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ایک پڑوسی کے پاس پہنچی اور بولی کہ وہ بازار جانا چاہتی ہے اگر وہ بازار جا رہا ہے تو اپنی گاڑی میں اُسے بھی لے جائے۔

پڑوسی بہت حیران ہوا کیونکہ بوڑھی ماں نے پندرہ سال سے بازار کا رُخ نہیں کیا تھا اور اس ضعیفی میں اُس کا اتنی دُور جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پڑوسی نے اُسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بوڑھی ماں نے کہا: "میں اتنی کمزور نہیں ہوں، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اگر تم مجھے نہیں لے جاؤ گے تو میں پیدل چلی جاؤں گی۔"

پڑوسی کو مجبوراً اُسے اپنی گاڑی میں لے جانا پڑا۔ بازار میں جان کا دفتر تھا۔ بوڑھی ماں وہاں اُتر کے جان کے دفتر میں داخل ہوئی۔ اُس کی بصارت بے حد کمزور تھی۔ اُسے جتنا نظر آتا تھا، وہ نظر نہ آنے کے برابر تھا۔ اس لیے وہ جان کا میلا لباس اور اُس کے دفتر کی بُری حالت نہیں دیکھ سکی۔ اُس نے

مرسلہ * تسنیم اختر

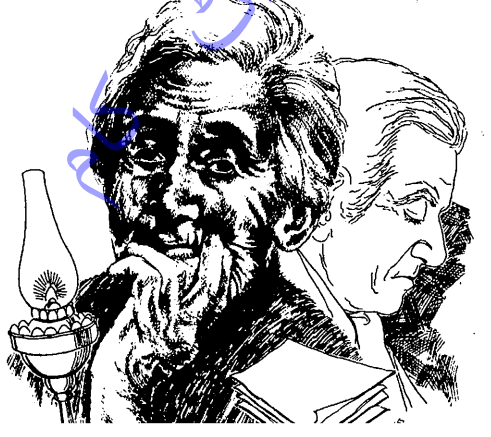

۹۹ سال کی ایک بوڑھی عورت کا شاہکار نوجوانوں کے لیے بطورِ خاص

نہایت بے تکلفی کے ساتھ اُس سے کہا: "جان! میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ کئی مؤکّل تمہارے منتظر ہوں گے لیکن میں تم سے خاص طور پر ایک کام لینے کے لیے آئی ہوں۔"

جان کا حلق سُوکھ رہا تھا۔ وہ شرمندگی سے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ تقریباً دو مہینے سے کوئی مؤکّل اُس کے دفتر میں جھانکا تک نہیں تھا۔ بوڑھی ماں اُس وقت سے اُس کی بزرگ تھی جب اُس نے بچپن میں بوڑھی ماں کے باغ سے آم چرائے تھے اور پکڑا گیا تھا مگر بوڑھی ماں نے اُسے معاف کر دیا تھا۔

بوڑھی ماں نے اپنی ہتھیلی میں کانپتا ہوا ہاتھ ڈال کے کاغذوں کا بنڈل نکالا: "میں نے ایک کتاب لکھی ہے جان! کیا کوئی اسے شائع کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا؟" جان نے کاغذوں کا بنڈل اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اسے ایک کرسی پر بٹھایا۔ اسے بوڑھی ماں کی شان دار زندگی کے وہ دن یاد آگئے جب اُس کے سب بچے زندہ تھے اور اُس کی خدمت کرتے تھے اور بوڑھی ماں کہانیاں اور افسانے لکھ لکھ کر رسالوں میں چھپواتی تھی۔

"تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے جان!" وہ بولی: "مجھے حقیقت بتا دو۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کتاب شائع ہی نہ ہو؟"

جان نے کاغذ کا بنڈل اُلٹ پلٹ کے دیکھنا شروع کیا: "بوڑھی ماں یہ کتاب تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔" اُس نے محسوس کیا کہ وہ بہری ہے تو زور سے کہا: "میرا خیال ہے یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ میں کوشش کر کے اسے نیویارک کے ایک ناشر کے ہاتھ فروخت کر دوں گا۔" بوڑھی ماں مطمئن ہو گئی۔ جان اُسے خود گھر تک پہنچا آیا۔

دس روز بعد اُس نے بوڑھی ماں کو خوش خبری سُنائی کہ "ناشر نے اُس کی کتاب کے صرف چند باب پڑھے ہیں کیونکہ اُس کے پاس وقت نہیں تھا مگر صرف چند باب پڑھ کے وہ اتنا خوش ہوا اور اُسے وہ باب اتنے پسند آئے کہ اُس نے ایک سو ڈالر پیشگی روانہ کر دیے ہیں۔ باقی رقم کچھ دنوں بعد بھیج دے گا۔"

بوڑھی ماں کے لیے یہ بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اُس نے سب سے پہلے اپنی پوتی کی دونوں لڑکیوں کو بُلایا اور کھانا پکانے کے لیے ایک ملازم رکھ لیا۔

جان ہر مہینے سو ڈالروں کے ساتھ بوڑھی ماں سے ملتا رہا اور یہ خبر سناتا رہا کہ کتاب کی طباعت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جان میں بھی بوڑھی ماں کی کامیابی سے ایک نئی لہر دَوڑ گئی تھی۔ اُس نے شراب قابلِ برداشت حد تک کم کر دی تھی اور اپنی چھوڑی ہوئی وکالت جوش اور انہماک سے دوبارہ شروع کر دی تھی۔ لوگ پھر اُس کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اسے اپنی کھوئی ہوئی شہرت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔

چند ماہ بعد بوڑھی ماں کی پوتی بھی اسپتال سے صحت مند ہو کے گھر واپس آ گئی اور پورا خاندان بوڑھی ماں کی سو ڈالر ماہانہ کی آمدنی پر پلنے لگا۔ شہر کے لوگ بوڑھی ماں کی اس شان دار کامیابی پر نازاں تھے۔

ایک دن صبح بوڑھی ماں بستر سے اُٹھ نہیں سکی کیونکہ اب وہ بہت کمزوری محسوس کرنے لگی تھی۔ اُس کے لیے فوراً ڈاکٹر بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے اُس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گی۔ بوڑھی ماں کو یہ سُن کر غصّہ آگیا۔ وہ اپنی کتاب چھپی ہوئی دیکھنا چاہتی تھی۔ اِس کے بعد اسے مرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اُس روز جان آیا تو اُس نے مژدہ سُنایا کہ اب اُس کی کتاب جلد شائع ہو جائے گی۔ اُس نے بتایا کہ "میں نے ناشر کو تار دیا تھا۔ وہاں سے جواب آیا ہے کہ وہ اِس ہفتے کتاب بھیج رہا ہے۔" بوڑھی ماں واقعتہً مر چکی ہوتی مگر کتاب دیکھنے کی اُمید میں وہ زندگی کا رشتہ طویل کرتی جا رہی تھی، صرف اپنی قوتِ ارادی سے۔ ایک ہفتے بعد جان ایک موٹی سی کتاب لے کے بوڑھی ماں کے پاس آیا اور کتاب اُس کے ہاتھ میں دے کے اُسے خوش خبری سنائی کہ "بوڑھی ماں! بوڑھی ماں! تمھاری کتاب شائع ہو گئی ہے۔"

بوڑھی ماں بہت خوش ہوئی۔ اُس نے کتاب اپنے ہاتھ میں لی اور جلد پر سنہرے حروف سے کندہ کیے ہوئے اپنے نام پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو قطرے نمودار ہوئے۔ اُس نے کہا: "خدا کا شکر ہے۔ میں کسی پر بوجھ بن کے نہیں رہی۔"

دو گھنٹے بعد بوڑھی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر نہایت اطمینان نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بوڑھی ماں کی پوتی نے کتاب دیکھی۔ اُس کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ خوب صورت جلد کے اندر تمام صفحات سفید تھے، بالکل سادے۔ اُس نے جان کی طرف حیرت سے دیکھا اور چلائی: "یہ صفحے تو کورے ہیں!"

جان نے لجاجت سے کہا: "اُمید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔ بوڑھی ماں نے کوئی کتاب لکھی ہی نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ نہ دیکھ سکتی تھی، نہ سُن سکتی تھی۔ ٹائپ رائٹر کی اطلاعی گھنٹی کی آواز وہ نہیں سُن سکی تھی اور سطر ختم ہونے کے بعد بھی ٹائپ کرتی رہی تھی۔ اس لیے ایک جملہ بھی مکمل طور پر ٹائپ نہیں ہو سکا تھا۔ کاغذ کے اس بنڈل میں کٹے پھٹے الفاظ کے سوا کچھ نہیں تھا مگر یہی بنڈل تو بوڑھی ماں کی آخری اُمید تھا۔ میں اُسے حقیقت سے آگاہ نہیں کر سکا۔ میں اُس سے اُس کی وہ اُمید نہیں چھین سکا جس کے سہارے وہ اپنی زندگی کے باقی دن گزارنا چاہتی تھی۔"

"لیکن وہ ناشر؟" بوڑھی ماں کی پوتی نے پوچھا: "وہ تو ہر مہینے رقم روانہ کرتا تھا؟"

جان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بوڑھی ماں کی پوتی سب کچھ سمجھ گئی۔ جان نے خود ناشر کا بہروپ بھر لیا تھا۔ اُس نے بوڑھی ماں کو پیشگی رقم اپنی موٹر فروخت کر کے ادا کی تھی۔ اب یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی تھی کہ وکالت دوبارہ چلنے کے باوجود بھی اُس کی بود و باش زیادہ اچھی نہیں تھی۔ تاہم جان نے بوڑھی ماں سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔

شغل

ترجمہ * تفسیر فاروقی

وہ ایک راز جانتی تھی مگر وہ عورت تھی

ایک بوڑھی عورت کی کہانی جو جوانوں سے مذاق کرتی تھی

عالمی شہرت یافتہ ادیب سی بی گلفورڈ نے اسے لکھا

مسز کارلے دو فلیٹوں کی مالکہ تھی۔ ایک فلیٹ میں خود اس کا قیام تھا۔ دوسرا فلیٹ وہ کرائے پر اٹھا دیتی تھی۔ کرائے داروں سے لڑنا جھگڑنا اس کا معمول تھا۔ لڑائی اس کی فطرت میں داخل ہو چکی تھی۔ پیر کی سہ پہر کو اس کا انیتا سے جھگڑا ہوا اسے گمان بھی نہیں تھا کہ انیتا سے یہ اس کا آخری جھگڑا ثابت ہوگا اور اب وہ انیتا کو کبھی نہیں دیکھ سکے گی اور اب اس سے مزید جھڑپیں ہونے کا امکان نہیں رہا ہے۔ انیتا اس کے عین اوپر والے فلیٹ میں رہتی تھی۔ ویسے تو دونوں اکثر لڑتی رہتی تھیں لیکن ان کی آخری جھڑپ بے حد شدید تھی۔ شروع میں تو لوگ اس بات پر حیران تھے کہ آئے دن کے جھگڑوں کے باوجود وہ انیتا کو کیوں برداشت کیے ہوئے ہے؟ اور اس سے اپنا فلیٹ خالی کیوں نہیں کرالیتی؟ آخر بہت بعد میں اس کا سبب لوگوں کی سمجھ میں آیا۔

مسز کارلے دراصل نفسیاتی مریضہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا شخص اس کے سامنے رہے جس سے اس کی نوک جھونک ہوتی رہے اور وہ اس پر چیختی چلاتی رہے اور دوسروں سے اس کی غیبت کرتی رہے۔ ان باتوں سے اسے بہت تسکین حاصل ہوتی تھی۔ اس کا آں جہانی شوہر کارلے ایک عرصے تک اس کا تختۂ مشق بنا رہا۔ آخر وہ غریب عاجز آ کے دنیا سے چل بسا۔ شوہر کے انتقال کے بعد بہت سے کرائے دار آتے اور چلے گئے۔ موجودہ کرائے دار انیتا تھی اور گزشتہ کرائے داروں کی نسبت وہاں زیادہ مدت گزار چکی تھی۔ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ مسز کارلے نے انیتا کے فلیٹ میں مشتبہ اجنبیوں کی آمد و رفت پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کوئی دوسری مکان مالکہ ہرگز اس بات کی اجازت نہ دیتی۔ مسز کارلے صرف اس لیے یہ امر نظر انداز کرتی رہی کہ اسے انیتا کے متعلق افواہیں

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

اُڑانے کا موقع ملتا رہے۔ ایک دوسرے کی ذاتی کمزوریاں دونوں کے نباہ کا سبب تھیں۔ پیر کی سہ پہر کو جب اُن دونوں میں جھگڑا ہوا تو مسز کارلے کی چیخ پکار سُن کر پڑوسنیں اپنی اپنی بالکونیوں میں آگئی تھیں۔

مسز کارلے حسب سابق اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ یہاں سے آتے جاتے لوگوں کا مشاہدہ کرنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسکول کی کوئی طالبہ نیلے رنگ کی چُست جین اور جیکٹ پہنے ہوئے ایک آوارہ سے نوجوان کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ مسز کارلے اپنی عادت کے مطابق ناپسندیدگی سے کچھ بڑبڑائی۔ اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے بے حد ناگواری سے اُٹھ کے دروازہ کھولا۔ دروازے پہ انیتا کھڑی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا پھر بھی انیتا ایک مہین ہاؤس کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ کوٹ کے نیچے اُس سے بھی مہین کپڑے کا نائٹ گاؤن تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ مسز کارلے نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ طاری کر کے اُسے خوش آمدید کہا۔ ”اندر آجاؤ ڈیئر! زیادہ دیر باہر رہو گی تو سردی لگ جائے گی۔“

بسا اوقات مسز کارلے لوگوں کو صرف اس لیے مدعو کر لیتی تھی کہ بعد میں انھیں دھکّے دے کے باہر نکال سکے، دوسروں کو بے عزت کر کے اُسے بہت خوشی ہوتی تھی۔ انیتا اُس کی اس عجیب و غریب عادت سے واقف تھی مگر وقتی مصلحت کی بنا پر اُس نے مسز کارلے کی دعوت قبول کر لی اور اندر آ کر تھکی تھکی سی صوفے پہ بیٹھ گئی۔ انیتا دلکش خدوخال کی ایک کم عمر عورت تھی اور سنگھار کیے ہوئے تھی پھر بھی اُس کے چہرے سے کچھ پھیکا پن نمایاں تھا اور وہ کچھ بیمار لگ رہی تھی۔

”کہو انیتا ڈیئر! اس وقت کیسے تکلیف کی؟“ مسز کارلے نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”مسز کارلے!“ انیتا نے لجاجت سے کہا۔ ”مجھے قہوہ پینے کی خواہش ہو رہی تھی لیکن کل میں بازار سے قہوے کا ڈبّا لانا بھول گئی۔“

انیتا قہوہ اُدھار مانگنے کے لیے پڑوسیوں کے ہاں کیوں نہیں گئی؟ اس کی وجہ مسز کارلے کو معلوم تھی۔ انیتا کی عادت تھی کہ وہ اکثر پڑوسیوں سے اشیائے خوردنی اُدھار لیتی تھی لیکن کبھی واپس نہیں کرتی تھی۔ مسز کارلے جانتی تھی کہ اب کے سے مزید اُدھار کوئی نہیں دے گا اسی لیے وہ اُس کے پاس آئی ہے۔

انیتا نے کہا۔ ”اگر آپ کے پاس انسٹنٹ کافی ہو تو بہتر ہے۔“

مسز کارلے خوشگوار موڈ میں تھی۔ اُس نے فیاضی سے پیش کش کی۔ ”میں تمھیں اس سے بہتر کوالٹی کا قہوہ دیتی ہوں بلکہ میں تمھارے لیے ایک پیالی بنا کے لے آتی ہوں۔“ انیتا نے کچھ تکلّف کیا لیکن مسز کارلے فوراً اُٹھ کر باورچی خانے میں پہنچی۔ اُس نے چولھے پر پانی رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دو نفیس چینی کی پیالیوں میں قہوہ بنا کے لے آئی۔

انیتا بہت کسل مندی محسوس کر رہی تھی۔ گرم گرم قہوہ پیتے ہوئے اُسے کچھ فرحت حاصل ہوئی۔ مسز کارلے نے اُس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے اس وقت تمھیں آرام کی ضرورت ہے، شاید کل رات تم دیر تک جاگتی رہی ہو؟“

مسز کارلے کا یہ سوال بہت معنی خیز تھا۔ انیتا کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ رات کو دیر تک جاگنے سے مسز کارلے کی کیا مراد ہے؟ اُس نے فوراً بات بنائی۔ ”یہ بات نہیں مسز کارلے! دراصل آج صبح میری آنکھ خلافِ معمول جلد کھل گئی تھی۔ میرے سر میں شدید درد تھا، نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے میں پھر بستر پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تھی مگر میں پھر اُٹھ بیٹھی۔ سر کا درد اور شدید ہوگیا۔“

”یہ تو تمھارے چہرے سے ظاہر ہے۔“ مسز کارلے طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

انیتا بھی نفسیاتی مریضہ تھی اور اپنے راز چھپانے کے لیے معصومیت کا اظہار کرتی تھی۔ ”اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں رات بھر مے نوشی کرتی رہی ہوں تو یقین کیجیے ایسا نہیں ہے۔“ انیتا نے کسی قدر ترش لہجے میں کہا۔

مسز کارلے کچھ اور سوچ کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ”میرا خیال ہے تمھارا شوہر آرتھر اس دفعہ کچھ طویل دورے پر نکل گیا ہے۔ اُسے گئے ہوئے کتنے دن ہوگئے ہیں؟“

”تقریباً دو ہفتے ہوگئے۔“ انیتا نے جواب دیا۔

”اُس کے بغیر تو تم بہت تنہائی محسوس کرتی ہوگی؟“

انیتا پہلے بھی کئی بار مسز کارلے کی یہ طنز آمیز باتیں سُن چکی تھی اس لیے درشت لہجے میں بولی۔ ”ہاں آرتھر سے مجھے بہت لگاؤ ہے، میں اُس کی جدائی میں خود کو قطعی تنہا محسوس کرتی ہوں۔“

مسز کارلے نے صوفے کی پُشت سے ٹیک لگا کے ایک استہزائی قہقہہ لگایا۔ ”فرض کرو، اگر آرتھر کی ملازمت ایسی ہوتی جس میں اُسے کبھی دورے پر نہ جانا پڑتا تو کیا ہوتا؟ پھر تم کیا کرتیں؟“

”شٹ اپ، چڑیل!“ سچی بات تھی انیتا کو بُری لگ گئی۔

مسز کارلے اُس کے اس غیر متوقع ردِّ عمل پر بوکھلا گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اور زیادہ حیران کُن اور تکلیف دہ تھا۔ انیتا کے ہاتھ میں گرم گرم کافی موجود تھی۔ اُس نے دوسرے ہی لمحے آدھی بچی ہوئی کافی مسز کارلے کے اوپر پھینک دی۔ کچھ کافی اُس کے چہرے پر پڑی اور کچھ کپڑوں پر گری۔ مسز کارلے کچھ دیر کے لیے مبہوت رہ گئی۔ انیتا نے غصّے میں خالی پیالی اور پرچ زور سے فرش پر دے ماری اور بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔ مسز کارلے بپھری ہوئی اُس کے پیچھے لپکی لیکن انیتا اپنے زینے پر پہنچ چکی تھی۔ مسز کارلے اپنے دروازے پہ کھڑی ہو کے زور زور سے چلّانے لگی۔ ”نکل میرے گھر سے حرام زادی! احسان فراموش! بدمعاش!“ وہ بہت دیر تک وہیں سے مغلظات سُناتی رہی لیکن انیتا نے پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ اُس نے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

مسز کارلے کے شور سے پڑوس کی مسز پیرسن اور مسز وارٹن اپنی

بالکونیوں میں آگئیں۔ مسز کارلے کافی میں شرابور تھی۔ وہ بھنّتی بنی ہوئی بدستور چیخ رہی تھی۔ پڑوسنوں پر نظر پڑتے ہی اُس نے فریاد کی۔

"تم نے دیکھا؟ اس کمینی نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟" مسز پیرسن اور مسز وارٹز ہمدردی اور خاموشی سے اُسے دیکھتی رہیں۔ مسز کارلے چلّائی۔ "اُس نے میری ایک عمدہ اور قیمتی پیالی بھی توڑ ڈالی۔"

"وہی جس پر گلاب کی کلیاں بنی ہوئی تھیں؟" مسز پیرسن نے تاسّف سے دریافت کیا۔

"ہاں وہی۔ میں کم بخت سے اس کی قیمت وصول کر کے رہوں گی۔"

کچھ دیر بعد مسز پیرسن اور مسز وارٹز اپنے گھروں میں چلی گئیں۔ مسز کارلے وہیں کھڑی رہی اور انیتا کو بے نقط سُناتی رہی۔ آخر جب وہ چیختے چیختے بے دم ہو گئی تو واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس کے خاموش ہوتے ہی عمارت میں سنّاٹا چھا گیا۔

رات کے وقت مسز کارلے حسبِ عادت کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بلّی کی طرح تاریکی میں دیکھنے کی عادی تھی۔ آج اُس کی نظریں خاص طور پر سڑک کی طرف مرکوز تھیں اور اُس کے کان انیتا کے فلیٹ کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے سڑک پر ایک کار رُکی، ہلکا سا ہارن دیا گیا اور گاڑی کی بتّیاں بجھ گئیں۔ گاڑی کسی کے انتظار میں سڑک کے ایک جانب اندھیرے میں کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد انیتا کے فلیٹ کے چوبی فرش پر چلنے پھرنے کی آواز پیدا ہوئی۔ مسز کارلے فوراً سمجھ گئی کہ کار میں بیٹھا ہوا اجنبی مرد انیتا کا انتظار کر رہا ہے۔ دو تین منٹ بعد انیتا کے فلیٹ کا دروازہ انتہائی آہستگی سے کھلا اور بند ہو گیا۔ زینے سے آہستہ آہستہ نیچے اُترنے کی آواز آئی۔

مسز کارلے سوچنے لگی کہ کیا انیتا کو اسی وقت جا کے پکڑ لے اور چلّا چلّا کر پڑوسیوں کو جمع کر لے اور اُن کے سامنے اُس کے کردار کا ڈھنڈورا پیٹ دے؟ اس طرح وہ انیتا سے اپنا فلیٹ فوراً خالی کرنے کا مطالبہ کر سکتی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے سوچا کہ اگر انیتا کے بجائے اُسے کوئی نیک اور سیدھی سادی کرائے دار مل گئی تو وہ پڑوسیوں سے اُس کی غیبت نہیں کر سکے گی، اُس میں کیڑے نہیں نکال سکے گی اور نہ ایسی عورت کے ساتھ اُسے ہنگامہ آرائی کرنے کا موقع مل سکے گا۔

مسز کارلے ابھی تذبذب میں مبتلا تھی کہ انیتا زینے سے اُتر کر نیچے پہنچ گئی۔ اُس نے آہستہ سے پھاٹک کھولا اور سڑک پار کر کے سامنے کھڑی ہوئی کار میں لپک کے بیٹھ گئی۔ کار میں روشنی ہوئی۔ مسز کارلے نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا ہے۔ کار فوراً روانہ ہو گئی۔ مسز کارلے نفرت سے بڑبڑائی "آوارہ، بدچلن۔"

رات خاصی بیت چکی تھی۔ پڑوس کے گھروں میں سنّاٹا طاری تھا۔ مسز پیرسن اور مسز وارٹز رات کے وقت کہیں نہیں جاتی تھیں۔ انیتا کا فلیٹ مقفل تھا۔ وہ مجبور اور تنہا عورت اپنے آشنا کے ساتھ کسی کلب وغیرہ میں دل بہلا رہی ہو گی۔ مسز کارلے کے لیے اُس وقت ایک جھپکی لینا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر دراز تھی۔ اُس کے کان ہر آہٹ کے لیے مستعد تھے۔ انیتا کو گئے ہوئے مشکل سے دس پندرہ منٹ گزرے تھے۔ دفعتاً انیتا کے زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ مسز کارلے سمجھی کہ شاید انیتا اور اُس کا آشنا جلد واپس آ گئے ہیں لیکن جب اُس نے چاپ غور سے سُنی تو اُسے اندازہ ہوا کہ وہ صرف ایک شخص کے قدموں کی چاپ ہے۔ شاید انیتا اکیلی واپس آ گئی ہے؟ مگر نہیں یہ چاپ انیتا کی چاپ سے مختلف ہے۔ بھاری قدم کسی مرد ہی کے ہو سکتے ہیں۔ پھر دروازے کا قفل کھلنے کی آواز آئی لیکن بجلی کا سوئچ آن کرنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ یہ کون ہے؟ اور آخر تاریکی میں کیا کر رہا ہے؟ کوئی چور تو نہیں ہے؟ مسز کارلے خوف زدہ ہو گئی لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ فلیٹ میں داخل ہونے والے کے پاس دروازے کی چابی ہے اس لیے یہ کوئی چور نہیں ہو سکتا۔ یہ اندھیرے کے باوجود اطمینان سے گھر میں چل پھر رہا ہے۔ یہ یقیناً انیتا کا شوہر آرتھر ہے اور شاید اپنے دورے سے قبل از وقت واپس آ گیا ہے؟ لیکن اندھیرے میں وہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے بتّی کیوں نہیں جلائی؟

مسز کارلے یہ معمّا حل نہیں کر سکی لیکن اب وہ فلیٹ سے آنے والی مختلف آوازیں انتہائی انہماک اور توجّہ سے سُن رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ فلیٹ میں انیتا کا شوہر ہی ہے۔ قدموں کی آواز سے مسز کارلے کو اندازہ ہوا کہ آرتھر فلیٹ کے کمروں میں یہاں سے وہاں پھر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد مسز کارلے نے صوفے کے اسپرنگ دبنے کی ہلکی آواز سے یہ اندازہ کیا کہ آرتھر اب ڈرائنگ روم میں آ کے صوفے پر بیٹھ گیا ہے۔ شاید وہ تاریک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنی بیوی کا انتظار کر رہا ہے؟ مسز کارلے نے مخصوص آوازوں سے صورتِ حال کا صحیح اندازہ کر لیا۔ آرتھر کو شاید اپنی بیوی پر پہلے سے شک تھا اس لیے وہ رات کے وقت کسی اطلاع کے بغیر اپنے دورے سے واپس آ گیا ہے۔

مسز کارلے تصوّر میں آرتھر کو صوفے پر بیٹھا ہوا دیکھ رہی تھی۔ بیچارہ سیدھا سادہ، مسکین صورت دُبلا پتلا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس وقت اُس کے زرد اور مدقوق چہرے پر کیا تاثرات ہوں گے؟ بیچارہ آرتھر کمانے کے لیے سخت محنت کرتا ہے۔ آمدنی میں اضافے کی خاطر اُسے مختلف شہروں کے دورے کرنے پڑتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ انیتا کے لیے کرتا ہے لیکن خود اُسے انیتا کے ساتھ گھر رہنا بہت کم نصیب ہوتا ہے۔ کیا وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کہ اُس کی بیوی دوسروں کے ساتھ..... مسز کارلے نے سوچا کہ کیا آج آرتھر کو اپنی بیوی کی بے وفائی پہلی بار معلوم ہوئی ہے یا وہ یہ سب کچھ پہلے سے جانتا ہے؟ اور آج وہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے لیے آیا ہے؟ آرتھر کا آخری فیصلہ کیا ہو گا؟ مسز کارلے کچھ سوچ کر لرزہ براندام ہو گئی۔ رات بہت،

گزر چکی تھی اُوپر کے فلیٹ میں بدستور سناٹا تھا۔ آرتھر کے صوفے پر بیٹھنے کی آواز کے بعد اُسے کوئی آواز سُنائی نہیں دی تھی۔ غالباً آرتھر صبر و تحمل سے ساکت و صامت بیٹھا ہے اور اپنی بیوی کا انتظار کر رہا ہے؟ وہ فطرتاً ایک صابر آدمی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

⊙

ٹھیک ساڑھے تین بجے تھے مسز کارلے نے سامنے رکھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ سڑک پر وہی کار انیتا کو لے کے واپس آ گئی۔ اتنی رات گئے واپس ہونے کے باوجود شاید اُس کے دوست کا دل نہیں بھرا تھا۔ اس لیے وہ خاصی دیر تک انیتا کو گاڑی میں لیے بیٹھا رہا۔ مسز کارلے کے لیے مزید انتظار کرنا سوہانِ رُوح ہو گیا۔ آخر لوئے چار بجے کے قریب انیتا اپنا سُرخ میکسی سنبھالتی ہوئی کار سے برآمد ہوئی۔ اُس کے دوست نے اُس کے ساتھ اوپر آنے کی کوشش نہیں کی۔ انیتا جانتی تھی کہ اگر اُس نے ایسا کیا تو مسز کارلے فوراً پولیس کو بلا لے گی۔ انیتا کے اُترتے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ چند لمحوں بعد عمارت کا پھاٹک کھلنے کی آواز آئی۔ پھر زینے پر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ غالباً انیتا کا خیال تھا کہ مسز کارلے سو رہی ہو گی۔ فلیٹ کے دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا لیکن لائٹ آن کرنے کی آواز اس دفعہ بھی سُنائی نہیں دی۔ انیتا نے شاید احتیاطاً بتی نہیں جلائی۔ پھر فوراً آرتھر کی قدرے دھیمی آواز سُنائی دی۔ اس کے بعد انیتا کی ہلکی دبی دبی چیخ مسز کارلے کے کانوں میں پہنچی۔ غالباً آرتھر کو تاریکی میں خلافِ توقع وہاں پا کر وہ خوف سے چیخی ہو گی؟ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اُن دونوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ میاں بیوی میں شاید کچھ تکرار ہو رہی تھی مگر بہت آہستہ آہستہ تاکہ پڑوسی بیدار نہ ہو جائیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں؟ آرتھر اپنی بیوی پر کیا کیا الزامات عائد کر رہا ہے؟ اور انیتا کیا عذر پیش کر رہی ہے؟ یہ مسز کارلے نہیں سُن سکی لیکن اُسے یقین تھا کہ انیتا کچھ بھی کہے آرتھر اُس پر ہرگز اعتبار نہیں کرے گا۔ اُس نے پھر کان لگا کر غور سے اُن کی باتیں سننے کی کوشش کی لیکن مشکل سے صرف ایک آدھ لفظ سُن سکی۔ وہ سوچنے لگی کہ کاش وہ اس فلیٹ میں خفیہ مائکروفون نصب کروا سکتی۔

آرتھر اور انیتا کی گفتگو کوئی پانچ منٹ تک جاری رہی۔ اس کے بعد صوفے کی چرچراہٹ سُنائی دی پھر شاید آرتھر اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی آوازیں کچھ تیز ہو گئیں۔ انیتا کی آواز نسبتہً بلند اور تیز تھی۔ مسز کارلے کو محسوس ہوا کہ انیتا کی آواز میں لرزش ہے اور خوف کا عنصر نمایاں ہے۔

کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ اُن دونوں کی آوازیں ایسی غائب ہو گئیں جیسے ٹیلی وژن پر کسی خرابی کے باعث کوئی ڈراما یکلخت ختم ہو جائے۔ مسز کارلے تجسس میں کرسی سے اُٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی، اوپر جا کر دیکھے کہ اس یکایک خاموشی کی کیا وجہ ہے؟ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ بیٹھ گئی۔ وہ دونوں کہیں ہم آغوش تو نہیں ہو گئے؟ ظاہر ہے آرتھر اِس وقت محبت کے موڈ میں ہرگز نہیں ہو گا، پھر؟

اُسی لمحے کچھ آوازیں سُنائی دیں لیکن مسز کارلے اُن کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہی۔ صوفے پر بیٹھنے کی آواز آئی لیکن یہ آرتھر نہیں تھا۔ اُس کے بھاری قدموں کی آواز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر چل رہا ہے۔ شاید یوں ہی بے مقصد؟ مسز کارلے ان حرکات سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی۔ کچھ دیر بعد بتی جلا دی گئی۔ آرتھر کے چلنے پھرنے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ غصے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے اور انیتا صوفے پر بیٹھی ہوئی ہے مگر نہیں، صوفے کی چرچراہٹ پھر سُنائی دی۔ اس کے بعد فرش پر کوئی چیز گھسیٹنے کی آواز آئی، کیا کوئی کرسی یا اسٹول وغیرہ ہے؟ اور ڈرائنگ روم سے خواب گاہ تک کھینچا جا رہا ہے؟ پھر ایک نئی چرچراہٹ سُنائی دی۔ مسز کارلے کچھ نہیں سمجھ سکی۔ ڈرائنگ روم میں آرتھر کے قدموں کی آواز؟ بہت دیر سے انیتا کی آواز یا اُس کی چاپ سنائی نہیں دی؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ اب تقریباً پانچ بج رہے تھے۔ صبح کا تڑکا ہونے والا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آرتھر کے چلنے پھرنے کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ آخر مسز کارلے کو محسوس ہوا کہ اب آرتھر دروازے کی طرف آ رہا ہے۔ اُس کا خیال درست نکلا۔ فوراً دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ دروازے کا خودکار قفل بند ہوتے ہی کلک کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی آواز سے ظاہر ہوا کہ آرتھر زینے سے اُتر رہا ہے۔ مسز کارلے نے کھڑکی سے جھانک کر اُسے دیکھا۔ اُس نے اپنی کار فلیٹ سے کہیں دُور کھڑی کی تھی؛ غالباً وہ انیتا پر اپنی اچانک آمد ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زینے سے اُتر کر سڑک پہ ایک طرف مڑا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مسز کارلے کو یہ سب کچھ عجیب معلوم ہوا۔ آرتھر اس طرح اچانک گھر آیا پھر کچھ دیر بعد چلا گیا؟ آخر اس دوران میں اُس نے کیا کچھ کیا؟ مسز کارلے کو اُمید تھی کہ وہ انیتا کو ڈانٹے گا، پیٹے گا، انیتا کے رونے چیخنے کی آواز سُنائی دے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا؟ مسز کارلے سوئی نہیں۔ وہ اب انیتا کے متعلق جاننے کے لیے بے چین تھی۔ اُس کے کان بدستور فلیٹ کی طرف لگے ہوئے تھے لیکن اُسے انیتا کی کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ مسز کارلے شش و پنج میں مبتلا ہو گئی۔ انیتا اِس وقت یقیناً اپنی خواب گاہ میں نہیں تھی، تو پھر کیا صوفے پہ لیٹی ہوئی ہے؟ آخر سویرا ہو گیا لیکن مسز کارلے کو اپنے سوال کا جواب نہیں مل سکا۔

مسز کارلے نے ایک سخت تشویش ناک وقت گزارا۔ دوپہر کے قریب اِدھر اُدھر کوئی نہیں تھا۔ مسز کارلے چپکے سے زینے پر چڑھ کر انیتا کے

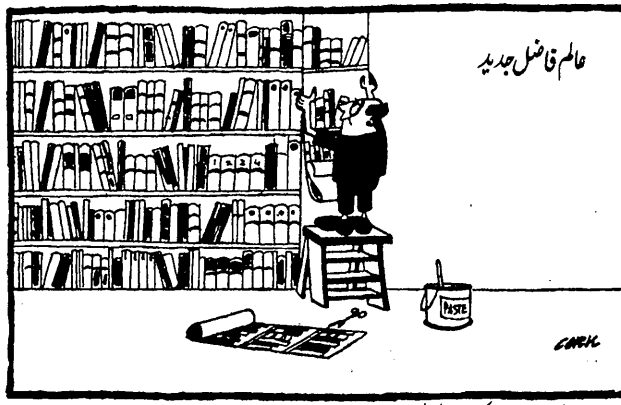

فلیٹ پہنچی۔ اس نے دروازے پر کئی دفعہ دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے اپنے فلیٹ میں آکے فون کیا۔ انیتا کے فلیٹ میں فون کی گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ مسز کارلے کو یقین تھا کہ انیتا فلیٹ چھوڑ کر کہیں نہیں گئی ہے۔ آرتھر اکیلا فلیٹ سے نکلا تھا کئی گھنٹے گزر گئے لیکن انیتا کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

رات تک مسز کارلے بری طرح تھک چکی تھی وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹی مگر اسے بہت اچٹتی ہوئی نیند آئی۔ اس کے کان رات گئے تک انیتا کے فلیٹ کی طرف لگے رہے۔ ممکن ہے اندر فلیٹ سے کوئی کھٹکا سنائی دے جائے لیکن صبح تک بدستور قبر جیسا سناٹا رہا۔

آخر صبح نو دس بجے کے قریب کسی دور افتادہ مقام سے مسز کارلے کو آرتھر کی ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ وہ حسبِ عادت نرمی اور آہستگی سے بول رہا تھا۔

"ہاں مسٹر آرتھر!" مسز کارلے نے اپنی بے چینی چھپاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"مسز کارلے! انیتا میرے پاس یہاں آگئی ہے اور کچھ عرصے یہیں رہے گی۔ میں فلیٹ کا کرایہ ہر مہینے آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ انیتا کو اپنی کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ چیزیں اس کے بڑے ٹرنک میں رکھی ہوتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا، بڑے سائز کا ٹرنک ہے۔ اس پر پھول بنے ہوئے ہیں۔ وہ اس کی خواب گاہ میں رکھا ہے آپ کو زحمت تو ہوگی، ایکسپریس سروس کے آدمی کو بلا کر وہ ٹرنک اس کے سپرد کر دیجیے۔ وہ مجھے یہاں بھیج دے گا۔"

اس نے اپنا پورا پتہ بتایا۔ مسز کارلے نے پتہ لکھ لیا۔ آرتھر نے بہت عاجزی سے درخواست کی تھی اس لیے مسز کارلے نے ٹرنک بھجوانے کا وعدہ کر لیا۔

مسز کارلے نے ٹیلی فون رکھتے ہی انیتا کے فلیٹ کی ڈپلی کیٹ چابی نکالی اور فوراً اوپر پہنچی۔ اس نے فلیٹ کھولا اور اندر پہنچ کے چاروں طرف ایک سرسری نظر ڈالی۔ ہر چیز بدستور اپنی جگہ موجود تھی۔ ڈرائنگ روم سے وہ سیدھی انیتا کی خواب گاہ میں پہنچی سامنے بچھے ہوئے ڈبل بیڈ کے نیچے وہ بڑا پھول دار ٹرنک رکھا ہوا تھا۔ وہ بہت زیادہ بڑا نہیں تھا تین ساڑھے تین فٹ لمبا تھا اور کوئی دو فٹ چوڑا تھا۔ اتنا ہی گہرا ہوگا۔ سبز رنگ پر گلاب کے سرخ پھول بنے ہوئے تھے۔ مسز کارلے نے اسے ہاتھ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ ٹرنک حفاظت کے ساتھ مقفل ہے۔ ٹرنک دیکھ کر اس پر یہ انکشاف ہوگیا کہ انیتا کہاں ہے؟

قتل پیر کی رات کو یا منگل کی صبح کسی وقت ہوا تھا۔ بدھ کو آرتھر نے ٹیلی فون کیا۔ آیندہ پیر کو آرتھر کا خط ملا خط میں اس نے ٹرنک فی الفور بھجوانے کی درخواست کی تھی۔ مسز کارلے نے اس کے خط کو کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ وہ اس معاملے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی اسے انیتا کی موت کا کوئی غم نہیں تھا بلکہ خوشی تھی کہ انصاف کا تقاضا پورا ہوگیا، چنانچہ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ آرتھر کو پولیس کے حوالے کرے۔ فی الحال وہ صرف اپنے متعلق سوچ رہی تھی۔ اسے انیتا کے ہاتھوں خاصی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ اس کی وجہ سے اکثر اسے مالی نقصان بھی ہوا تھا۔ وہ اب آرتھر سے ان امور کی تلافی چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب آرتھر انیتا کی فرمائش پوری کرنے سے بری الذمہ ہو چکا ہے لہٰذا وہ انیتا کے پرانے قرض بہرحال ادا کر سکتا ہے۔ مسز کارلے کو یقین تھا کہ ان حالات میں وہ آرتھر سے جتنی رقم چاہے آسانی سے وصول کر سکتی ہے اس لیے کہ اس کا ٹرنک اس کے قبضے میں ہے وہ اپنے منصوبے پر بہت خوش اور مطمئن تھی۔ وہ صرف انصاف چاہتی تھی۔ اس نے آرتھر کا خط پھاڑ کے پھینک دیا اور اس کا جواب لکھنے بیٹھ گئی۔

"ڈیئر مسٹر آرتھر!
آپ کا خط موصول ہوا جس میں آپ نے اپنی بیوی کے متعلق

کچھ لکھا ہے آپ کو جو پریشانی لاحق ہے میں اُسے دُور کر سکتی ہوں۔ آپ انیتا کے لیے کسی تشویش یا پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔ وہ فی الحال انتہائی معتبر ہاتھوں میں ہے۔ آپ مجھ پر پورا بھروسا کر سکتے ہیں میں آپ کی خاطر اُس کی مکمل نگہداشت کروں گی۔ وہ فی الوقت آپ کو خط لکھنے کے قابل نہیں ہے اس لیے اُس کے بجائے میں خط لکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اُس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ آپ کی بیوی اب باہر نہیں جاتی۔ وہ گھر میں مقید رہ کے خوش اور مطمئن نظر آتی ہے لہٰذا آپ اُس کی طرف سے قطعی فکرمند نہ ہوں۔"

خیر اندیش، ایما کارلے

مسز کارلے نے سوچا کہ یہ خط پڑھ کر آرتھر بدحواسی سے بھاگا ہوا آئے گا۔ اُسے اب پتہ چلے گا کہ میں ان معاملات میں ایک ہوشیار اور چالاک عورت ہوں۔ آرتھر اُس کی توقع کے مطابق چوبیس گھنٹوں کے اندر شہر پہنچ گیا۔ وہ دن کے وقت وہاں نہیں آیا بلکہ رات کی تاریکی میں چھپتا چھپاتا پہنچا۔ تقریباً آدھی رات کے بعد! زینے پر اُس کی چاپ سُنتے ہی مسز کارلے نے اُسے پہچان لیا۔ اُس نے اپنے فلیٹ پہنچ کے دروازے میں اپنی چابی لگائی لیکن قفل کھولنے میں ناکام رہا وہ کچھ دیر زور آزمائی کرتا رہا۔ آخر ناامید ہو کر نیچے اُترا۔ اُس نے مسز کارلے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ "اندر آجاؤ مسٹر آرتھر! دروازہ کھلا ہوا ہے۔" مسز کارلے نے کہا۔

وہ قدرے گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسز کارلے کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا "کیا میرے فلیٹ کا قفل بدل دیا گیا ہے؟" مسز کارلے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیوں؟" اُس نے پوچھا۔

"ٹرنک کی حفاظت کے لیے۔" مسز کارلے نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

"میرا خیال ہے فلیٹ کی ڈپلی کیٹ چابی صرف آپ کے پاس ہے؟"

مسز کارلے نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ آرتھر نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اُس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ "ہمیں ایک دوسرے سے کھل کر بات کر لینی چاہیے مسز کارلے!"

مسز کارلے آرتھر سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھی۔ اُسے آرتھر سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ آخر اس نے اپنی بیوی کو کس طرح قتل کیا ہوگا؟ یقیناً اُسے گلا گھونٹ کر مارا ہوگا اسی لیے نہ کوئی چیخ سُنائی دی تھی، نہ کہیں خون کا نشان نظر آیا۔ اُس کی نظر آرتھر کے ہاتھوں پر پڑی۔ اُس کے ہاتھ دبلے پتلے اور کسی قدر میلے تھے۔ مسز کارلے نے سوچا کہ آرتھر اس وقت یقیناً سخت مشتعل ہوگا۔

"آپ نے مجھے جو خط لکھا تھا مسز کارلے! بے شک وہ بہت ہوشیاری سے تحریر کیا گیا تھا لیکن آپ اُس میں ایک اہم بات لکھنی بھول گئیں۔ آپ نے میری ملکیت پر قبضہ کیا ہے۔ اُسے واپس کرنے کے لیے آپ کیا قیمت لینا پسند کریں گی؟"

مسز کارلے نے آرام کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ "دیکھیے مسٹر آرتھر! میں کوئی لالچی عورت نہیں ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ کی بیوی نے میرے ساتھ جو بدسلوکیاں کی تھیں، میری جو بےعزتی کی تھی، مجھے جو مالی نقصان پہنچایا تھا، ہرجانے کی صورت میں اُس کی تلافی ہو جائے۔ میں نے بہت دن صبر و ضبط سے کام لیا۔ میں یہ نہیں چاہتی مسٹر آرتھر کہ آپ بدنام ہوں میری خواہش ہے کہ آپ کی نیک نامی قائم رہے لیکن آپ کی بیوی کے ہاتھوں مجھے جو اذیتیں برداشت کرنی پڑی ہیں۔ آپ کو ان کا ہرجانہ ضرور ادا کرنا پڑے گا۔"

"کتنا ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا مسز کارلے؟"

"میں اس سلسلے میں سودے بازی پسند نہیں کروں گی۔ ایک مناسب رقم بتاؤں گی جو آپ سہولت سے ادا کر سکیں یعنی صرف دس ہزار ڈالر۔"

آرتھر کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "مسز کارلے! اتنی بڑی رقم میرے پاس کہاں ہے؟"

"آپ کہیں سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"مجھے توقع نہیں ہے کہ اتنی خطیر رقم مجھے کہیں سے مل سکتی ہے۔"

"میں آپ کو کچھ مہلت دے سکتی ہوں۔ اس دوران میں آپ کی بیوی میری حفاظت میں رہے گی۔ یہ بات میں نے اپنے خط میں بھی لکھی تھی۔ اور دیکھیے مسٹر آرتھر! اس خیال میں نہ رہیے کہ آپ رات کو کسی وقت فلیٹ کا تالا توڑ سکیں گے۔ میں بہت کچی نیند سوتی ہوں۔ ذرا سے کھٹکے سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ آپ نے ایسی کوئی کوشش کی تو یاد رکھیے میں فوراً پولیس کو طلب کر لوں گی۔"

"اوہ، پولیس ....."

"لیکن اس سلسلے میں زیادہ دیر نہ کیجیے گا مسٹر آرتھر! وہ اس بات پر جھنجلا رہی تھی کہ آرتھر اُس سے مرعوب کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ آپ کی بیوی آپ کی ملکیت اب تک میرے فلیٹ میں پڑی ہے لہٰذا کل سے اس فلیٹ کا کرایہ ایک ہزار ڈالر روزانہ ہوگا۔"

"دس ہزار ڈالر کے علاوہ؟" آرتھر کی بڑی بڑی آنکھیں ہر قسم کے جذبات سے عاری تھیں۔ "مسز کارلے! میں آپ کی پیش بندی بھی کر سکتا ہوں سمجھ لیجیے۔"

"ہاں اس صورت میں بے شک مجھے نقصان ہوگا۔" مسز کارلے نے تسلیم کیا۔ "لیکن آپ کو بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ قانون کی زد سے نہیں بچ سکیں گے۔"

مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی۔ مسز کلارے آرتھر کی تیز نظروں سے کترا رہی تھی لیکن اُس نے ہمت کر کے اُس کی طرف نظر اُٹھائی اور بولی "بہر حال میں رقم کا انتظام ہونے تک انتظار کروں گی۔"

آرتھر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ مسز کلارے نے فوراً کمرے کی بتی گُل کر دی تاکہ کھڑکی سے اُسے جاتا ہوا دیکھ سکے۔ اُس کی کار دکھائی نہیں دی۔ آرتھر کچھ دُور چل کے برابر کی گلی میں اُسی راستے پر مُڑ گیا جہاں سے وہ انیتا کو قتل کرنے کے بعد فرار ہوا تھا۔

آرتھر کے جانے کے بعد مسز کلارے کچھ سوچ کر خوف سے کانپ اُٹھی۔ اُس نے چاہا کہ آرتھر کو آواز دے کے واپس بُلا لے اور اُس کا ٹرنک اُسے دے دے لیکن جلد ہی اُس کا خوف دُور ہو گیا۔ بےشک اُس کا سابقہ ایک قاتل سے تھا لیکن اُس نے سوچا کہ وہ اُسے انیتا کی طرح آسانی سے ٹھکانے نہیں لگا سکتا۔ ممکن ہے وہ اُسے بھی قتل کرنا چاہتا ہو؟ لیکن انیتا کے تجربے کے بعد اُسے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ قتل کرنا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، اُس نے پہلا قتل چُھپانے کے لیے لاش ٹرنک میں بند کر کے اسٹیمر کے ذریعے منگوانے کا منصوبہ بنا لیا تھا لیکن وہ دوسری لاش کس طرح چُھپائے گا؟ ایک ٹرنک میں دو لاشیں کیسے سما سکتی ہیں؟ مسز کلارے نے سوچا کہ میں کوئی دُبلی پتلی اور پستہ قد عورت تو ہوں نہیں، خاصی بھاری بھرکم ہوں اور انیتا کی نسبت میرا وزن بھی پچاس ساٹھ پونڈ زیادہ ہو گا۔ ایک ٹرنک میں دو لاشیں بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی مسز کلارے نے سوچا کہ احتیاطاً وہ ٹرنک ایک بار اچھی طرح دیکھ لیا جائے۔

وہ فوراً اُٹھی۔ فلیٹ کی چابی گلدان کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ مسز کلارے چابی لے کے باہر نکلی اور اِدھر اُدھر دیکھ کے دبے پاؤں زینے چڑھنے لگی۔ اُسے خدشہ تھا کہ آرتھر ابھی بلڈنگ کے آس پاس ہی نہ ہو؟ اُس نے بہت احتیاط سے تالا کھولا۔ دروازہ کُھلا تو چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہو گئی۔ اُس نے دروازہ بند نہیں کیا تاکہ دوبارہ چرچراہٹ پیدا نہ ہو۔ اُس نے سوچا کہ وہ ٹرنک دیکھ کر فوراً واپس آ جائے گی۔ وہ صرف بکس کی وسعت کا اندازہ کرنا چاہتی تھی، چنانچہ سیدھی خواب گاہ میں پہنچی۔ ٹرنک کی لمبائی کوئی ساڑھے تین فٹ ہو گی یا زیادہ سے زیادہ چار فٹ۔ اُس نے سوچا کہ وہ ناپنے کا ٹیپ اپنے ساتھ لے آتی تو اچھا تھا۔ بہر حال لمبائی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لاش دُہری کر کے بھی رکھی جا سکتی ہے لیکن دو لاشیں؟ ٹرنک کتنا گہرا ہے؟ زیادہ سے زیادہ دو فٹ، ہاتھ پاؤں موڑ کر دونوں لاشیں رکھی جا سکتی ہیں۔ اُس کی ٹانگیں انیتا کے منہ کی طرف اور انیتا کی ٹانگیں.... گویا یہ ممکن ہے؟

خوف کی ایک سرد لہر اُس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اسی اثنا میں اسے دروازے کی چرچراہٹ سُنائی دی پھر جیسے کوئی دروازہ کھول کے اندر آیا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ یہ یقیناً آرتھر ہے۔ اُس نے سوچا اب وہ خود اُس کے جال میں پھنس گئی ہے۔ اب اُس کا بچنا مشکل ہے۔ اُس نے چیخنا چاہا لیکن اُس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اُس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

ڈرائنگ روم کے قالین پر قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اُسے اُس نے یہ کیا حماقت کی ہے؟ اُس نے آرتھر کے آنے کے لیے دروازہ کُھلا چھوڑ دیا تھا؟ اور خود ہی اُس کے لیے آسانی فراہم کر دی تھی؟ اب آرتھر کو اُس کی لاش فرش پر گھسیٹنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ وہ خود ٹرنک کے قریب کھڑی ہے اور اس دفعہ نچلی منزل پر کوئی آوازوں اور آہٹوں کی شہادت دینے والا بھی نہیں ہو گا۔ وہ آرتھر کے ہاتھوں یہیں قتل ہو جائے گی۔ کیا وہ یہ ٹرنک دفن کرے گا؟ وہ اور انیتا ایک ساتھ ایک قبر میں دفن کر دی جائیں گی؟ اُس نے ایک بار پھر چیخنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ یکایک کمرے کی بتی روشن ہو گئی۔ اُس نے نظر اُٹھا کے دیکھا سامنے آرتھر کھڑا ہوا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے پیچھے دو آدمی اور تھے، وہ سُراغ رساں معلوم ہوتے تھے۔ آرتھر ٹرنک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا "اُس ٹرنک میں دیکھیے اس عورت نے میری بیوی کی لاش اُس میں چھپائی ہے۔"

قرائنی شہادتیں بھی صاف تھیں۔ ڈاکٹروں نے انیتا کی موت کی جو تاریخ متعین کی وہ بالکل درست تھی۔ اُس روز آرتھر اپنے دورے پر شہر سے باہر تھا۔ اُس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ مسز کلارے نے دعوا کیا کہ آرتھر نے اُسے ٹیلی فون کیا تھا مگر یہ دعوا ثابت نہیں کیا جا سکا کیونکہ وہ کال کسی عام ٹیلی فون بوتھ سے کی گئی تھی۔ اُس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ اس کے علاوہ آرتھر نے مسز کلارے کو جو خط بھیجا تھا، وہ مسز کلارے نے تلف کر دیا تھا۔ تلف نہ کرتی تو بھی کچھ نہ ہوتا کیونکہ خط ٹائپ کر کے بھیجا گیا تھا۔

مسز پیرسن اور مسز وارٹنر نے بھی اپنے بیانات میں انیتا اور مسز کلارے کے آخری جھگڑے کا ذکر تفصیل سے کیا تھا اور اس واقعے کی تاریخ وہی بتائی تھی جو ڈاکٹروں نے انیتا کی موت کے تصدیق نامے میں لکھی تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جھگڑے کے بعد ہم نے انیتا کو نہیں دیکھا۔ اُن کے بیانات سے یہ بھی واضح تھا کہ مسز کلارے فطرتاً ایک لڑاکا عورت ہے۔

مذکورہ شہادتوں کے علاوہ آرتھر کے پاس مسز کلارے کا وہ خط بھی موجود تھا جس میں اُس نے لکھا تھا "تمھاری بیوی فی الوقت لکھنے کے قابل نہیں ہے اس لیے اُس کے بجائے میں خط لکھ رہی ہوں۔"

ایک شخص شراب نوشی کے انسداد کے متعلق لیکچر دے رہا تھا "فرض کیجیے کہ میں ایک بالٹی میں پانی اور دوسری میں شراب بھرتا ہوں، پھر میں ایک گدھا پکڑ کے لاتا ہوں۔ بتائیے وہ کون سی بالٹی سے پیے گا؟"

"وہ پانی والی بالٹی سے پیے گا" پیچھے سے آواز آئی۔

"لیکن وہ پانی ہی کیوں پیے گا؟" لیکچرار نے پوچھا۔

"گدھا جو ٹھیرا" جواب ملا۔

کراچی سے شکیل احمد بخاری کا جرعہ

جو کچھ میر جمشید عالم پر گزری اگر وہ آپ پر گزرتی؟

سب رنگ کے پُراسرار سلسلے موضوع، دل کشی اور تاثر کے اعتبار سے سب سے منفرد ہوتے ہیں

میر جمشید عالم کی آپ بیتی * ایک نوجوان کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات

ایک رات مجھ پر پھر وہی دورہ پڑا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے، دماغ بوجھل ہوگیا، سینے میں جلن ہونے لگی۔ میں بستر پہ موت و زیست کی کشمکش میں پڑا رہا اور میرے جسم پہ لرزہ طاری ہوگیا۔ میں نے اس عالم میں جو کچھ دیکھا وہ کسی کو بتانے سے قاصر تھا کیونکہ اس سے پہلے دو بار مجھ پہ یہ کیفیت طاری ہوئی تھی اور جب میں نے اپنے مشاہدات گھر میں بیان کیے تھے تو انھیں ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کے نظرانداز کر دیا گیا تھا مگر جب اس خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور دادی کے علاوہ چچا بھی اس ہولناک خواب کی نذر ہوگئے تو گھر والوں کو ہوش آیا۔ بہرحال میں نے اس دفعہ کسی سے ایک لفظ کہنے کی جرأت نہیں کی۔ اپنے اندر گھٹتا اور دعا کرتا رہا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے کاش وہ حقیقت ثابت ہونے کے بجائے میرا وہم ثابت ہو۔

میرا گھرانا والد، والدہ، بھائی اور ایک بہن پر مشتمل تھا۔ میری چھوٹی بہن یاسمین مجھے بہت چاہتی تھی۔ میرا آنا خواب اسی کے مستقبل سے تعلق رکھتا تھا اس لیے جب ایک نوجوان ڈاکٹر ارشد سے اس کی منگنی ہونے لگی تو میں نے حتی المقدور اس رشتے کی مخالفت کی لیکن میری کون سنتا؟ یاسمین پہ میرا کیا حق تھا؟ میں دل برداشتہ ہوکے گھر سے بھاگ گیا اور کلکتے جا پہنچا۔ کلکتہ ایک بہت بڑا شہر ہے لیکن وہ بڑا شہر ایک بے گھر نوجوان کے لیے کوئی جائے پناہ مہیا نہیں کر سکا۔ مسلسل دوڑ دھوپ کے باوجود مجھے نوکری بھی نہیں ملی چنانچہ ایک روز نامرادی کے عالم میں سڑکیں ناپ رہا تھا کہ جاسج نامی ایک زندہ دل مزدور سے میری ملاقات ہوگئی۔ وہ عجیب شخص تھا۔ اس نے فوراً میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور ہم دونوں جلد ہی برسوں پرانے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے بے تکلف ہوگئے۔ میں اس کے ساتھ گودی پر مال ڈھونے لگا۔ رات کو ہم دونوں جہاں جگہ مل جاتی پڑ جاتے۔ سورج اور چاند گردش کرتے رہے۔ کرسمس کے موقع پر جاسج نے اصرار کر کے مجھے دو پریوں سے ملوایا۔ ایک لال پری دوسری بانو۔ لال پری نے مجھے زیادہ متاثر نہیں کیا لیکن بانو کا نشتر میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ اس کی دل نشیں آواز، طبلے، ہارمونیم اور گھنگھروؤں کی آوازوں سے الگ ہوکے میرے دل میں سرایت کر گئی۔ دوسری طرف بانو بھی مجھے دیکھ کے ناچتے ناچتے ڈولنے لگی۔ میں نے تماشائیوں کی نگاہوں میں اپنے لیے رشک و رقابت کی چنگاریاں دیکھیں۔ اس طرح میں نے اپنی زندگی کی پہلی حسین شام گزاری۔ پھر میرا یہ معمول ہوگیا کہ ہفتے بھر جان توڑ محنت کر کے کچھ پیسے جمع کرتا اور بانو کے پاس پہنچ جاتا۔ ہم دونوں بتدریج ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے۔ بانو مجھ سے پیسے لینے کی روادار نہیں تھی لیکن اس کی ماں ستو بیگم بہرحال ایک نائکہ تھی۔ وہ آدمی کی آواز سکوں کی کھنک سے پہچانتی تھی۔ یہ معاملہ بہ حسن و خوبی چل رہا تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ یاسمین کی شادی ہونے والی ہے۔ یہ خبر ایک بم کی طرح میرے سینے میں پھٹی۔ میں دل پہ پتھر رکھ کے بانو اور جاسج سے رخصت ہوا اور اپنے گھر پہنچ گیا۔ شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ تیسرے روز برات آنے والی تھی۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن یاسمین کا وقت آ چکا تھا۔ وہ خوں رنگ جوڑے میں گھر سے ہمیشہ کے لیے وداع کر دی گئی۔ جلد ہی میرا ہیبت ناک خواب حقیقت بن کے سامنے آگیا۔ شادی کے صرف چند روز بعد میرا بہنوئی ڈاکٹر ارشد ایک صبح ہمارے ہاں آیا۔ وہ بہت وحشت زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے خلافِ عادت والد صاحب سے گستاخانہ لہجے میں بات کی اور کسی تمہید کے بغیر ان سے پوچھا کہ "کیچو کون ہے؟ اور اس کا یاسمین سے کیا تعلق ہے؟" نہ جانے کیچو کون تھی اور اس کے نام میں کیا راز تھا کہ والد صاحب اچانک چراغ پا ہوگئے۔ انھوں نے ارشد کو بری طرح جھڑک دیا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا یاسمین کو طلاق دینے کی دھمکی دے کر واپس چلا گیا۔ والد صاحب طیش میں اپنا پستول لے کے اس کے پیچھے لپکے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں ان دونوں کے تعاقب میں جس وقت ارشد کے گھر پہنچا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ والد صاحب ارشد کو گولی کا نشانہ بنا کے خودکشی کر چکے تھے۔ میں گھبرایا ہوا یاسمین کے کمرے میں گیا۔ میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ یاسمین ایک لاش کی صورت میں چھت سے جھول رہی تھی۔ میں بے ہوش ہوکے گر پڑا مگر یہ افسانہ ابھی تمام نہیں ہوا۔ ان صدمات کی تاب نہ لا کے جلد ہی میری والدہ بھی مجھے چھوڑ گئیں اور میرا بڑا بھائی سکندر گریبان پھاڑ کے نہ جانے کہاں چلا گیا؟ ان حالات میں اگر میرے شفیق پڑوسی مولوی عبدالحکیم میری غم خواری نہ کرتے تو آج میں بھی آپ کو یہ سرگزشت سنانے کے لیے دنیا میں موجود نہ ہوتا۔ میں اپنے سائیں سائیں کرتے ہوئے گھر میں ایک زندہ لاش کی طرح مدفون تھا کہ رانی پور سے میرا چچا زاد بھائی بختیار آیا اور اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ چچا جان ایک متمول آدمی تھے۔ بچپن میں ان کی لڑکی غزالہ سے میری بات طے ہو چکی تھی۔ یہاں آکے میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرا اجڑا ہوا گھر دوبارہ بس گیا ہو۔ غزالہ کی شہ پا کے میں نے رفتہ رفتہ بی اے کر لیا۔ یہ ایک خوشی کی بات تھی لیکن بدنصیبوں کو خوشی کہاں ملتی ہے؟ ایک روز چچا جان نے نہایت خوب صورتی سے میرے والد کو اپنا مقروض ظاہر کر کے مجھ سے میرا آبائی مکان اپنے نام منتقل کروا لیا پھر غزالہ کی منگنی بالا ہی بالا کہیں اور کر دی۔ پہلی بات تو میں پی گیا تھا لیکن دوسری بات مجھ سے ہضم نہیں ہوئی۔ میں نے شدید احتجاج کیا۔ احتجاج کا نتیجہ وہی ہوا جو عموماً ہوتا ہے۔ مجھے دھکے دے کے وہاں سے نکال دیا گیا۔ اب الٰہ آباد کا مکان بھی میرا نہیں رہا تھا کہ میں اس کے در و دیوار سے لپٹ کے روتا۔ ناچار اپنے دیوانے بھائی سکندر کو شہر شہر تلاش کرتا ہوا کلکتے آگیا۔ یہاں میری بانو تھی، میرا جاسج تھا۔ میں نے کوچۂ یار کے طواف کیے لیکن بانو نظر نہیں آئی۔ میں نے گلی گلی جاسج کو ڈھونڈا لیکن اس کا بھی کہیں پتہ نہ چلا۔ بے روزگاری، بے گھری اور بھوک کے سوا میرا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ ایسے میں آدمی کب تک زندگی سے مفاہمت کر سکتا ہے؟ چنانچہ میں ایک شام ڈوب مرنے کے ارادے سے دریائے ہگلی کے کنارے جا پہنچا لیکن اس سے پہلے کہ میں خود کو دریا کے سپرد کرتا ایک دل کش مترنم آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں چونک کے مڑا۔ ایک متناسب نسوانی ہیولا میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے میرا حوصلہ بیدار کیا۔ مجھے زندہ رہنے کی ترغیب دی اور بتایا کہ وہ کیچو ہے۔ کیچو؟ میرا دماغ جھن جھنا گیا۔ معاً کئی لاشیں میرے تصور میں گھوم گئیں۔ اس سے پہلے کہ میں دوڑتا اور اس کا گریبان پکڑ کے اس سے کچھ سوال کرتا وہ جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اسی طرح غائب ہوگئی۔ میں دل مسوس کے سر جھکائے ہوئے ایک طرف چلنے لگا۔ ابھی میں تھوڑی دور پہنچا تھا کہ ایک کار میرے قریب آکے رکی۔ اس میں سے عابد شیرازی اترا۔ شیرازی ایک زمانے میں میرا استاد تھا اور اب کلکتے کے ایک بینک میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس نے دوڑ کے مجھے لپٹا لیا اور خیر و عافیت دریافت کرنے لگا۔ میں نے اسے جستہ جستہ اپنی روداد سنائی۔ وہ دہل پڑا اور نہایت ہمدردی سے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ مجھے ایک بار پھر گھر کا آرام میسر آگیا۔ اب میں نے سکون سے جاسج کی تلاش شروع کر دی۔ آخر ایک روز وہ آوارہ گرد مجھے مل گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے سینے دکھائے۔ میری زندگی پھر خوش گوار ہوگئی مگر بانو کی کمی اب بھی کھٹکتی تھی۔ میں نے اس کی تلاش جاری رکھی۔ جلد ہی اس کا رشتے زیبا بھی میرے اندھیرے دل میں چراغ کی طرح روشن ہوگیا اور میں بلاناغہ اس سے ملنے لگا۔ ان دنوں اس کی ماں اسے کسی کے پہلو کی زینت بنانے کے لیے کسی دولت مند گاہک کی تلاش میں تھی۔ اس لیے اب ضروری ہوگیا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو میں بانو کو گناہ کی دلدل سے نکال لوں۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک جامع منصوبہ بنایا اور منصوبے کے مطابق میں ایک ایسے موقع پر اس کے ہاں جا پہنچا جب وہاں ایک افیونی بڑھیا کے سوا کوئی نہیں تھا۔ بانو زیورات اور نقدی کی پوٹلی لیے بے تابی سے میری منتظر تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا لیکن اس سے پہلے کہ ہم خاموشی کے ساتھ باہر نکلتے اچانک اس کی ماں ستو بیگم اپنے سازندے کے ساتھ وہاں نازل ہوگئی۔ وہ دونوں ہماری راہ میں حائل ہوئے۔ میں نے انھیں سمجھا بجھا کے رام کرنا چاہا لیکن وہ اپنی سونے کی چڑیا کو میرے ساتھ کیسے اڑنے دیتے؟ چنانچہ مجھے راستہ بنانے کے لیے مجبوراً خنجر نکالنا اور اس کا تیز دھار خنجر اس کے سینے میں اتارنا پڑا۔ ساتھ ہی ستو بیگم بھی میرے ہاتھوں بے موت ماری گئی۔ یہ سب کچھ ایسی عجلت میں رونما ہوگیا کہ مجھے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میرے ہاتھ زندگی میں پہلی بار سرخ ہوئے۔ میں ایسی صورت میں بانو کو اپنے ساتھ لے جانے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے ایک کمرے میں بند کر دیا اور بالاخانے سے نیچے اتر گیا۔ جاسج ایک ٹیکسی میں ہمارا منتظر تھا۔ اس علاقے سے نکل کے میں نے اسے سارا ماجرا سنایا۔ اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ اس نے خلوص و ہمدردی سے میری ڈھارس بندھائی اور مصلحتاً مجھے پہلی گاڑی سے بمبئی روانہ کر دیا۔ بمبئی کے ابتدائی دن بڑی دربدری میں گزرے کیونکہ ایک دُہرے قتل کا مجرم کہیں نوکری نہیں کر سکتا تھا لیکن جلد ہی میری مشکل آسان ہوگئی۔ ایک خوب صورت خانہ بدوش بھکارن ڈالی سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کا شوہر مر چکا تھا اور وہ اپنی نوجوانی بڑی کس مپرسی میں بے عزتی کی زندگی اور ایک گداگر سے گزار رہی تھی۔ ڈالی کمال اپنائیت سے مجھے اپنی جھگی میں لے گئی اور میں بے غیرت اس کے ٹکڑوں پر پلنے لگا۔ میں نے اسے اپنا نام شیر بتایا تھا۔ ڈالی بڑی قابلِ رحم عورت تھی لیکن وہ کانسٹیبل اس پہ قطعی رحم نہیں کھاتے تھے جو اسے بھیک مانگنے کی جگہ الاٹ کرتے تھے۔ ڈالی کو انھیں راتوں کے اندھیرے میں اپنے ہاں بلانا پڑتا تھا مگر میری آمد کے بعد وہ ان سے کترانے لگی تھی۔ پیٹ لیک کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت ہوگئی اور وہ اسے بہت ستانے لگے۔ ڈالی بمبئی سے بیزار ہوگئی۔ میرے لیے بھی وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں تھا چنانچہ ہم دونوں گرتے پڑتے کوٹلے کے راستے پورنامی ایک ریاست میں آگئے۔ یہاں ڈالی کی خوب صورتی اور میری وجاہت کی سفارش سے ہمیں ایک بہت بڑے رئیس پرکاش چند کے ہاں گھریلو ملازموں کی جگہ مل گئی۔ یہاں میں ہرن داس کے فرضی نام سے ملازم ہوا تھا۔ پرکاش چند اور اس کے بیٹے بلا کے رنگین مزاج تھے۔ رانیاں اور راج کماریاں اس معاملے میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔ نہ صرف یہ کہ ماحول مزے کا تھا بلکہ میرے لیے اس سے بہتر کمیں گاہ کوئی نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ میں نے بے حد مستعدی اور تابع داری کا مظاہرہ کیا اور رفتہ رفتہ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ پرکاش بھون کی سب سے خوب صورت

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

زنجیر اور پاک باز راج کماری شاردا مجھ پہ بے حد ملتفت ہو گئی۔ میں بھی بتدریج اُس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہم دونوں میں کچھ عہد و پیمان بھی ہو گئے۔ پرکاش چندر کا ولی عہد مہیش چندر بھی مجھ پر خصوصی نظر رکھتا تھا۔ دیوراج نامی ایک سادھو اکثر وہاں آتا تھا اور اُس کی بے پناہ عزت کی جاتی تھی۔ ایک دن وہ مہیش چندر کے کمرے میں موجود تھا اور ملازمین یکے بعد دیگرے اُس کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ میری بھی پیشی ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی سادھو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس کا یہ ردِ عمل میرے لیے ناقابلِ فہم تھا اور اس سے زیادہ ناقابلِ فہم مہیش چندر کا وہ سلوک تھا جو میرے ساتھ روز بروز بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ جلد ہی یہ گتھی کھل گئی۔ سادھو میرے ماضی سے واقف ہو چکا تھا اور اُس نے مہیش چندر کو بھی اس کی اطلاع دے دی تھی۔ گویا اب میں پوری طرح مہیش چندر کی مٹھی میں تھا۔ اُس نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھے اپنے باپ پرکاش چندر کے قتل پر مجبور کیا۔ میں سخت پریشان تھا مگر ڈالی نے میری پریشانی کسی حد تک دُور کر دی۔ وہ اُن دنوں ایک جہاں دیدہ حسینہ کی طرح اپنی جوانی سے خوب کام لے رہی تھی اور اُس نے اپنا ہاتھ پرکاش چندر کی خواب گاہ تک رسا کر لیا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ مل کے اس سلسلے میں ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا لیکن پوری کوششوں کے باوجود ہمارا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ آخر مہیش چندر سے ملی ہوئی مہلت کی آخری رات آپہنچی۔ میں بے چینی سے بھون کے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک پُراسرار کیچو نمودار ہوئی اور مجھے سکون سے سو جانے کی ہدایت کر کے فوراً غائب ہو گئی۔ دوسری صبح پرکاش چندر حیرت انگیز طور پر اپنی خواب گاہ میں مُردہ پایا گیا اور اُس کی موت کا سہرا میرے سر بندھا۔ مہیش چندر نے بظاہر مجھے نوازنا شروع کر دیا لیکن بہ باطن اُس کے عزائم خطرناک تھے۔ وہ مجھے راستے سے ہٹا کے اپنے باپ کے قتل کا ثبوت مٹا دینا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اُس کا پنجہ میری گردن تک پہنچتا، مجھے موقع مل گیا کہ میں اُسے ٹھکانے لگا دوں۔ ہوا یہ کہ ایک رات آنجہانی پرکاش چندر کی سب سے حسین و جمیل رانی پارو نے مجھے اپنی خلوت میں طلب کر لیا۔ یہ مہ پارہ آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اُس نے خلافِ توقع اپنی حکیمانہ اور ہیجان انگیز گفتگو سے مجھے مہیش چندر کا کام تمام کرنے پر آمادہ کر لیا اور مجھے پردے کے پیچھے چھپا کے بڑی خوب صورتی سے اُس بدنصیب کو بُلایا۔ پارو کا دیا ہوا خنجر میرے پاس تھا۔ چند لمحوں میں وہ خنجر مہیش چندر کے سینے میں اُتر گیا۔ اُسی وقت بجلی غائب ہو گئی۔ میں تیر کی طرح وہاں سے فرار ہوا اور چند پہرے داروں کو ابدی نیند سُلاتا ہوا بروقت تمام اپنے کوارٹر میں پہنچ گیا۔ پارو مہیش کے ساتھ ساتھ مجھے بھی زندگی کے جھنجٹ سے چھٹکارا دلا دینا چاہتی تھی مگر مجھ جیسے سخت جانوں کو ایسی آسانی سے مرنا کہاں نصیب ہوتا ہے؟ دوسرے دن نقشہ بدلا ہوا تھا۔ مہیش چندر کی لاش پارو کی خواب گاہ کے بجائے خود اُس کی خواب گاہ میں پائی گئی۔ قریب ہی اُس کا سیکرٹری مرا پڑا تھا۔ مہیش کے مرنے سے مجھے بہت سکون حاصل ہوا کیونکہ اُس نے مجھے دق کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُس کے اشارے پر بعض ملازمین ہلاک کر دیے گئے تھے اور یہ کوشش کی گئی تھی کہ اُن کی ہلاکت میں مجھے ملوث کر لیا جائے۔ بہرحال جلد ہی میں ایک رات دندناتا پارو کی خوابگاہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں اپنے پستول اور اپنی وجاہت کی بدولت میں نے اُس کے ساتھ ایک رنگین اور سنگین رات گزار کے اُسے پوری طرح شیشے میں اُتار لیا۔ پھر ایک اور ایسی ہی ملاقات کے بعد اُس میں اور مجھ میں کوئی بُعد نہ رہا۔ مہیش چندر کے بعد دنیش چندر اُس کا جانشین بنا۔ یہ نوجوان ذہین اور جوہر شناس تھا اس لیے اُسے اپنی طرف راغب کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ راجے پور کے اقتدار کے لیے چونکہ دنیش کے خاندان کے علاوہ کچھ اور رئیس خاندان بھی اُمیدوار تھے اس لیے پرکاش بھون سازشوں کا گڑھ بن کے رہ گیا تھا۔ انگریز بھی سرگرم کار تھا۔ دنیش چندر کی جان مستقل خطرے میں تھی۔ میں سر سے کفن باندھ کے اُس کی ڈھال بن گیا۔ اس طرح وہ مجھے نہ صرف اپنا محسن بلکہ دوست بھی سمجھنے لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے رازدار ہو گئے۔ دوستی کی علامت کے طور پر اُس نے مجھے ترنم نامی ایک مغنیہ سے بھی نوازا۔ ترنم کے ساتھ میں نے ایک مترنم رات بسر کی۔ حاسدوں اور مخالفوں کے لیے میری یہ مرتبت ناقابلِ برداشت تھی۔ خصوصاً ایک رئیس زادہ جگدیپ میرا جانی دشمن ہو گیا۔ مجھ پر کئی اوچھے وار کیے گئے لیکن پُراسرار کیچو مجھ پر ہمیشہ سایہ کیے رہی۔ ایک بار اُس نے نمودار ہو کے مجھے ایک سبز گولی کھلائی تھی اور کہا تھا کہ اس کی تاثیر سے تم پر کوئی زہر اثر نہیں کرے گا۔ کیچو کے حوالے سے سادھو دیوراج اور کرچھے والا ایک پنڈت الیشوری لال بھی مجھ سے بہت اپنائیت برتنے لگے تھے۔ اس بات نے کیچو کا وجود میرے لیے پُراسرار ہونے کے ساتھ ساتھ وقیع بھی بنا دیا تھا۔ انھی دنوں جگدیپ نے گھڑ دوڑ کے ایک مقابلے میں مجھ پر اپنا گھوڑا چڑھا دیا۔ میں نے غیر معمولی طور پر گھوڑا مع سوار سمیت اُلٹ دیا۔ جگدیپ کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ اس واقعے نے جہاں میری اہمیت بڑھائی وہاں مخالفوں کو اور چوکنا کر دیا۔ نتیجتاً مجھ پر بھون کے باہر ایک بھرپور حملہ کیا گیا اور مجھے بے قابو کر کے ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ بے بسی کی موت سامنے تھی۔ اگر کیچو وہاں نمودار ہو کے میرا حوصلہ نہ بڑھاتی تو میں دروازہ توڑ کے اُس زنداں سے نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ ان حالات میں دنیش میری طرف سے بہت فکرمند تھا۔ وہ ایک رات میرا دل بہلانے کے لیے میرا میک اپ کر کے مجھے راجے پور کے والی مہاراجا امرناتھ کی خصوصی ضیافت میں لے گیا۔ وہاں اُس نے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا کہ یہ ایرانی پروفیسر زاہدی ہیں۔ میں اپنی گُل افشانیِ گفتار اور بعض دوسرے کمالات سے مرکزِ نگاہ بن گیا۔ مہاراجا، راج کماری کنول، آفیسر اِن کمانڈ کرنل ہارڈنگ اور اُس کی شوخ بیٹی ریتا کے بقول میری شرکت حاصلِ محفل رہی۔ واپسی پر دنیش بہت خوش تھا کیونکہ میں آج اُس پر ایک نئے انداز میں منکشف ہوا تھا۔ روز و شب انھی ہنگاموں میں گزر رہے تھے کہ ایک رات دنیش چندر کو تیسری بار ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے دشمن نے زہر آزمایا تھا، پھر سانپ سے ڈسوانے کی سعی کی تھی۔ دونوں دفعہ اتفاق سے میں نے اس کی جان بچائی تھی اور اب اُس پر گولیاں برسا دی گئیں۔ خوش قسمتی سے وہ بچ گیا البتہ اُس کا ڈرائیور بے موت مارا گیا۔ ریاست کے تمام بڑے لوگ زخمی دنیش کی عیادت کے لیے آئے۔ ان میں کنول اور ریتا بھی شامل تھیں۔ اُنھیں مرنجاں مرنج پروفیسر زاہدی سے دوبارہ ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ بھون میں اگرچہ میں ایک ملازم کے روپ میں تھا لیکن اُن کی متجسس نظریں بار بار میری جانب اُٹھ رہی تھیں۔ ریتا پروفیسر زاہدی کو اپنا ہاتھ دکھانے کے لیے بے چین تھی۔ دنیش نے اُس کی دل جوئی کے خیال سے اس سلسلے میں پنڈت الیشوری لال کو بُلوا لیا۔ پنڈت نے اُس کا ہاتھ دیکھتے ہی کہا کہ اس ناری کے دل میں اسی زمین کا کوئی غیر معمولی شخص بس گیا ہے۔ اس انکشاف کے علاوہ اُس نے اُس کے سامنے مجھے بے حد تعظیم دی۔ اُس کا رویہ میرے متعلق ریتا کا شبہہ یقین میں بدلنے کے لیے کافی تھا۔ وہ گومگو کے عالم میں وہاں سے لوٹی۔ دنیش پر گولیاں چلنے کے واقعے نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ اب کوئی بہت بڑا اقدام اُٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے کی کڑیاں یقیناً جگدیپ سے ملتی تھیں۔ پرکاش بھون کی ایک چنچل اور لال مرچ قسم کی راج کماری پریت اور اُس کی ماں بینا رانی جگدیپ کی آلۂ کار تھیں نیز ایک قوی ہیکل مشٹنڈا پرشوتم اُن کا خصوصی معاون تھا۔ میں ایک مصمم فیصلہ کر کے ایک رات بینا رانی کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ وہ مجھے صرف ایک عورت کی نظر سے دیکھتی تھی اس لیے کھل اُٹھی لیکن میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کے اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ میں نے اُس سے جبراً فون کروا کے پرشوتم کو وہاں بُلوایا اور جب تک وہ پہنچا، میں نے گڑگڑاتی ہوئی بینا رانی کو ہمیشہ کے لیے بے آواز کر دیا۔ چند لمحوں بعد پرشوتم بہت احتیاط سے وہاں داخل ہوا۔ میں نے ہوشیاری سے اُسے پستول کی زد پہ لیا اور اسی حالت میں اُسے وہاں سے لے کے جگدیپ کی حویلی میں پہنچ گیا۔ اگرچہ وہ ہاتھی کا جسم رکھتا تھا لیکن میرے پاس پستول تھا اس لیے اُسے چوہے کی موت مرنا پڑا۔ میں نے اُسے مارنے سے پہلے اُس سے جگدیپ کے باپ کنور پردیپ کی خواب گاہ کا نقشہ اگلوا لیا تھا۔ اُس کے فرض سے سُبک دوش ہو کے میں چھپتا چھپاتا کنور پردیپ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا۔ وہ اپنی داشتہ کے ساتھ پہلے ہی مرا پڑا تھا اس لیے مجھے اُسے مارنا نہیں پڑا۔ صرف اُس پہ گولیاں چلانی پڑیں نیز اُس کے [illegible] کا خون ناحق بھی مجھے اپنی گردن پر لینا پڑا کیونکہ اُس کی چشمِ گناہ گار نے دروازہ کھولتے وقت مجھے دیکھ لیا تھا۔ ان معرکوں کے بعد جب میں پرکاش بھون پہنچا تو صبح کاذب کا وقت تھا۔ سادھو دیوراج اچانک باہر مل گیا اور اُس نے مجھے حفاظت سے بھون کے اندر پہنچا دیا۔ زخمی دنیش سو رہا تھا۔ اُس کی عزیز بہن شاردا برابر کے کمرے میں اُس کی تیمارداری کے لیے موجود تھی اور میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ میں تھکا ماندہ لوٹا تو اُس نے مجھے لِٹا دیا۔ میرے جوتے اُتارے اور غیر حاضری کا سبب دریافت کرتے ہوئے میرا سر دبانے لگی۔ ہم دونوں بےخودی کے عالم میں تھے کہ اچانک دنیش کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

دنیش کی اچانک آمد نے ہم دونوں پر سکتہ طاری کر دیا۔ دنیش نے گہری نگاہ سے ہمیں دیکھا اور جس طرح آیا تھا اُسی طرح اچانک پلٹ گیا۔ شاردا اُس کے پیچھے لپکی۔ میں نے خود کو نہ صرف کمرے میں بلکہ بھون میں بلکہ دنیا میں تنہا محسوس کیا اور کسی نہ کسی طرح وہاں سے اپنا بوجھ کوارٹر تک منتقل کر لیا۔ شاردا بھون کی سب سے قیمتی لڑکی اور دنیش کی سب سے عزیز بہن تھی۔ دنیش اور میں ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے تھے لیکن کیا دنیش ایک ملازم سے اپنی راج کماری بہن کی وابستگی برداشت کر سکتا ہے؟ اس سوال نے مجھے توڑ کے رکھ دیا۔ میں نے دل برداشتگی کے عالم میں ڈالی سے کہا کہ چلنے کے لیے تیار ہو جا۔ یہ مژدہ سن کے وہ حیرت اور مسرت سے دیوانی ہو گئی مگر جلد ہی اُسے پھر فرزانگی کے حوالے میں آنا پڑا کیونکہ شاردا، پارو اور خود دنیش کے خیال نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی اور میں تن بہ تقدیر ہو کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا اور رات سے صبح تک کے واقعات اور اُن کے ممکنہ نتائج میرے چاروں طرف آگ کی طرح بھڑکتے رہے۔ پھر دنیش کی طلبی پر میں ایک مجرم کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ اُس نے ایک سچے دوست اور عالی ظرف انسان کی طرح نہ صرف میری خطا سے اغماض برتا بلکہ اُس پر مسرت کا اظہار بھی کیا۔ میں نے رات جو کارنامہ انجام دیا تھا اُس نے دنیش کو مجھ سے اور قریب کر دیا تھا۔ پرشوتم، بینا رانی اور کنور پردیپ کے قتل نے بھون ہی میں نہیں پورے راجے پور میں دہشت پھیلا دی تھی۔ مہاراجا کی خصوصی ہدایت پر ریاست کا یہ بھیانک کیس اسپیشل پولیس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسپیشل پولیس کا آئی جی بھون کے بے شمار دوسرے ملازموں کے ساتھ مجھے بھی پولیس اسٹیشن لے جانے کے لیے آ گیا۔ یہ سب کچھ اُوپر کے اشارے پر ہو رہا تھا اس لیے دنیش اور پارو تمام تر کوشش کے باوجود مجھے نہ روک سکے۔ بس بے بسی سے منہ تکتے رہ گئے۔ جب میں آئی جی کے ساتھ جا رہا تھا تو راستے میں سادھو دیوراج ملا۔ آئی جی نے اُسے تعظیم دی۔ سادھو نے مجھے اُس کی حراست میں دیکھ کے حیرت کا اظہار کیا اور آئی جی کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن آئی جی دھرم کو دیکھتا یا دنیا کو؟ اُس نے معذرت طلب کی مگر اتنا ضرور ہوا کہ قصاب کی نظر میں میری حیثیت گلے کی تمام بھیڑوں سے مختلف ہو گئی۔ بھون کے کسی نامعلوم شخص نے پولیس میں خاص طور پر میری رپورٹ کی تھی اس لیے پولیس اسٹیشن پہنچ کے مجھ سے بہت معاندانہ، گستاخانہ اور چبھتی ہوئی باز پرس ہوئی۔ میں ہر سوال کے جواب میں ذہانت اور تحمل سے اپنی صفائی پیش کرتا رہا۔ وہ مجھ سے کچھ اگلوا نہ سکے۔ زبانی گفتگو سے اُن کی سیری نہ ہوئی تو انھوں نے میری پشت برہنہ کر کے مجھ پہ ہنٹر برسوائے۔ میں برداشت کرتا رہا۔ میری برداشت اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی اور ایک نادری حکم جاری ہوا کہ اسے پورا برہنہ کر دیا جائے۔ اب میرے لیے ضبط کرنا مشکل تھا لہٰذا جن سپاہیوں نے حکم کی تعمیل کرنے کی غلطی کی، مجھے اُن کے سر دیوار سے ٹکرانے پڑے۔ اس دیدہ دلیری سے پولیس پسیج گئی اور انھوں نے گفتگو ہی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا۔ اس بار اُن کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ پھر مجھے بڑے اعزاز سے رخصت کیا گیا۔ میں بھون پہنچا تو دنیش کی زبان اور شاردا کے ہاتھوں نے میرے زخم سینکے۔ سارا تکدر دور ہو گیا۔ پولیس کے تشدد نے شاردا اور دنیش کو میرے حق میں اور نرم کر دیا تھا مگر چہ میں پولیس اسٹیشن سے اطمینان بخش حالات میں لوٹا تھا لیکن حالات ہمیشہ اطمینان بخش رہنے کی کوئی ضمانت نہیں تھی چنانچہ میں نے ایک اضطراری فیصلہ کیا اور دنیش کے ذریعے زبردستی ایک بار پھر پروفیسر زاہدی کا روپ بھر کے کرنل ہارڈنگ سے ملنے کے لیے چھاؤنی پہنچ گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ کرنل نے میری آمد کی اطلاع ملتے ہی مجھے اندر بلوا لیا۔ ڈرائنگ روم پر اُس کی حسین و جمیل بیٹی ریتا میری منتظر تھی۔

سب سے پہلے میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اب ریتا کا جذبۂ شوق کس درجے پر ہے؟ میں نے ٹوٹے پھوٹے انگریزی لفظوں میں اُسے والہانہ مخاطب کیا۔ وہ میرے سادہ اور پُرکار انداز پر کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ گو ہمارے درمیان ترسیل کی کوئی مشترکہ زبان نہیں تھی لیکن جذبوں کی اپنی ایک الگ زبان ہوتی ہے جو ساری دنیا میں جانی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہم دونوں بچھڑے ہوئے اور منتظر لوگوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے۔ کرنل اندر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں جب اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے تپاک سے میرا استقبال کیا اور ہم میں جلد ہی دلچسپ نوک جھونک ہونے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ کرنل نے پرکاش بھون میں اپنے جاسوسوں کے ذریعے میری مخبری کرائی ہوگی۔ اُس کی بیٹی ریتا نے بھی پروفیسر زاہدی سے بے انتہا مشابہت کے ایک شخص موہن داس کو وہاں دیکھا تھا۔ کرنل کا لب و لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ جانتے ہوئے بھی سب کچھ نہ جاننے پر آمادہ ہے۔ میری آمد کا مقصد اُس سے پوشیدہ نہیں ہوگا۔ میں نے صاف لفظوں

میں اُس کے سامنے دنیش ست اپنی دوستی کا اعتراف کیا اور مبہم لفظوں میں یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے دوستوں کو نظرانداز کر رہا ہے۔ کرنل نے کسی قدر واضح انداز میں انگریزوں کی خدمات کے صلے کے طور پر مجھے معاوضہ دینے کی پیش کش کی۔ میں اس پر ناراض ہو گیا۔ میں نے دوستی کی بات پر اہمیت دی۔ چلتے وقت ریتا مجھے چھوڑنے آئی اور میں نے چشمہ ہٹا کے اُس گل بدن کو اپنی آنکھیں دکھائیں لیکن میں زیادہ دیر اُس کے پاس نہیں ٹھہرا۔ میں تو آتشِ شوق بھڑکا کے چلا آیا۔ پورچ میں انگلستان کی بنی ہوئی موٹر کار میری منتظر تھی اور میری جیب میں کرنل کا ایک کارڈ رکھا ہوا تھا جو مشکل وقت میں میرے لیے کرنل کی سفارش کی حیثیت رکھتا تھا۔ پرکاش بھون میں پروفیسر کے روپ میں داخل ہونا مناسب نہیں تھا چنانچہ میں چوک میں اتر گیا۔ اتفاق سے اُس وقت راج کماری کنول کی سواری بادِ بہاری گزری۔ اُس نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے گاڑی ریورس کرائی لیکن جب تک ہجوم میں گم ہو کے میں ایک تنگ گلی میں چھپ چکا تھا۔ پھر میں نے قریبی ڈاک خانے سے پارو کو فون کیا کہ اپنی گاڑی لے کر چوک میں آ جائے۔ اس دوران ایک دھوتی کرتا، چپل اور تھیلا خرید کے میں نے دکانوں کے گندے ٹوائلٹ میں لباس تبدیل کر لیا۔ پارو میرا حلیہ دیکھ کے دنگ رہ گئی لیکن اُس کے اصرار کے باوجود میں نے یہ نہیں بتایا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں اور کون سا معرکہ سر کر کے آ رہا ہوں۔ دنیش مجھے دیکھتے ہی بے قرار ہو گیا۔ میں نے اُسے صرف وہی باتیں بتائیں جنھیں بتانا ضروری تھا۔ ہم دونوں دیر تک اس ملاقات کے نتائج پر غور کرتے رہے۔ بھون سے پولیس ہٹالی گئی تھی۔ گویا مہاراجا راجے پور نے اپنے فیصلے پر جلد ہی نظرثانی کرنے کی دانش مندی کی تھی لیکن اُدھر مسئلہ یہ تھا کہ اگر کرنل ہارڈنگ اور ریتا اس طرف کا رُخ کریں تو میں کس حیثیت سے اُن کے سامنے آؤں گا۔ میں نے اس مسئلے کا یہ حل ڈھونڈا کہ ریتا کو فون کر کے چار پانچ روز کے لیے راجے پور سے باہر جانے کی اطلاع دے دی۔ رات کو میں نے دنیش سے رقص کی تربیت حاصل کی اور پارو کے ہاں جا کے اُسے آزمایا۔ اُس رات پارو نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ راجے پور کے سیاسی حالات آپس کی چپقلش، انگریزوں کی شاطرانہ چالوں اور خصوصاً میجر رابرٹ کی سازشوں کا ذکر پارو کے بیان کے مطابق میجر رابرٹ ایک عیاش طبع شخص تھا۔ اُس سے قریب ہونے کے لیے جگدیپ نے اُس کے سامنے راجے پور کی حسین لڑکیوں کا انبار لگا دیا تھا۔ لازماً میجر کا جھکاؤ جگدیپ کی طرف تھا اور میجر انگریز چھاؤنی میں غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ میں نے پارو سے درخواست کی کہ وہ چھاؤنی میں ربط ضبط دوبارہ بڑھانے کی کوشش کرے۔ پارو مجھے روکتی رہ گئی لیکن میں اُس کے پاس سے جلد ہی چلا آیا کیونکہ دنیش دلی سے آئی ہوئی ترنم کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں میرا منتظر تھا اور ترنم کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے راجے پور میں رہ جانے کی آرزومند تھی۔ اُس نے ٹوٹ کر مجھ سے اظہار کیا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ میں تو ایک سراب ہوں مجھے خود اپنی منزل کا پتہ نہیں، وہ کہاں تک ساتھ دے گی لیکن وہ ایثار پیشہ فیصلہ کر چکی تھی۔ میں اُسے دلی واپس بھیجنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا اور وہی ہوا جو پہلے ہوا تھا۔ دنیش ہمیں تنہا چھوڑ کے چلا گیا اور ترنم میرے پہلو میں تڑپتی مچلتی سسکتی اپنے عہد کی تجدید کرتی رہی۔ دوسرے دن دوپہر کو پروگرام کے مطابق پارو راجے پور سے دور ایک سنسان علاقے میں مجھے ڈرائیونگ سکھانے کے لیے لے گئی۔ وہاں ہم نے ایک حیرت ناک اور دلچسپ منظر دیکھا۔ ہم نے پریت اور رابرٹ کو ایک ساتھ دیکھا۔ خوش قسمتی سے انھوں نے ہماری گاڑی دیکھی تھی نہیں نہیں دیکھا تھا۔ گویا پریت میجر رابرٹ سے بعض فیصلے کرانے کے لیے اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ تین روز تک میں پارو کے ساتھ ڈرائیونگ سیکھتا رہا۔ میری ہدایت پر ایک رات دنیش نے میجر رابرٹ کو مدعو کر کے ترنم سے نغمہ سرائی کا اہتمام کیا۔ اِدھر میں نے پارو سے مسلسل رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ چوتھے روز دوپہر کے وقت بارہ بجے میں گیراج میں کھڑی ہوئی پارو کی کار کی ڈکی میں چھپ گیا۔ پارو مجھے راجے پور سے دور لے گئی۔ جہاں اُس نے میجر رابرٹ کو ایک خفیہ ملاقات کے لیے وقت دیا تھا۔ میں ایک جھاڑی میں چھپا ہوا تھا کہ مقررہ وقت پر میجر رابرٹ اپنی جیپ میں وہاں نازل ہوا۔ پارو گفتگو کرتی ہوئی رابرٹ کو اُس جھاڑی تک لے آئی جہاں میں نے اپنی سانس روک رکھی تھی۔ پارو نے پہلے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ میجر رابرٹ نے چھاؤنی سے چلتے وقت اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا ہے کیونکہ پارو نے اُسے بھون کی ایک اہم دستاویز اس جگہ سپرد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں جھاڑی سے کود کر باہر آ گیا اور میں نے رابرٹ کی گردن پر پستول کی نال رکھ دی۔ ہمیں اپنے کام میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میرے دو تین ہاتھوں ہی سے میجر بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اُسے بعجلت تمام پارو کی کار کی ڈکی میں ڈالا اور خود ڈرائیو کرتا ہوا گاڑی ایک اونچی ویران پہاڑی کے کچے راستے پر لے گیا۔ پیچھے پارو رابرٹ کی جیپ میں آ رہی تھی۔ اس بلند پہاڑی سے رابرٹ کو پھینکنے کے بعد اُس کی جیپ بھی لڑھکا دی گئی اور ہم دونوں آندھی اور طوفان کی رفتار سے چوک میں پہنچ گئے۔ میں ڈکی میں نظربند تھا۔ چوک میں چند ساڑیوں کی خریداری کے بعد پارو پرکاش بھون میں لوٹ آئی اور اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی ڈکی سے نکل کے دنیش کی خواب گاہ میں تحلیل ہو گیا۔

راہ داری میں آتے ہی سب سے پہلے میری نظر سندھیا پر پڑی۔

سندھیا وہ سویرا تھا جو بس اب، بس اب روشن ہوا چاہتا تھا، صبحِ صادق، بند کلی، آم کے درخت پر لٹکی ہوئی کیری، جس کا رنگ بدل رہا ہو اور شاخ جھکی جاتی ہو۔ وہ الھڑ لڑکی، اُس کے بدن نے آٹھویں جماعت پاس کر لی تھی اور وہ اتنی تیزی سے زندگی کے سبق پڑھ رہی تھی کہ اُسے بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ وہ روز ایک نئی لڑکی نظر آتی تھی، پہلے سے زیادہ رنگین، چمک دار اور تیز، وہ ککڑی کی طرح سرسراتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ لباس بھی اُس نے ایسا پہننا شروع کر دیا تھا کہ رنگ خود بخود توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے تھے۔ میں نے اُس سے نظریں بچانے کی کوشش کی لیکن اُس نے خود کو موتیا کے گملے کی راہ میں نصب کر دیا۔ اُس کی ہرن آنکھوں میں آگ لگ گئی تھی۔ یہ آگ اچانک نہیں لگ جاتی، غور و فکر کے بعد لگتی ہے، دھیمے دھیمے سلگتی رہتی ہے۔ اُس کی آنکھیں اُس کے بدن کے مقابلے میں جلد جوان ہو گئی تھیں۔ سندھیا کے چہرے پر زردی سی ہریالی تھی مگر اُس کا پھل اندر سے سرخ معلوم ہوتا تھا۔ بھون کی زمین ہی ایسی زرخیز تھی کہ دیکھتے دیکھتے لڑکیوں کی فصل لہلہانے لگتی تھی۔ میں نے وہ خوشۂ گندم ہٹا کے آگے نکل جانا چاہا۔ اُس وقت میرے ذہن میں ٹوچل رہی تھی۔ میں جلد سے جلد دنیش چندر کے پاس جانے کے لیے مضطرب تھا اور احتیاطاً بہت کم لوگوں کو اپنا چہرہ دکھانا چاہتا تھا لیکن اُسے داد دینا لازم تھا۔ ماتم کے وقت بانسری بجانے، بھوک میں باغ کی سیر کرنے کی صورت تھی۔ وہ ایک حسین شعر تھی، مرصع مسجع۔ وہ گردن سے پیروں تک کڑھا ہوا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایک چوغہ جس میں اُس کا قد اور لانبا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے اضطراب کے باوجود اُسے غور سے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے خطابات سے نوازنے میں کوتاہی نہیں کرے گی لیکن اُس نے میری نظر بھانپ لی تھی، اس لیے اُس کے سراپا کا تیور بدل گیا اور ایک تبسم اُس کے نازک ہونٹوں پر تیرنے لگا۔ "موہن!" اُس نے جھجکتے ہوئے پُرسوز آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "دیکھو میں کتنی بڑی لگتی ہوں۔"

"واقعی!" میں نے سرتاپا اُس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "آج تو آپ کمال لگ رہی ہیں۔"

وہ اترا گئی، لہرا گئی۔ "سچ؟" اُس کے لب پھڑکنے لگے۔

"دُور سے جب آپ نظر آئیں تو میں پہچان نہ سکا کہ یہ آپ ہیں یا کوئی اور" میں نے اپنی آنکھوں میں حیرت بھرتے ہوئے کہا۔

"اور جب میں قریب آئی؟"

"جب آپ قریب آئیں تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔" میں نے برجستہ کہا۔ "آپ تو، آپ تو، آپ تو بالکل بدل گئی ہیں۔ اُس دن آپ مجھ سے ناراض ہو گئی تھیں۔ ہیں نا؟"

"میں نے تمھیں معاف کر دیا۔" وہ ایک شان سے بولی۔

"اُس دن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"چھوڑو" وہ بے نیازی سے بولی۔ "تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ تمھارے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے مگر تم ملتے ہی نہیں۔"

"اب میں آپ سے ضرور ملا کروں گا۔"

"کہاں؟" وہ اشتیاق سے بولی

"جہاں آپ بلائیں۔ دیکھیے، اگر کسی نے آپ کو میرے ساتھ دیکھ لیا تو آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، مجھ پہ آفت آجائے گی۔"

"کیوں؟" وہ سادگی سے بولی۔ "یہاں سبھی عورتیں مردوں سے ملتی ہیں۔"

"مگر میری آپ کی بات اور ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"تو پھر چھپ کر ملیں، رات کو میرے کمرے میں آجاؤ۔"

میں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تو پھر باغ میں چلے چلیں گے، رات کو وہاں کوئی نہیں ہوتا۔"

"نہیں نہیں، سنا ہے رات کو باغوں میں سانپوں کا راج ہوتا ہے۔"

"ہم نہیں جانتے۔" وہ مچل کے بولی۔

راہ داری میں دیر تک اُس سے باتیں کرنا نامناسب تھی۔ میں نے گھبراہٹ کا اظہار بھی کیا لیکن آج اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے معاہدہ کیے بغیر نہیں ٹلے گی۔ میں نے کسی قدر تذبذب سے جواب دیا۔ "کیا کہوں، میرا خود آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ میں ملنے کی کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے آپ کو بتا دوں گا۔ پھر ہم وہاں چلیں گے اور خوب باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟" اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی۔ ہر ملازم میں ایک خوبی لازم ہے۔ ہاں کی خوبی۔ جو نا کرتے ہیں، وہ گدھے ہوتے ہیں اور انھیں چارہ نہیں ملتا۔

"کب؟" اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

"ذرا انتظار کیجیے۔" میں نے بے ربطی سے کہا۔ "بس دو ایک دن میں کوئی ترکیب نکال لوں گا لیکن آپ..." میں کہتے کہتے رک گیا۔

"میں کیا؟ تم کیا کہہ رہے تھے؟" وہ ضد کرنے لگی۔

"میں سوچتا ہوں، آپ پھر غصے نہ ہو جائیں۔ آپ راج کماری ہیں۔ آپ کے غصے سے ڈر لگتا ہے، آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"ہُوں۔" اُس نے ایک ادا سے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "پہلے کی بات اور تھی۔ تم کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔ خیر یہ بتاؤ" اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "لوگ تم سے بہت ناراض ہیں؟"

"کون لوگ؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔" میں نے چونک کر پوچھا

"پتہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں تم کوئی بہت خطرناک آدمی ہو۔ ہر جگہ تمھارا ذکر رہتا ہے، لوگ تمھیں پسند نہیں کرتے۔"

"اور کیا کہتے ہیں، آپ مجھے نہیں بتائیں گی؟"

"نہ جانے کیا کیا بکتے رہتے ہیں، بہت سی باتیں ہیں۔" وہ چہکتی ہوئی بولی۔ "میں یہاں تمھیں نہیں بتا سکتی، آؤ باہر چلیں۔"

"نہیں، یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ یہ بتائیے، آپ تو مجھے بُرا نہیں سمجھتیں؟"

وہ شرما گئی۔ "اب میری تمھاری دوستی ہو گئی ہے۔"

"لیکن ایک شرط ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "آپ کسی کو نہیں بتائیں گی، کسی کے سامنے مجھ سے اپنی دوستی کا اظہار نہیں کریں گی ورنہ لوگ میرے اور دشمن ہو جائیں گے۔"

وہ کہیں گم ہو گئی، پھر چونک کر بولی۔ "مگر اب تم مجھ سے ملتے رہو گے نا؟"

اُس نے میری شرط قبول کر لی تھی۔ وہ لڑکی، مصورِ حسن کا پیکر تراشنے کے لیے مُو قلم سنبھالے بیٹھے ہوں، وہ شاخِ نازک، مجھے اپنی سادگی پہ ترس آیا۔ یقیناً میں نے اُس کی توہین کی تھی۔ سانپنی بانہوں کا جو اعزاز وہ میری گردن میں ڈالنے کے لیے آمادہ تھی، میں نے اُس کی قدر نہیں کی تھی۔ قرعۂ فال میرے نام نکل آیا۔ بھون میں کسی نہ کسی ملازم یا راجے پوت کے کسی نہ کسی نوجوان کے نام تو نکلتا۔ میں نے خود کو ملامت کی۔ بھون میں اتنے دن رہنے کے باوجود یہ چھوٹی سی بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ سندھیا، کتنے سر اُس کے خوابوں سے بوجھل رہیں گے۔ وہ راتیں، وہ دن بس آیا ہی چاہتے تھے جو اس کی یاد میں بے قرار رہیں گے۔ شیرینی تقسیم ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ دراز کرنے میں بخل کیا۔ میں نے نقصان اٹھایا۔ پرکاش بھون میں اپنے ایک دوست سے دُور رہا۔ سندھیا میرے لیے ایک ریکارڈ ثابت ہوتی۔ جس میں لفظ قید ہو جاتے ہیں اور جب انھیں سوئی کے نیچے رکھو، چغلی کرنے لگتے ہیں۔ سامنے سے مہارانی مایا دیوی آرہی تھیں، میں ایک طرف کھسک گیا۔ اندھیروں، مجازوں اور پردوں میں التفات پروان چڑھتا ہے۔ میں سندھیا کو اس ابتدائی نکتے سے آشنا کرنا چاہتا تھا۔

ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ہم بھون سے بارہ بجے روانہ ہوئے تھے۔ تین سوا تین گھنٹے بعد میں بھون میں موجود تھا اور اس مختصر عرصے میں ایک اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے مجھے یہ اندازہ کرنا تھا کہ میری عدم موجودگی میں کسی کو میری ضرورت تو محسوس نہیں ہوئی؟ پرکاش بھون کی اس کثیر آبادی میں کوئی بھی کسی وقت مجھے طلب کر سکتا تھا۔ کوئی رانی،

راج کماری، راج کمار یا کوئی اور شخص، کسی کو بھی میرا خیال آسکتا تھا۔ گو ایسی طلبیاں اب بہت کم ہو گئی تھیں۔ سب کو معلوم تھا کہ میں صرف دنیش چندر کے لیے مخصوص ہو گیا ہوں۔ بھون میں سب کے اپنے اپنے ملازم اور باندیاں تھیں۔ پھر بھی کہیں سے میرے نام کی پکار ہو سکتی تھی۔ کسی نے مجھے بھون سے آتے جاتے تو نہیں دیکھا تھا پھر بھی ہر ممکن احتیاط برتی تھی۔ میری نظروں میں میجر رابرٹ کا خوف زدہ چہرہ گھوم رہا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والا واقعہ ذہن سے جھٹکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ راہ داری میں میری رفتار معمول پر تھی۔ کوئی قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ میرے سینے میں ایک طوفان اٹھا ہوا ہے۔ کتنے چہرے میری طرح ہوتے ہیں۔ دنیش چندر دروازے کے سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہیما اور کسم بھی وہاں موجود تھیں، ایک اور نئی لڑکی بھی وہاں فروکش تھی، فروکش میں نے یوں کہا کہ وہ کوئی شہزادی تھی جو اس ایوان میں جلوہ فرما تھی۔ میں نے اُس شفق رنگ کو اس سے پہلے یہاں نہیں دیکھا تھا۔ سبھی اُس میں منہمک تھے لیکن میری آمد نے سب کو درہم برہم کر دیا۔ "یہ کون ہے؟" فوراً لڑکی نے تیز انگریزی میں دنیش سے پوچھا۔

"ہمارا خاص ملازم موہن داس۔" دنیش نے کسی قدر فخر سے کہا۔

"اوہ ـــ" اُس نے انگریزوں کے انداز میں کچھ کھینچ کر یہ لفظ ادا کیا۔ "مارولس، مجھے اسے دیکھنے کی تمنا تھی۔"

"کیوں ـــ؟" دنیش نے تعجب سے کہا۔

"اس کے تذکرے بہت سنے ہیں۔" اُس کے لہجے میں ایک کاٹ تھی جو محسوس کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔

"تم کہاں تھے موہن داس؟" دنیش مجھ سے اپنی رغبت چھپا نہ سکا۔

"آپ بھول گئے، میں اگلے کمرے کی ترتیب بدل رہا تھا۔ آپ ہی نے تو حکم دیا تھا۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا۔ دنیش جز بز سا ہوا مگر فوراً سنبھل گیا۔

"تم نے ریکارڈوں کو تو نہیں چھیڑا۔" اُس نے تندی سے پوچھا۔

"نہیں جناب، میں نے انھیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"اب تو تم نے ہزاروں ریکارڈ جمع کر لیے ہوں گے؟" خوش جمال لڑکی نے دنیش سے پوچھا۔ "لندن میں لوگ موسیقی سے تمہارے غیر معمولی ذوق کا اب تک تذکرہ کرتے ہیں۔"

"میں نے وہ سب تقسیم کر دیے۔ فرصت ہی نہیں ملتی، دن بھر طرح طرح کے ریکارڈ سنتا رہتا ہوں۔ پُر اسرار اور خوف ناک ریکارڈ۔" نہ جانے کیوں دنیش اُس عظیم الشان لڑکی سے متاثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے قریب ہیما اور کسم جیسی حسین لڑکیاں بیٹھی تھیں مگر وہ سب میں ممتاز تھی۔ دولت کا رنگ اُس کے چہرے سے پھوٹ رہا تھا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ جگدیپ کی بہن اور آں جہانی کنور پردیپ کی لڑکی ہے۔ شوکت و سطوت اُس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔ اُس کا نام انیتا تھا۔ وہ انگلستان سے اپنے باپ کے انتقال پُر ملال کی خبر سن کے تازہ تازہ وارد ہوئی تھی۔ گویا میں ہی اُس کے بلانے کا سبب تھا۔ میں خاموش کھڑا ہوا اُن کی گفتگو سنتا رہا۔ راج کماری انیتا ایک شریر، طرح دار لڑکی تھی۔ کئی بار اُس سے میری نگاہوں کا تصادم ہوا اور اُس کے چہرے کا رنگ بدلا، آنکھوں میں خیرگی پیدا ہوئی۔ میں ایک ملازم، ایک ستون کی طرح ایستادہ رہا۔ تمام ملازم متحرک ستون ہوتے ہیں۔ ملازموں کو ہنسنے کا موقع نہیں ملتا مگر وہ دل ہی دل میں اپنے آقاؤں کی نیرنگی پر خوب ہنستے ہیں۔ سب کچھ سمجھتے ہیں اور کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتے۔ چائے کے دوران میں دنیش نے انیتا سے درخواست کی کہ وہ اپنے ہاتھ سے چائے بنائے۔ جب وہ پیالیوں کی طرف جھکی اور اُس کی نظروں کو میرا جائزہ لینے کی تھکن سے آرام ملا تو دنیش کو مجھ سے اشاروں میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھ سے پوچھا، "کیا خیال ہے؟" میں نے اسی انداز میں اسے جواب دیا۔ ؏

عقل حیراں ہے کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

مجھے دنیش کی قسمت پر رشک آیا۔ راج کمار کے لیے کتنی حسین لڑکیاں چائے بنانے کے لیے تیار رہتی تھیں۔ ادھر میرے جسم میں شدید دکھن ہو رہی تھی۔ اعصاب تڑخ رہے تھے۔ مایوسی حالت میں ایک پیالی چائے اور وہ بھی انیتا کے ہاتھ سے مل جاتی تو سارا تکدّر دُور ہو جاتا۔ چائے بنانے کے بعد انیتا نے مجھے گھورنے اور تاکنے کا وتیرہ نہیں چھوڑا۔ میں نے کوئی تاثر نہیں دیا حالانکہ بہت سے تاثر دینے کو طبیعت مچل رہی تھی۔ جگدیپ کی کئی بہنوں کے دیدار کا شربت پیا تھا مگر جو بات اس ماہ جبیں، زہرہ جمال میں تھی، وہ کسی میں نہیں تھی۔ اُس کے رخساروں پر انگلستان سے جدائی ہوئی سرخی دمک رہی تھی۔ در آمدہ سرخ سیب، قندھاری انار۔ میں نے محسوس کیا میری تائید کے باوجود دنیش چندر اُس کی دل نشیں صحبت سے کماحقہ محظوظ نہیں اٹھا رہا ہے۔ وہ کچھ بے چین سا تھا یا یہ میری بے چینی تھی۔ ہاں یہ میں ہی پریشان تھا۔ سامنے حسین لڑکیاں تھیں اور یہ ریاست راجے پور میں سب سے محفوظ جگہ تھی مگر کچھ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی کوئی پشت سے آ کے مجھے ڈرا دے گا یا یہ چھت گر پڑے گی۔ میجر رابرٹ کی موت کا صدمہ بتدریج میری رگوں میں سرایت کر رہا تھا۔ اندر حبس ہو تو گلستان بھی صحرا نظر آتا ہے۔

ممکن ہے شام تک، کل تک یا ایک دو روز بعد میجر رابرٹ کی شکستہ دریدہ لاش برآمد ہو جائے۔ شام کو جب چھاؤنی کے افسران کرنل ہارڈنگ کو میجر کی گم شدگی کی اطلاع دیں گے تو وہ سمجھے گا میجر راجے پور کے کسی رئیس کے ہاں مجرا سن رہا ہو گا یا کسی ہندوستانی لڑکی کو دادِ عیش

ڈے رہا ہوگا مگر وہ چھاؤنی میں اطلاع ضرور کرتا کہ آج رات اُس کی واپسی ممکن نہیں ہے، وہ صبح تک اُس کا انتظار کریں گے۔ راجے پور کے تمام بااثر خاندانوں میں میجر کی آمد و رفت تھی سو وہ ایک ہر دل عزیز شخص تھا۔ سب سے بڑی خوبی اُس میں انگریز ہونے کی تھی۔ اُس زمانے میں علم و فضل کی بنیاد انگریزی کی جان کاری ہوگئی تھی، جو اپنے مالکوں کی زبان سے ناآشنا ہو، اُس کی ذہانت مشکوک ہوتی ہے۔ ریاست راجے پور میں شستہ فارسی آمیز اردو بولی جاتی تھی۔ ہندی کے لفظ شاذ شاذ ہی استعمال ہوتے تھے مگر اب انگریزوں کے جدید اسکول کھل گئے تھے اور بڑے خاندانوں کے لڑکے لڑکیوں کا انگلستان جا کے سند حاصل کرنا وجہِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ میجر رابرٹ اور دوسرے انگریزوں کو ہندوستانیوں سے قریب لانے کے لیے ہندوستانی سیکھنی ضروری تھی۔ محکوموں نے اپنی وفاداری اور اطاعت کا کچھ اس سے بڑھ کے مظاہرہ کیا تھا۔ اُن کی کوشش یہاں تک ہوتی تھی کہ وہ خواب بھی انگریزی میں دیکھا کریں۔ میجر رابرٹ نئی تہذیب کا نمائندہ تھا، برطانیہ عظمیٰ کا کارندہ، ہندوستانیوں کے لیے اُس میں بڑی کشش تھی۔ میں نے میجر کا فیصلہ کرنے میں کوئی جلدی نہیں کی تھی۔ کام ہر لحاظ سے مکمل، بے داغ طور پر انجام پایا تھا لیکن جو جو لمحہ گزر رہا تھا، وہ اُس سے مرتب ہونے والے اثرات کی شدت کا احساس فزوں کر رہا تھا۔ ہائی کمان اپنے ایک محترم شخص سے محروم ہو جانے پر کیسے خوفناک فیصلے کر سکتی ہے، شبہ بہت سے خاندانوں پر جائے گا۔ انگریز اپنے اعلادماغ ان وجوہ کی سائنسی چھان بین میں صرف کریں گے جن سے میجر رابرٹ دوچار ہوا۔ تحقیق و تفتیش کے دفتر کھل جائیں گے۔ میں سوچ رہا تھا، کہیں کوئی سقم تو نہیں رہ گیا؟ اگر عجلت میں کوئی نادانی ہوگئی ہے تو کیا ہوگا؟

کیا ہوگا؟ جو ہر بار ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے، وہی ہوگا۔ کالا پانی نصیب ہوگا یا شارعِ عام پر پھانسی کا تماشا ہوگا۔ لوگ بھی کیا یاد کریں گے، تھا ایک شخص، موت کا یہ سبب ہو تو کچھ ایسا ناگوار نہیں، اب جو ہونا ہے وہی ہوگا۔ غصّہ تو سرکار کو آئے گا، شکنیں تو جبینوں پر پڑیں گی۔ ممکن ہے وہ بُو سونگھتے سونگھتے مجھ تک پہنچ جائیں۔ پروفیسر زاہدی کا کردار خاصا مشکوک ہے، پروفیسر زاہدی کو بھون میں کسی نے نہیں دیکھا اور جس نے دیکھا اُس نے موہن داس کے خطوخال اور پروفیسر میں گہری مشابہت پائی۔ موہن داس دنیش چندر کا سایہ ہے، جب زہریلا دودھ دنیش چندر کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے تو اُسے پتہ چل جاتا ہے۔ موہن داس وہ سانپ بھی دیکھ لیتا ہے جو دنیش کو ڈسنے کے لیے اُس کے بستر میں چھپا بیٹھا تھا۔ موہن داس اور دنیش کا تعلق عشق اور مشک کی طرح رُسوا ہو رہا ہے۔ انگریز میجر رابرٹ کے سلسلے میں میرا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئے تو دنیش چندر، اُس کا خاندان اور خصوصاً پاروتی بھی عتاب میں آجائے گی۔ صرف میں ہی نہیں کہ میری زندگی تو یوں بھی مستعار ہے۔ میرے اقدام سے کتنے لوگ متاثر ہوں گے، پارو متاثر ہوگی کہ اس نے اپنی ذات ترک کر دی تھی۔ دنیش چندر کو معتوب قرار دے دیا جائے گا اور جگدیپ کے گھر میں چراغاں ہوگا۔

نہیں میں اتنے الزامات کا متحمل نہیں ہو سکوں گا مگر میں کہاں ہوں گا میجر رابرٹ کی موت، میں نے خود کو متنبہ کیا۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ اس کے نتائج سے نمٹنے کا ہے۔ ہم تین گھنٹے میں بخیر و خوبی کام نمٹا کے واپس آگئے تھے۔ کسی موقع پر دنیش چندر یہ گواہی دینے کے لیے تمام تر ایثار کرے گا کہ میں اس عرصے میں کہیں باہر نہیں گیا۔ کوئی نشان ہم نے نہیں چھوڑا تھا۔ میجر کی موت ایک اتفاقی حادثہ بھی قرار دی جا سکتی تھی اور شک صرف مجھی پر کیوں کیا جائے گا؟ اس کی منطقی وجوہ موجود ہونی چاہئیں۔ میں نے اپنے آپ سے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔ کیا میں عواقب سے خوف زدہ ہوں؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟ نہیں، میں نے تمام امور پر غور کر کے یہ قدم اٹھایا تھا۔ میں قطعاً خوف زدہ نہیں ہوں لیکن میں نے خود سے جھوٹ بولا۔ میرا دل اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ رگ و پے میں چمک سی ہو رہی تھی۔ سرد لہریں اٹھ رہی تھیں۔ جسم بھیگا ہوا تھا، پیشانی کھنچی ہوئی تھی، آنکھوں میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ میری پوری توجہ سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں پر تھی۔ لوگ بڑے حسین تھے، میں اُن کی دل رُبا باتیں، لطیفے، چٹکلے سن رہا تھا۔ اینیتا کے حسن و شباب کا رُعب میں نے قبول کر لیا تھا۔ اُس کی نگاہوں کے ترکش میرے سینے میں پیوست ہوئے جاتے تھے۔ اُس کا گلابی پیٹ، بلاؤز اور ساڑی کے درمیان علیحدہ نظر آتا تھا۔ یہ علاقہ حسین عورتوں کا شوکیس ہوتا ہے، اس میں لوچ ہوتا ہے، گداز ہوتا ہے۔ موجیں ہوتی ہیں۔ اینیتا ایک سادہ سی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے بدن پر گوند سے ساڑی چپکا دی گئی ہے۔ اسے دیکھ کے ڈگڈگی کا خیال آجاتا تھا جس کی کمر بہت پتلی ہوتی ہے۔ اینیتا کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ دونوں حصّے کمر کی ایک نازک ڈوری سے مربوط تھے۔ وہ جب کھڑی ہوئی تو اسے درمیان سے پکڑ کے ہوا میں گھمانے کی خواہش ابھرنے لگی۔ جہاں اور بہت سی خواہشیں ملبے میں پڑی تھیں، وہاں میں نے اسے بھی ڈال دیا۔

چند لمحوں کے لیے میں ساری دنیا سے غافل ہو کے اسی میں گم ہوگیا۔ وہ دنیش سے وعدہ لے رہی تھی کہ جب تک وہ راجے پور میں مقیم رہے گی دنیش نت نئے پروگرام بناتا رہے گا۔ اسے حکم دینا آتا تھا۔ یقیناً پارو میں یہ خوبی اس سے زیادہ تھی مگر یہ ناز و ادا کا حکم تھا۔ پارو کے ہاں ایک جلال تھا، ایک نسوانی جلال۔ حسین عورتوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا ناپختگی اور کج روی کی علامت ہے۔ بھلا پھولوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ ہر ایک کا رنگ الگ ہوتا ہے، خوشبو الگ ہوتی ہے۔ ہر پھول اپنی اپنی ڈالی پر سجتا ہے۔ کوئی صبح کا راگ ہے، کوئی شام کا۔ جاتے جاتے وہ دروازے پر ٹھٹکی۔ ایک نظر مجھے

خواتین! کیا یہ مناسب نہیں کہ
آپ اپنے اور اپنے آرام کی خاطر بھی
کچھ خرچ کریں ؟

صرف چند روپے ۔ صرف ایک مرتبہ ماہانہ

کیا یہ مناسب نہیں کہ آپ
کیئر فری
سینٹری ٹاول استعمال کریں؟

خرچ بھی کم ۔ بے چینی بھی کم ۔

FOURAYS-75 IJC-2

دیکھا پھر ملاقاتی کمرے کی اونچی دیواروں اور منقش چھت کو۔ پھر وہ دروازے کے پار ہو گئی۔ میں نے اندر کے کمرے میں جا کے پارو کا نمبر ملایا۔ فون اسی نے اٹھایا۔ اُس کی آواز تھکی ہوئی تھی۔ "کیا حال ہے؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

وہ میری آواز پہچان گئی۔ "تم کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں، بس گم ہوں۔" میں نے مُردہ آواز میں کہا۔

"سر میں درد ہے؟" اُس نے مبہم انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔" میرے لہجے میں کرب سمٹ آیا۔

"سو جاؤ۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ میں تمام فکریں سلا دوں۔

"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"مجھ سے آ کے دوا لے جانا۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"کوئی خیر خبر۔۔؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

اُس نے فون بند کر دیا۔ میں کچھ دیر کھڑا کھڑا آ رہا۔ اس وقت تکیے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پارو کو فون کرنے کا مقصد یہی تھا کہ دو مستحق اور مفرح باتوں کا مشروب مل جائے۔ اُس نے فون پر زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پارو نے مجھ سے زیادہ قابو یافتگی کا ثبوت دیا تھا۔ میرے ہاتھ میں ریسیور دھرا ہوا تھا اور نگاہیں ایک سمت ٹکی ہوئی تھیں کہ دنیش چندر نے آ کے مجھے چونکا دیا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ سامنے کے دروازے سے آ رہے ہیں۔

"کیا بات ہے موہن؟ کچھ تمہاری طبیعت خراب ہے؟" اُس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ "ارے تمہارا ماتھا تو گرم ہو رہا ہے۔"

"اوہ نہیں۔ میں بیمار ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

"تم کہاں غائب رہتے۔ مجھے شبہ ہے کہ تم بعض پُراسرار سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اچانک غائب ہو جاتے ہو۔ میں تمہارے انتظار میں سوکھتا رہتا ہوں۔"

"دنیش بابو!" میں نے کہنا چاہا لیکن میرے ہونٹ تھرا کے رہ گئے۔ میں نے اپنا سر اُس کے سینے میں چھپا دیا۔ جیسے وہاں روئی ہو گی میں سر رکھوں گا تو دب جائے گی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دنیش کے سینے میں گداز ہی گداز تھا۔ اُس نے بھی زندگی دیکھی تھی۔ مجھے زور سے بھینچ لیا، کچھ اس قدر شدت سے کہ میں نڈھال ہو گیا۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟"

"کہیں سے نہیں۔" میں نے بچوں کی طرح کہا۔ "میں تو یہیں تھا۔"

"جھوٹ، کوئی بات ضرور ہے، کسی نے تمہیں کچھ کہہ دیا ہے۔ جوان میں ضرور کسی شخص نے آج تمہیں کوئی سخت بات کہی ہے، بتاؤ نا کیا بات ہے؟"

"نہیں، بس یوں ہی دل اُمڈ آیا۔"

"شاردا کو بلاؤں؟" اُس نے آہستگی سے کہا۔

میں نے بے بسی سے اُس کی صورت دیکھی اور بے اختیار آنسو میری آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ "نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔" میں آنکھیں خشک کرتے ہوئے بولا اور اُس کی گرفت سے آزاد ہو کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ آنکھیں پٹ پٹا جاتی ہیں تو پیر بھی پٹ پٹا جاتے ہیں۔

"ترنم کو بلاؤں؟" اُس نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔

اُس نے مجھے ہنسا دیا۔ "مجھے اس وقت صرف آپ کی ضرورت ہے۔"

"میں تمہارے سامنے ہوں لیکن میرے پاس ترنم جیسا گلا نہیں، شاردا جیسی صورت نہیں، ریتا جیسی سرخی نہیں۔"

"آپ میں تمام خوبیاں موجود ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"موہن!" وہ مجھے اپنے ساتھ دیوان پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں نفسی مریض بنانا نہیں چاہتا اور موجودہ صورت میں اس کے صاف امکانات موجود ہیں۔ یہ دوائی مستقل طور پر نہیں چلتی۔ میں تم سے کہتا ہوں، ایسے ڈراما ختم کرو۔ آؤ ہم دونوں کچھ دنوں کے لیے انگلستان چلتے ہیں۔ شاردا کو بھی لے چلتے ہیں۔ اس اضطراب سے اعصاب پر بڑا اثر پڑ رہا ہے کچھ وقت سوئٹزرلینڈ میں گزاریں گے، مصر کے اہرام دیکھیں گے، برٹش میوزیم کی سیر کریں گے۔ پیرس کے نائٹ کلبوں میں جائیں گے۔ تم مجھ سے مطالبہ کرو، کوئی بہت بڑا مطالبہ۔ میری آرزو ہے کہ کبھی تم مجھ سے اتنی بڑی خواہش کرو کہ میں اُسے پورا کر سکوں۔"

"میرا کوئی مطالبہ نہیں۔ بس آپ ہی میرا مطالبہ ہیں۔ جب آپ یہ سب کچھ کہتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا باپ زندہ ہو گیا ہے، میرا بڑا بھائی مجھ سے آ ملا، میری بہن نے دوسرا جنم لے لیا، اور میری ماں واپس آ گئی ہے۔ دنیش بابو! میں بھی جل مر گیا تھا۔ آپ نے مجھے دوسری زندگی دی ہے۔ آپ ہی میرے لیے انگلستان، سوئٹزرلینڈ اور پیرس ہیں۔ آپ کے بعد مجھے کس کی تمنا رہے گی۔ آپ کہتے ہیں تو ہم یہاں سے ضرور باہر چلیں گے مگر اس اطمینان کے بعد کہ دوبارہ یہاں آئیں تو یہ بیماریاں عود کر نہ آئیں۔"

"موہن! موہن!" دنیش نے جذباتی انداز میں مجھے پکارا۔ "کیا واقعی تمہارا کوئی عزیز زندہ نہیں ہے۔ تم اتنے دکھی کیوں ہوتے ہو۔ تمہیں اپنے عزیز لازماً یاد آتے ہوں گے۔ مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا گزری ہے۔ یہ تم اتنی ٹوٹی ہوئی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"جو گزر گئی سو گزر گئی۔" میں نے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، آئندہ اُن لوگوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ ایک پاگل بھائی زندہ ہے۔ پتہ نہیں، زندہ بھی ہے یا نہیں۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔ باقی سبھی گزر گئے۔ مُردوں کو یاد کرنے سے کیا حاصل؟ مجھے احساس ہے، اس ذکر سے میں آپ سے دُور ہو جاتا ہوں۔ کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی ہو گی آپ کو۔"

دریچے

ابوظفر زین

ڈاکٹر اقبال نے ایک محفل میں یہ سوال اُٹھایا "کیا بات ہے کہ ہندوستان میں غالب کا گھر گھر چرچا ہے مگر بیدلؔ عظیم آبادی کو کوئی نہیں جانتا اور افغانستان میں بیدلؔ کا گھر گھر چرچا ہے، غالب کو کوئی نہیں جانتا؟"
پھر انھوں نے خود ہی جواب دیا کہ ہندوستان غلام ہے اور افغانستان آزاد ہے۔ غالب کا کلام غلاموں کے لیے ہے اور بیدلؔ کا آزادوں کے لیے۔

سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد میں جو لوگ شامل ہوئے تھے، ۱۸۶۴ء میں اُن پر سازش اور بغاوت کا مقدمہ چلا۔ اس تاریخی مقدمے میں مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولانا یحییٰ علی اور لاہور کے سوداگر حاجی محمد شفیع وغیرہ ماخوذ تھے۔ ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو انگریز گورنر کی خواہش کے مطابق انگریز جج نے اُن تینوں کو پھانسی دینے کا حکم سُنایا۔ مولانا جعفر پھانسی کا حکم سُن کر ایسے خوش ہوئے جیسے انھیں بادشاہت مل گئی ہو۔ مولانا یحییٰ اور حاجی محمد شفیع بھی بہت خوش تھے۔
۲ مئی سے ۱۶ دسمبر تک یہ لوگ پھانسی کی کوٹھری میں بند رہے۔ جیل والے ہمیشہ پھانسی کا سامان تیار رکھتے تھے۔ روزانہ سیکڑوں میمیں اور صاحبان یہ دیکھنے کے لیے آتے تھے کہ یہ لوگ پھانسی کا حکم ملنے پر اتنے خوش کیوں ہیں؟ وہ تعجب سے پُوچھتے تھے "تم لوگوں کو پھانسی ہونے والی ہے، پھر تم اتنے خوش کیوں ہو؟"
وہ لوگ کہتے "جو حق و صداقت کی راہ میں اس طرح ظلم سے مارا جائے، اُسے شہادت کا درجہ ملتا ہے۔"
جب انگریزوں کو معلوم ہُوا کہ یہ لوگ پھانسی کی سزا سے بہت خوش ہیں تو انھوں نے سزا بدل کر ۱۸۶۵ء میں انھیں کالے پانی بھیج دیا۔ پھر یہ لوگ اٹھارہ سال بعد ۱۸۸۳ء میں وہاں سے رہا ہو کر واپس آئے۔

صلاح الدّین ایوّبی کا انتقال ہُوا تو اُس کے پاس سے ایک درہم بھی نہیں نکلا۔ جو کچھ تھا اُسے وہ پہلے ہی خیرات کر چکا تھا۔ کفن کے کپڑے اور قبر کی اینٹوں کے لیے مجبوراً چندا کرنا پڑا۔

اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہُوا تو اُس کے پاس سے صرف چار رُوپے دو آنے نکلے یہ رقم اُس نے ٹوپیاں سی کر جمع کی تھی۔ اسی رقم سے کفن خریدا گیا۔ اس کے علاوہ تین سو پانچ رُوپے کتابت کی آمدنی کے جمع تھے۔ یہ رُوپے اُس کی وصیت کے مُطابق غریبوں میں تقسیم کر دیے گئے۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، البتّہ تمھیں غم زدہ دیکھ کے بہت بے چینی ہوتی ہے۔ تم عزم، حوصلے اور ذہانت کے کمبل ہو، تم میری جاگیر ہو، پر کاش بھون ہو۔ میرا مکان، جب میں اپنے مکان کے در و بام اور اس دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔"
میں نے ارادہ کیا اُسے سب کچھ صاف صاف بتا دوں۔ کچھ دیر پہلے میں میجر رابرٹ کو قتل کر کے آیا ہوں مگر ضروری نہیں کہ میں اسے ہر بات بتا کے پریشان کیا کروں۔ اسے جلد یا بدیر پتہ چل ہی جائے گا۔ میں نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ میجر رابرٹ کو قریب کرے۔ جگدیپ نے اُس سفید کُتے کے گلے میں پٹّا ڈالنے کے لیے کون سا حربہ اختیار نہ کیا تھا۔ "ذرا پریت کو چیک کریں، وہ بھون میں موجود ہے؟" میں نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کوئی خاص بات؟"
"یوں ہی۔" میں نے ریسیور اٹھا کے اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
اُس نے تذبذب سے نمبر ڈائل کیا۔ پریت موجود نہیں تھی۔ اُس کی باندی نے بتایا کہ وہ دوپہر سے کہیں گئی ہوئی ہے۔ ریسیور پہ ہاتھ رکھ کے اُس نے مجھ سے پوچھا "کوئی اور بات پوچھنی ہے؟"
"نہیں۔" میں نے اُنگلی سے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔
"کیا پریت ..... ؟" اُس کی آنکھیں حیرانی سے ساکت ہو گئیں۔
"میں صرف ایک تسلّی چاہتا تھا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔
"کیسی تسلّی؟" وہ ناراض ہونے لگا۔ "یہ کیا رمز ہے؟"
"کچھ نہیں، بس یوں ہی پوچھ لیا۔" میں نے اس موقع پر اُس سے پریت کا ذکر کر کے غلطی کی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میجر رابرٹ کی موت کے وقت بھون کے بہت سے لوگ گھر سے باہر ہوں خصوصاً پریت حالانکہ اُس کی عدم موجودگی سے کوئی بُرا نتیجہ نکلنے کی توقع نہیں تھی لیکن یہ احساس توانائی کا سبب ضرور تھا۔ شک کا کسی ایک جگہ ارتکاز ہونے کے بجائے اُن کا منتشر ہونا سود مند تھا۔ چھاؤنی کے دوسرے افسران اس بات کے گواہ ہوں گے کہ ان دنوں پریت اور جگدیپ کی بہنیں میجر رابرٹ کے زیادہ قریب رہی ہیں۔ میجر کی کوئی ڈائری ہو گی تو وہ اپنی ملاقاتوں کا احوال بھی لکھتا ہو گا۔ انگریز بڑے تیز ہوتے ہیں۔ وہ خیال کے گھوڑے دوڑائیں گے۔ میجر کا اثر و رسوخ ان دنوں جگدیپ کے خانوادے میں زیادہ بڑھ گیا تھا۔ انگریز اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتے تھے کہ دوسرے مخالف خانوادے کو میجر اور جگدیپ کا یہ میل جول پسند نہیں آیا ہو گا۔ مہاراجا پر بھی اُن کا شک جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ راجے پور کے لیے سخت کش مکش کا وقت تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا صرف میں اور سیار جانتے تھے کہ آنے والے دنوں کا درجۂ حرارت کیا ہو گا۔
"تم کیا سوچنے لگے؟" ذیشان برہم سا ہونے لگا۔
"کیا سوچ سکتا ہوں۔ پریت کی سرگرمیاں خاصی بڑھ گئی ہیں۔ اپنی ماں کے قتل سے وہ کچھ اور برانگیختہ ہو گئی ہے۔ پریت ایک بہت دلچسپ لڑکی ہے ڈیشیس بابو!"
"کیا کوئی نیا فتنہ؟ آخر تم جھجک کیوں رہے ہو؟"
"نیا فتنہ نواب آیا ہے۔ ہر لڑکی انگلستان سے آئی ہے جو بھی

آپ کے ساتھ ملیٹھی تھی۔ راجوں مہاراجوں کے وہ تمام سپوت جو انگلستان میں پڑھتے ہیں، اُن پر انگریزوں کی خاص عنایت ہوتی ہے۔ اُن کے دماغوں میں سوئیاں لگائی جاتی ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں کہنا چاہتا ہوں کہ رنگ روپ بھی اُس نے غضب کا پایا ہے۔"

"تمھاری یہ عادت بعض اوقات بڑے ستم ڈھاتی ہے۔ تم اشاروں میں باتیں کرتے ہو۔ کوئی بات کھل کر نہیں کہتے۔ بہرحال میں سمجھ رہا ہوں کہ تمھارا کیا مقصد ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ پریت کے سلسلے میں تم اتنے متجسس کیوں ہو؟"

اس وقت میں اُسے کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھا اور اُس سے جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ چنانچہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اُسے ٹال رہا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ میں جس قدر پہلو تہی کر رہا تھا، اُس کا تجسس اتنا ہی بڑھ رہا تھا۔ مجھے ایک اندیشہ تھا کہ پریت اُس کی بہن ہے، سوتیلی سہی۔ اُس کے لیے اُس کے دل میں کوئی گوشہ ضرور ہوگا۔ شاید میں نے یہ گنجائش ختم کرنے ہی کے لیے پریت کی بات اُس سے چھیڑی تھی۔ پارو بھی میری طرح مضطرب تھی۔ وہ دنیش کو آواز دیتی ہوئی اندر آگئی۔ ہم دونوں کے ہونٹوں کو بریک لگ گئے۔ دنیش کو پارو کی آمد بُری لگی مگر اس وقت پارو نے میری مشکل حل کر دی تھی۔ ہم تینوں سراسیمہ تھے۔ دنیش کے دل و دماغ میں پریت کے بارے میں جاننے کا اضطراب تھا۔

"تم انیتا سے ملے دنیش؟" پارو نے ذہانت کا ثبوت دیا۔

"ہاں!" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "تندرست ہو کے آئی ہے۔"

"میرا خیال ہے، وہ تمھارے لیے بالکل موزوں ہے۔ کیا خیال ہے، کچھ ذکر چھیڑا جائے؟" پارو نے شگفتہ ہونے کی کوشش کی۔ اُس کے تیز حواس نے جان لیا تھا کہ میرے اور دنیش کے درمیان کسی سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔

"ارے نہیں۔" دنیش مسکرا پڑا۔ "میں نے اس سلسلے میں بالکل نہیں سوچا۔ ایسی حالت میں جب ریاست میں نئے نئے فتنے اٹھ رہے ہوں، میں اپنی ذات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"بہرحال تم میری بات پر غور کرنا۔" پارو نے خوش اسلوبی سے دنیش کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اس تازہ وارد لڑکی پر ادھر اُدھر کی ڈھول چمنے سے پہلے اپنی مہر کندہ کر دے۔ اُسے دیکھ کے خود میرے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا۔

"ضرور۔ خاصی معقول تجویز ہے۔" دنیش نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیوں موہن! تمھارا کیا خیال ہے؟" دنیش نے پارو کے سامنے کبھی مجھ سے ایسی بے تکلفی کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ بھی اڑتی ہوئی چڑیا پہچان لیتا تھا۔

"میری رائے کیا۔" میں نے اٹکتے اٹکتے کہا۔ "پہلے اچھی طرح پرکھنا ضرور چاہیے۔ آپ کو راج کماری انیتا کے ساتھ پہلے کچھ دن گزارنے چاہییں۔"

"موہن ٹھیک کہتا ہے۔" پارو نے کہا۔ "ایسی کسی کوشش میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ممکن ہے، ریاست کے لیے یہ لڑکی اچھا شگون ثابت ہو۔"

پارو جو بات کہنا چاہتی تھی، اُس کی تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سوچا، یہ حجابات ختم کر دوں۔ دنیش سے پارو کا مکمل تعارف کرا دوں، لیکن پارو نے دنیش کے ریکارڈ ٹٹولنے شروع کر دیے تھے۔ "یہ مجھے ادھار دے دو۔" اُس نے اُن میں سے ایک منتخب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ واپس نہیں کرتی ہیں۔" دنیش مصنوعی تلخی سے بولا۔

"موہن بطور گواہ موجود ہے۔" پارو نے میری جانب اشارہ کیا۔

"موہن مشکوک گواہ ہے۔" دنیش کے اس لہجے کو شیر خوار طفل بھی پہچان سکتا تھا کہ اُس کے اور میرے درمیان کیسا ربط ہے۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی جیسے میرے دل کے بٹن پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ پارو نے بے اختیار میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف۔ اُس نے ریسیور اٹھا کے دنیش کے حوالے کر دیا۔ وہ شاہانہ ناگواری سے گفتگو کے لیے آمادہ ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے تیور بدل گئے۔ "اوہ یور آنریبل لیڈی۔" اُس نے بے ساختہ کہا اور مجھے آنکھ کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ رینا کا فون ہے۔ کم بخت پارو کے سامنے ہی آمادہ گیا تھا۔ "آپ کیسی ہیں؟" دنیش انگریزی میں پوچھ رہا تھا۔ کرنل صاحب کیسے ہیں؟ آپ کہاں آئیں گی۔ آئیے تو آپ کو اپنا ہاتھی خانہ دکھائیں۔ بہت بڑے بڑے ہاتھی ہیں۔ پھر ادھر دلی سے ایک بہترین مغنیہ آئی ہوئی ہے۔ اُس کا گلا ہی سانا ہے۔ آپ انگریزی موسیقی بھول جائیں گی۔ ہمارا خیال ہے، کچھ دن کے لیے آپ ہمارے ہاں مستقل مہمان بن کے آجائیے۔ پروفیسر۔ ہاں پروفیسر۔ دنیش کو اچانک یہ خیال آیا کہ پارو بھی یہ گفتگو سن رہی ہے۔ "آپ آئیں گی تو اُس سے بھی ملائیں گے۔ سچ، جھوٹ نہیں۔ پہلے آپ آنے کا وعدہ کیجیے۔ ہم آپ کو چونکا دیں گے۔"

دنیش فون پر مصروف تھا۔ پارو نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور چپکے سے بولی۔ "سب ٹھیک تو ہے نا؟"

"ابھی تک تو حالات بدستور ہیں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"میں یہ ریکارڈ لیے جا رہی ہوں۔ رات کو تمھیں میری اور مجھے تمھاری ضرورت پڑے گی۔ بھولنا نہیں، آنا ہے۔"

میری سماعت فون پر مرکوز تھی۔ میں نے ہکلا کے کہا۔ "ہاں، آؤں ضرور آؤں گا۔" اس اثنا میں دنیش اپنی بات ختم کر چکا تھا۔ پارو کے استفسار سے پہلے ہی اُس نے بتایا۔

"کرنل کی بیٹی کا فون تھا۔" وہ سرد مہری سے بولا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" پارو نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ یہاں آنا چاہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے ہندوستانی

کسی میوزیم میں رہتے ہیں۔ پنجروں میں بند، انگریز دو ہاتھ پاؤں کے ان جانوروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔"

"یہ اُن کے لیے ایک تجربہ گاہ ہے۔ بندروں کے بجائے چلتے پھرتے انسان مل جاتے ہیں۔" پارو کی زبانی یہ سن کے دنیش کے چہرے پر تعجّب کے آثار نمودار ہوئے۔

میں خاموشی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا میرا ذہن تھوڑی دیر پہلے پارو کی آمد سے کچھ پُرسکون ہوگیا تھا مگر ریتا کے فون سے پھر متزلزل ہوگیا۔ میری دیوار پھر سے ہلنے لگی۔ ریتا آرہی ہے۔ وہی صورت ہے۔ کل دنیش کس انداز میں مجھے اُس کے روبرو پیش کرے گا؟

دنیش نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا مگر وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ میں نے ریتا سے تین چار دن کی مہلت مانگ لی تھی۔ یہ تین چار دن آج نہیں کل ختم ہو جاتے، پرسوں ختم ہو جاتے۔ پروفیسر زاہدی کو ہمیشہ کے لیے ختم بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بات آگے بڑھ گئی تھی۔ پارو نے بھی پروفیسر کا تذکرہ سنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پروفیسر کون شخص ہے۔ اُس کے سامنے کرنل ہارڈنگ کی لڑکی کا بطورِ خاص پروفیسر کو پوچھنا اور دنیش کا جھجکنا، مبہم انداز میں جواب دینا۔ ذہین پارو کے لیے سوچنے کا بہت سامان فراہم ہوگیا تھا۔ میری حیثیت اُس کی نظر میں کچھ زیادہ پُراسرار ہو رہی تھی۔ اعتماد کے قیام کے لیے اجلا ذہن اور صاف ہوا لازم ہے۔ اُس نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا۔ کچھ اس طرح کا اظہار کیا جیسے اُس نے ریتا اور دنیش کی گفتگو پر توجہ نہیں دی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کو جب میں اُس کے شبستان میں جاؤں گا تو وہ مجھ سے کیسا فساد کرے گی۔

پارو سے زیادہ اصل معاملہ ریتا کا تھا۔ میں اُس کا فون آنے سے پہلے یہ ارادہ کر رہا تھا کہ دنیش سے اصرار کر کے اپنا حلیہ تبدیل کرا لوں لیکن اس وقت دنیش سے یہ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ریتا کے ذکر سے ویسے ہی تشویش میں پڑ گیا تھا۔ اُس پر یہ مطالبہ مستزاد ہوتا۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ کرنل سے ربط ضبط بڑھایا جائے، اُس کی خدمت میں جا کے دل نشین باتیں کی جائیں۔ اُس کی مروّت کو فروغ دیا جائے۔ دوسری طرف احتیاط کا تقاضا یہ بھی تھا کہ کرنل سے اس وقت ملنے سے گریز کیا جائے۔ اعلا انگریز ڈاکٹر آسانی سے میجر رابرٹ کی لاش کا معائنہ کر کے قتل کے وقت کا تعیّن کر لیں گے اور کرنل بعد میں سوچے گا کہ اُسی شام پروفیسر زاہدی اُس کے پاس آیا تھا۔ اُس نے عجب عجب باتیں کی تھیں۔ ایسے نازک وقت میں کرنل سے تعلق کی تجدید میں منفعت بھی تھی اور نقصان کا اندیشہ بھی تھا مگر اب کل ریتا آرہی تھی اور کچھ اندازہ نہیں تھا کہ چھاؤنی کے حالات کون سا رُخ اختیار کرلیں اور ہائی کمان غلاموں کی اس دیدہ دلیری پر کتنی مشتعل ہو جائے۔ یہ کسی پرشوتم، مہیش چندر، پرکاش چندر، کنور پردیپ اور بنیا رانی کا خون

کیا آپ باہر جانا چاہتے ہیں

آپ ملک سے باہر جانا چاہتے ہوں یا باہر مقیم ہوں، ہر صورت میں آپ کو کوئی ٹیکنیکل کام ضرور سیکھ لینا چاہیئے فوٹوگرافی ایک ایسا فن ہے جو ہر ملک میں کام آتا ہے، لندن انسٹیٹیوٹ عرصے سے پاکستان اور پاکستان سے باہر سینکڑوں افراد کو فوٹوگرافی کی بذریعہ ڈاک تربیت دے رہا ہے۔ اگر آپ کے پاس ہمارا اُردو میں چار ماہ کا پورا باتصویر کورس ہو تو آپ کسی وقت بھی اپنا فوٹو اسٹوڈیو کھول سکتے ہیں یا کہیں بھی ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم فوٹو کھینچنا۔ دھونا۔ انلارج کرنا۔ ڈارک روم و اسٹوڈیو بنانا۔ سینما سلائیڈ بنانا۔ منٹ فوٹوگرافی واٹر کلر و آئل فوٹو پینٹنگ پریس و کلر و موی و پولا رائیڈ فوٹوگرافی بذریعہ ڈاک سکھاتے ہیں اختتام کورس پر ڈپلوما دیا جاتا ہے ماہانہ فیس ۱۰ روپے داخلہ فارم منگائیے یا لیکچر کا پہلا سیٹ بذریعہ وی پی طلب فرمائیے

پاکستان سے باہر مقیم طلبہ کو پورا کورس ایک ساتھ بھیجا جاتا ہے اور ان سے پورے کورس کی فیس ۸ پونڈ لی جاتی ہے۔

فوٹوگرافی سکھانے کے علاوہ لندن انسٹیٹیوٹ ریڈیو کا کام جاننے والے حضرات کا بذریعہ ڈاک امتحان بھی لیتا ہے جس کو پاس کرنے پر ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ امتحان میں شرکت کے خواہش مند حضرات اپنا رجسٹریشن کرالیں:

اوقات: ۶ بجے شام سے ۹ بجے رات تک

پرنسپل۔ زیڈ اے نقوی ایم اے

لندن انسٹیٹیوٹ

۳۵۶۔ اے نیشنل ہائی وے۔ ملیر کالونی۔ کراچی ۲۷

نہیں تھا۔ انگریز کا معاملہ تھا۔

پارو لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تو میں نے کسی تاخیر کے بغیر دنیش سے کہا کہ وہ فی الفور مجھے پروفیسر زاہدی کے روپ میں تبدیل کر دے۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی۔ اُس کا چہرہ گمبھیر ہو گیا۔ وہ جھنجلا سا گیا۔ "تم نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کر لیا؟"

"میں اُس غلطی کی تلافی کرنا چاہتا ہوں جو پروفیسر زاہدی کا روپ بھر کے مجھ سے اور آپ سے ہو گئی تھی۔ دوسری بار یہ غلطی اُس وقت ہوئی جب دوبارہ پروفیسر کرنل سے ملنے چھاؤنی گیا تھا۔"

"مگر تم کس طرح اس کی تلافی کرو گے؟"

"آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیجیے، میں کسی طور حالات سے نمٹنے کی کوشش کروں گا۔ ذرا سوچیے، کل ریتا کے آنے کے بعد پھر یہ مسئلہ پیش آئے گا کہ میں اُسے اپنا چہرہ کس حیثیت میں دکھاؤں۔"

"تو کیا تم موہن داس، ایک ملازم کی حیثیت میں اُس کے سامنے آؤ گے؟ بھون کے لوگوں کے لیے یہ ایک پرلطف تماشا ہو گا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے موہن! جو میں چاہتا ہوں، اب تم بھی اُسی کی تائید کر رہے ہو۔"

"یہ ایک پیچیدہ صورت ہے مگر اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالنا ہو گا۔ اسی لیے میں نے کرنل کے ہاں جانے کا ارادہ کیا ہے۔ میں کرنل اور ریتا کا وزن کر کے اپنی قسمت اور قیمت متعین کروں گا۔"

"میں پوری طرح غور کیے بغیر تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔" اُس نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"ہر کام مشکل ہوتا ہے، اگر زندگی کی خواہش شدید ہو۔"

"اور زندگی سے زیادہ کوئی خواہش شدید نہیں ہوتی۔ تم خود غرضی کی بات کرتے ہو، تمھاری زندگی سے کچھ اور لوگ بھی وابستہ ہیں۔"

"آپ ایسی باتیں کر کے خود میری ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں۔ میں کہاں زندہ رہ سکتا ہوں۔ میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "چلیے باہر چلیے، اس سے پہلے کہ پھر کوئی حارج ہو جائے، اپنے کمرے میں چل کے میری صورت بدل دیجیے۔"

"شام کا وقت ہے، تم یہاں سے کیسے جاؤ گے؟ اندھیرا ہو جانے دو۔"

"میں کرنل کو فون کرنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے بغیر ڈنر نہ لے۔"

"تم کتنی دیر وہاں ٹھیرو گے؟" وہ تشویش سے بولا۔ "کیوں نہ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں؟"

"اس بار نہیں۔" میں نے بے لچک آواز میں انکار کر دیا اور فون اٹھا کے کرنل کا نمبر ملایا۔ دنیش شش و پنج سے میری صورت دیکھتا رہا۔ یہ کرنل کا ڈائریکٹ نمبر نہیں تھا۔ میں نے چھاؤنی کے عام نمبر پر اُس کے سیکریٹری سے رابطہ قائم کیا اور کہا۔ "کرنل سے کہو کہ پروفیسر آج رات اُس کے ہاں مدعو ہے۔"

سیکریٹری نے چند لمحوں بعد ادب سے جواب دیا۔ "کرنل آپ کے منتظر ہوں گے۔" خوش قسمتی سے آج خود کرنل کہیں مدعو نہیں تھا۔ اس مختصر نامہ و پیام کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ کرنل رات کے وقت مجھے تنہا ملاقات کا شرف بخشے۔

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اندھیرا ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ دنیش ابھی تک متذبذب تھا۔ ہم ملاقاتی کمرے میں آ گئے تھے، یہاں آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس ہجوم میں بھیس بدل کے باہر نکلنا خاصا مشکل تھا۔ سات بجے کے قریب دنیش بے دلی سے اٹھا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ دنیش نے کمرہ بند کر کے حسبِ معمول میرا حلیہ تبدیل کر دیا اور میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک پستول بھی رکھ دیا اور نوٹ بھی ڈال دیے۔ تجوری سے ہیرے کی ایک انگوٹھی بھی نکال کے میرے سپرد کی تاکہ میں اُسے ریتا کی انگلی میں اتار دوں۔ "اب تم کیسے جاؤ گے؟ راہداری میں خاصی چہل پہل ہو گئی ہے۔ فرض کرو، اگر کسی نے پہچان لیا؟" وہ بگڑتے ہوئے بولا۔

"آپ فون کر کے گاڑی دروازے کے قریب منگوا لیجیے اور کسی خوف کے بغیر مجھے گاڑی تک رخصت کر کے آئیے۔"

"اور ڈرائیور؟"

"ڈرائیور کی فکر مت کیجیے، میں کوشش کروں گا کہ خود گاڑی چلا کے لے جاؤں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"تم—؟" وہ حیرت سے بولا۔ "تم تو گاڑی چلانا نہیں جانتے۔"

"نہیں جانتا تھا۔ میں نے رقص آپ سے سیکھا اور گاڑی چلانا کسی اور سے سیکھ لیا ہے اور بہت مختصر وقت میں سیکھا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ وحشت میں بولا۔

"اب دیر نہ کیجیے، اُٹھیے۔" میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ وہ خاصا حیرت زدہ تھا۔ راہداری میں آتے ہی اُس نے مجھ سے انگریزی میں باتیں شروع کر دیں۔ میں سر ہلاتا اور مسکراتا رہا۔ ایک بڑا سا سگار میرے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا۔ راہداری میں اکا دکا ملازم تھے۔ مجھے اور دنیش کو دیکھ کے انھوں نے سلام کیا اور نظریں جھکا لیں۔ دربان کے لیے یہ بڑی انہونی بات تھی۔ اُس نے اس داڑھی والے سرخ و سفید شخص کو اندر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہم تیزی سے گزر رہے۔ دنیش انھیں مختلف احکام دے کر مصروف کرتا رہا اور مجھ سے باتیں کرتا ہوا گاڑی تک آ گیا۔ مجھے دیکھ کے گاڑی کے پاس کھڑے ہوئے ڈرائیور کے چہرے کے نقوش بدلے ہی تھے کہ دنیش نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے وہاں سے ہٹا دیا اور خود بڑھ کے دروازہ کھولا۔ میں اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ ایک نظر آلات کا جائزہ لے کے میں نے چابی گھما دی۔ انجن گھر گھر بولا۔ میں نے کمال تحمل کا مظاہرہ کیا۔ ذرا سی ناپختگی ثابت

ملک بھر میں واحد خالص صابن

کرپم کٹ

(اونٹ مارکہ)

اپنائیے

کپڑے صاف! کیمیائی اثر سے ہاتھ بھی محفوظ!!

اُجلی دُھلائی
آسان دُھلائی
زیادہ دُھلائی

اور کپڑوں میں دیرپا چمک کے لئے
پاکستان کا بہترین خوشبودار صابن!

کیمیکل آمیز واشنگ پاوڈر کپڑوں کے ساتھ ساتھ خوبصورت ہاتھوں اور ناخنوں کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ ہمیشہ کرپم کٹ خالص صابن استعمال کیجئے۔

کرلسینٹ پاک انڈسٹریز لمیٹڈ۔ کراچی

ORIENT

ہو جاتی تو دنیش مجھے گاڑی میں تنہا بھیجنے کا فیصلہ بدل دیتا۔ اتفاق سے گاڑی نے کوئی جھٹکا نہیں لیا۔ کلچ صحیح طور پر دبا، گیئر بروقت پڑا اور میں نے نفاست سے ایکسی لیٹر پر دباؤ ڈالا۔ صدر دروازے پر تعینات دربانوں نے گاڑی کی جھلک دیکھ کے دروازہ کھول دیا۔ انہیں اپنی مستعدی پر مایوسی ہوئی ہوگی۔ جب گاڑی میں راج کمار کے بجائے داڑھی والا کوئی جعفادری بیٹھا نظر آیا ہوگا۔ اتنا اندھیرا ضرور پھیل چکا تھا کہ میں اپنا چہرہ آزادی کے ساتھ اوپر اٹھا سکوں۔ ابھی میں نے گاڑی صدر دروازے سے نکالی ہی تھی کہ سامنے سے ایک دوسری گاڑی ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں نے اپنی سائیڈ کا خیال نہیں کیا تھا۔ اس افراتفری میں ایک جھٹکے سے میری گاڑی بند ہوگئی۔ مجھے پسینہ آگیا۔ سامنے والی گاڑی تیز لائٹ میں نظر ہی نہیں آئی تھی۔ میں نے دوبارہ انجن اسٹارٹ کیا ہی تھا کہ تیزی سے مخالف گاڑی میری اسٹیئرنگ والی کھڑکی کے پاس آکے رک گئی۔ اس میں ہری مرچ تھی، پریت۔ میرے سارے جسم میں مرچیں سی لگ گئیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنا چہرہ اُس سے چھپانا چاہا۔ وہ حیرت سے مجھے گھورنے لگی تھی۔ بڑھتی ہوئی سیاہی نے اس وقت بڑا ساتھ دیا۔ اندھیرا اُجالے سے زیادہ مخلص ہوتا ہے۔ ”مے آئی ہیلپ یو، اِز دیئر اینی ٹربل؟“ اُس نے اپنی کھڑکی سے چہرہ نکال کے کہا۔

”تھینکس، آئی ایم ساری، آئی کڈنٹ ایڈجسٹ مائی مائنڈ فار ڈرائیونگ آئی داز آف کورس، اسٹل اِن پرکاش بھون دی مسٹریس ڈریم لینڈ۔“ میں نے ہنستے ہوئے اُسے چھیڑ کیا۔ ”تھینکس۔“ وہ جواب میں کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ میں نے گاڑی بڑھالی تھی۔ تھانے دار سامنے آگیا تھا۔ بڑی مشکل سے گلو خلاصی ہوئی۔ میں نے اپنے حواس پر لعنت بھیجی۔ نئی گاڑی تھی اور میں مبتدی تھا۔ چوک کے راستے جانے کے بجائے میں نے ایک طویل اور صاف ستھرا راستہ اختیار کیا۔ مجھے رات کے وقت ڈرائیونگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ برکھا کے چھوٹے چھوٹے قطرے اسکرین پر ستاروں کے مانند جھلملانے لگے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وائپر متحرک کرنے والا پرزہ کون سا ہے۔ ایک جگہ ٹھیر کے میں نے رومال سے اسکرین کا پسینہ صاف کیا۔ باہر بھی پھوار پڑ رہی تھی اور اندر بھی پھوار تھی۔ میرے جسم پر پسینے کی پھوار پڑ رہی تھی۔ کاش میں دنیش چندر کی یہ نازک مزاج گاڑی لے کے نہ آیا ہوتا۔ سامنے سے جب تیز لائٹ میں کوئی گاڑی نظر آتی تو میں اپنی رفتار بہت کم کر لیتا اور وہ مرحلہ بخیریت گزر جاتا تو سمجھتا کہ ایک پل گزر گیا۔ میں ڈرائیونگ کے ایک درجے میں اور پاس ہوگیا۔ چار دن کی مشق کے بعد یہ طولانی وزنی گاڑی لے کے نکل آنا اس بات کی دلیل تھی کہ میری عمر ابھی خاصی کم ہے کبھی کبھی آدمی خود پر بھی غصے ہو جاتا ہے، خود کو بھی لعن طعن کرتا ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ زندگی کے ملک کے کامیاب باشندے نہیں ہو سکتے۔ یہ مقولہ ہر آدمی کی زبان پر رہتا ہے کہ غلطی انسان سے ہوتی ہے مگر کون ہے جو اپنی کوتاہی تسلیم کرتا ہے۔ میں واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ آگے جا کے اونچے نیچے پہاڑی سلسلے شروع ہوگئے تھے۔ سڑک اِترا کے، اٹھلا کے پہاڑ کاٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ جھینگروں نے راگ الاپا اور مینڈکوں نے سنگت دینا شروع کر دی تھی۔ رات کا وقت تھا مگر کہیں سے کوئی پپیہا بول اُٹھتا تھا۔ برکھا رُت تھی۔ میں وائپر کے بٹن کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ گاڑی کی رفتار معتدل تھی لیکن میرے دل کی رفتار بہت تیز تھی۔ پسینے نے داڑھی کے بال بھگو دیے تھے۔ میں ہندوستان سے انگلستان کی طرف جا رہا تھا۔ جیسے تیسے رُکتا، ڈگمگاتا، موڑ کاٹتا، ہارن بجاتا، بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ مجھ سے زیادہ قیمتی یہ گاڑی تھی۔ ہزاروں روپے کی۔

اس وقت میجر رابرٹ کے ماتحتوں میں اطلاع کے بغیر اُس کی عدم موجودگی سے تشویش ہونے لگی ہوگی مگر ایسی بھی نہیں اور اُدھر رابرٹ آرام سے پڑا ہوگا۔ دنیا کے جھگڑوں سے آزاد، ممکن ہے کسی جنگلی جانور کی نظر پڑ گئی ہو۔ انگریز کا گوشت کہاں نصیب ہوتا ہے۔ چھاؤنی قریب آرہی تھی اور میں اپنے ذہن کے کل پرزے درست کر رہا تھا۔ اپنی زبان کو ہدایت دے رہا تھا کہ وہ قابو میں رہے۔ اپنے دل سے درخواست کر رہا تھا کہ جہاں اتنی بار ساتھ دیا ہے وہاں ایک بار اور دوستی نبھا دے۔ اوپر کی ایک جگہ سے چھاؤنی کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ قطار در قطار انگریز کے اقبال کے ستارے جگ مگا رہے تھے۔ گیٹ پر میں نے گاڑی روک لی۔ اندر جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہر شخص سلام کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ ایک تو کرنل نے پہلے سے اطلاع دے دی ہوگی، دوسرا کرشمہ گاڑی کا تھا۔ لوہے کا یہ چلتا پھرتا دیو دیکھ کے سر خود بخود جھک جاتا ہے۔

میں نے کرنل کے پورچ میں ٹھیر کے دم لیا۔ کرنل کی کوٹھی پر خوابیدگی طاری تھی۔ سبزے کی ایک دل نواز خوشبو ہر سمت چھائی ہوئی تھی۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا، دروازے پر حسبِ سابق وُہی پری چہرہ کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، رخسار گل نار تھے، آنکھوں میں نیلی آگ روشن تھی، بدن پھڑک رہا تھا۔ ”اوہ پروفیسر! تم نے آنے میں خاصی دیر لگا دی۔“ وہ والہانہ انداز میں بولی۔

میں نے اُسی وارفتگی سے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ”ریتا!“ میری ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ”یُو آر سو بیوٹی فل!“

وہ اس اچانک ہلّے پر ہندوستانی لڑکیوں کی طرح تیورا گئی۔ راستے میں میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس بار ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے بجائے کسی قدر زیادہ استعداد کا مظاہرہ کروں گا۔ میں بہت کچھ سوچ کے آیا تھا۔ آج اپنے قد، وزن اور چہرے کی آزمائش تھی۔ اس جسم کے اندر جو چیزیں موجود تھیں، اُن کا امتحان تھا۔ میں اپنی نفی یا اپنا اثبات کرنے آیا تھا۔ یہ حاکموں کا علاقہ تھا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز نے ہندوستان کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں

اور دماغ اپنی حکمتِ عملی کے جیل خانے میں قید کر لیا تھا۔ اُن کی ایک شان تھی، آن بان تھی۔ میں توپ کے دہانے میں داخل ہو گیا تھا۔

اگر میں ریتا سے رواں انگریزی میں بات چیت شروع کر دیتا تو بہت سے مرحلے طے ہو جاتے۔ یہ کوئی مذاق نہیں تھا۔ ریتا ایک حاکم کی لڑکی تھی مگر اس کے سوا بھی اسے خراج پیش کیا جا سکتا تھا کیوں کہ اُس کے بدن سے سُبک سر ہوائیں چلتی تھیں۔ وہ تاروں بھری رات تھی۔ وہ صبح تھی، بنارس کی صبح سے زیادہ دل کش صبح۔ وہ ایک مرغزار تھی۔ کوئی لال سی چڑیا۔ چہچہاتی، پھُدکتی ہوئی — وہ ایک سراپا حسین لڑکی تھی۔ پہلے میں نے یہ اندازہ کیا کہ اب اُس کے شوق کا کیا عالم ہے۔ پھر میں نے اپنے شوق کی چنگاری کو ہوا دی۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ریتا کے نرم و نازک بدن سے اُٹھنے والی معطر ہواؤں نے خود ہی شعلے بھڑکا دیے تھے۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اُس کا یہی حال ہوتا۔ اُس کی آنکھوں میں نشے کے ڈورے پڑ جاتے۔ اُس کے جسم پر سانپ سرسرانے لگتے۔ "میں آ گیا ہوں"۔ میں نے شکستہ انگریزی میں کسی طرح اپنا مطلب ادا کیا۔ ویسے میں مجسم اظہار تھا۔ لفظوں نے اور آسانی پیدا کر دی۔

"اوہ!" اُس کے رخساروں کی پھل جھڑیاں چھوٹیں۔ "پروفیسر تم بہت ….."

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب میں خود کو تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں۔" میں نے بمشکل تمام کہا اور اُس کا بازو گرم جوشی سے پکڑ لیا۔

"کہاں — "۔ وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "تمہارا سراغ ہی نہیں ملتا۔"

"میرا سراغ —" میں نے کرب سے کہا۔ "مجھے اپنا پتہ خود نہیں معلوم بہر حال آج میں تم سے بہت سی باتیں کرنے آیا ہوں، کیا تم انھیں سننا پسند کرو گی؟"

اُس نے میری مسمار انگریزی سے سارا مفہوم سمجھ لیا کیونکہ انگریزی لفظوں کا تو صرف قالب تھا۔ میں اُس سے بین الاقوامی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ "کیا تم سنانا پسند کرو گے؟" اُس نے تیکھے پن سے کہا۔

"تم سے جُدا ہو کے میں چار دن اپنے آپ سے بے خبر رہا۔"

"کیوں —؟" وہ ناز سے بولی۔

"پتہ نہیں کیوں۔ مگر اس کی کوئی وجہ ضرور ہو گی۔" میں نے اُس کی نیلی آنکھوں میں آنکھیں پیوست کرتے ہوئے کہا۔ اُس پر دُلھن جیسی شرم چھا گئی۔ انگلستان شرما رہا تھا۔ سرخ رنگ شرمانے لگے تو کیسا بھبوکا ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ منظر ایسا دل کش لگا کہ مدہوشی سی ہو گئی۔ "آؤ، اندر آؤ۔" میں نے اُس کی کمر پر اپنا مضطرب ہاتھ پھیلا دیا۔ میرا ہاتھ سنسنانے لگا۔ اُس کے ریشمی اسکرٹ پر کوئی بچھو بیٹھا تھا جس نے ڈنک مار دیا۔ وہ مجھے ایک خواب ناک کمرے میں لے آئی۔ "کرنل کہاں ہیں؟" میں نے چاروں

طرف نظریں گھماتے ہوئے دریافت کیا۔

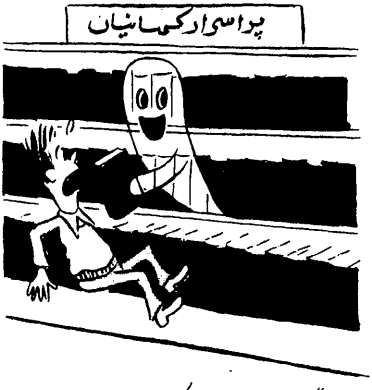

"تم کس کے پاس آئے ہو؟" اُس نے شکایت کے لہجے میں پوچھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو؟" میں نے شوخی سے پوچھا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچانے لگی۔ میں نے کہا۔ "تمہارے مکان تک آنے کے لیے کرنل کے دروازے سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"ڈیڈی تمھیں یاد کر رہے تھے۔" اُس نے نیچی نگاہوں سے کہا۔

"میں جانتا ہوں مگر میں بہت ڈرتا ہوں۔ کرنل اس انگریز چھاؤنی کے حاکم ہیں۔ وہ ہندوستانیوں اور اُن کے دوستوں کے بارے میں ہمیشہ مشکوک رہتے ہوں گے۔" میں نے اپنا مفہوم منتقل کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی سلیس انگریزی شروع کر دی تھی۔ "پتہ نہیں، کرنل میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟"

"ڈیڈی تمہارے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں۔ وہ تمھیں ایک ذہین اور جرأت مند شخص کہتے ہیں مگر اُن کا خیال ہے کہ تم ایک پُراسرار شخص ہو اور اصل میں وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکرانے لگی۔ "مجھے تمہاری یہ پُراسراریت ہی تو زیادہ پسند ہے۔"

"آؤ میرے پاس آؤ۔" میں نے اُسے سامنے کے صوفے سے اٹھایا اور اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میرے ہونٹوں کی تپش اُس نے محسوس کر لی ہو گی۔ "ریتا" میں نے خواب ناک آواز میں کہا۔ "تم انگلستان سے کیوں آ گئیں؟" میں نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کے جھنجوڑ دیا۔ "بتاؤ۔ تم کیوں آ گئیں؟" مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ میری انگریزی چار پانچ روز کے وقفے میں حیرت انگیز طور پر اتنی رواں کیوں ہو گئی ہے۔ اُس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اُس کے لب لرزنے لگے۔ یقیناً اُس نے میرے متعلق بہت سوچا ہو گا۔ اُس کے سارے بدن میں لرزش تھی۔ آخر اُس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔

میرے دل میں کوئی تعصب نہیں تھا، ایسے عالم میں آدمی جھوٹا نہیں ہوتا۔ جو جھوٹا ہوتا ہے، وہ ایسے عالم میں نہیں ہوتا۔ میرے شانے پر انگلستان نے رکھا تھا، یہ افتخار اور فتح مندی کی بات نہیں تھی، یہ بات تو کچھ اور تھی۔ کرنل اندر کمرے میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں نے اس کا رات کا کھانا اپنی آمد سے التوا میں ڈال دیا تھا۔ سو میں نے ریتا کو سنبھالا۔ "آؤ۔ کرنل کے پاس چلتے ہیں، ڈنر کے بعد تمھی کوئی صورت نکالنا کہ تم سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔"

اُس نے گردن جھکالی، وہ بڑی سرشار نظر آتی تھی۔ اُس میں بجلی کی سی تیزی آگئی تھی۔ ہم دونوں کرنل کے کمرے میں آگئے۔ کرنل کے چہرے پر وہی نرم اور دلکش مسکراہٹ تھی جس سے بعض اوقات خوف آنے لگتا ہے۔ وہ مجھے سونے کے پستول کے مانند محسوس ہوا۔ "آہا پروفیسر زاہدی! کہیے آپ نے آج ہمیں کیسے یاد کر لیا؟"

"جناب کرنل! مجھے افسوس ہے آنے میں خاصی دیر ہوگئی۔ تمام راستے مجھے یہ خیال ستاتا رہا کہ انگریزوں کو ایک چیز سے شدید نفرت ہے، وقت کی بے حرمتی سے۔" میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ میرے اطوار میں ایسا تپاک تھا جو سفیروں اور سیکریٹریوں میں ہوتا ہے یا محکوموں میں ہوتا ہے۔

"ہندوستان میں رہتے رہتے انگریزوں کی عادتیں بھی خراب ہو گئی ہیں، یقین کرو پروفیسر! جب کوئی ہندوستانی مجھے وقت دیتا ہے تو میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم و اضافہ کر لیتا ہوں۔" کرنل نے خوش دلی سے کہا۔

"صرف ایک نہیں، انگریزوں نے ہندوستانیوں کی بہت سی کمزوریاں پکڑ لی ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کرنل! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں میری باتیں طعنہ و طنز پر محمول نہ کیجیے گا، میں ازراہِ تفنن بھی بہت سی باتیں کہہ دیتا ہوں۔"

"میں انھیں تفنن بھی نہیں سمجھتا، اس میں ہندوستانیوں کی فکر کی عکاسی ہوتی ہے اور اسی لیے آپ مجھے پسند ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی کس انداز سے سوچتے ہیں۔"

"اور مجھے آپ نے اُن کا ترجمان سمجھ لیا ہے لیکن میں یہ سوچ کے یہاں نہیں آیا، کرنل آپ کی شخصیت میں بے پناہ ٹھہراؤ اور گداز ہے، ایک نرمی اور شفقت، ایک بڑا پن۔ میں آپ سے ملنے آپ کو دیکھنے آتا ہوں۔ اور اگر میری آمد سے یا میرے سبب سے آپ کے لیے بھی سودمندی کا کوئی پہلو نکلتا ہے تو یہ میرے لیے بڑی مسرت کی بات ہوگی۔"

"ارے رے، ہم نے تو ملتے ہی سود و زیاں کی باتیں شروع کر دیں۔" کرنل نے خوش خلقی سے کہا۔ "ڈنر سے پہلے آپ کیا پئیں گے؟ ریتا! پروفیسر سے پوچھو کہ یہ کیا پینا پسند کریں گے۔"

کرنل کے آگے برف کی قاشیں، صراحی اور کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے رات کی رانی کی خوشبو آرہی تھی۔ اُس میں ہریالی کی مہک بھی شامل تھی، ادھر ریتا کے بدن کی خوشبو الگ تھی۔ کرنل کی قیمتی شراب کی بو سمیت خوشبوؤں کی ایک کاک ٹیل سارے کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ "شراب۔" میں نے گہری سانس لے کے کہا۔ "میں ازرُوئے اخلاق شراب پی لیتا ہوں اور انگریزوں کی شراب نوشی کی کثرت اس لیے معاف کر دیتا ہوں کہ وہ صنعتی انقلاب بھی لاتے ہیں، علم و حکمت کی باتیں بھی کرتے ہیں اور انھیں حکومت کرنا بھی آتا ہے، جنھیں حکومت کرنا آتا ہے اُن کے لیے شراب پینا جائز ہے۔"

کرنل نے ایک پیگ بنا کے مجھے دیا۔ "چیرس۔" اُس نے اپنے جام سے میرا جام ٹکرا کے کہا۔ میں نے ریتا کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔

مجھے اپنا دوست جارج یاد آگیا، وہ خود کو جارج ششم کہتا تھا۔ اُسے معلوم ہوتا تو وہ کتنی حیرت کرتا، میں اس وقت جارج ششم کے پاس بیٹھا تھا اور شراب کے دریا چھاؤنی میں بہتے تھے، وہ ایک ایک بوند کے لیے ترستا تھا۔ مجھ پر اُس کے بہت سے قرض تھے، زندگی باقی رہی، حالات قابو میں رہے اور اُس سے کبھی ملاقات ہوگئی تو میں نے سوچا تھا۔ حوض میں شراب بھر کے اُسے ڈبو دوں گا۔ پہلا گھونٹ سینہ کاٹتا ہوا جسم میں تحلیل ہوگیا۔ دوسرے نے حلق میں شعلے بھر دیے۔ وہ کوئی بہت سخت شراب تھی، کرنل تلخی پیتے پیتے اُس کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے شراب سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ رسیلے ہونٹوں سے کشید کیے ہوئے رس میں جو نشہ ہوتا ہے، وہ شراب میں کہاں ہے؟ کرنل کے قریب صراحی میں شراب رکھی تھی اور میری نظریں ریتا پر تھیں۔ میری صراحی وہ تھی۔ اُس میں لبالب شراب بھری ہوئی تھی بلکہ چھلک رہی تھی۔ دو تین گھونٹوں نے اعصاب تھپکانے کا کام کیا، شراب ایک تھپکی ہے، لوری ہے، کھلونا ہے، جھنجھنا ہے، شراب ایک آغوش ہے۔ شراب ایک طوائف ہے، کھلی ہوئی آنکھوں کی نیند ہے۔ میں نے اور کرنل نے بڑی دلچسپ نوک جھونک کا آغاز کیا۔ میں اُسے اِدھر اُدھر کے واقعات سنا کے محظوظ کرتا رہا۔ گفتگو کا کوئی ایک موضوع نہیں تھا، مجھے بہرصورت نفاست اور سلاست سے بولتے رہنا تھا تاکہ اسے میں اور یہ ساعتیں یاد آتی رہیں۔ مجھے احساس تھا کہ اُن دنوں ہندوستان میں انگریز کیسی تنہائی محسوس کرتے ہوں گے۔ انھیں غم گساروں کی تلاش ہوتی ہوگی اور خصوصاً کرنل تو عمر کے اُس حصے میں پہنچ گیا تھا جہاں بیٹھ کے دلچسپ باتیں سننے اور سنانے کی خواہش اُبھرتی ہے۔ کرنل جام پہ جام لنڈھاتا رہا اور میں اُس سے چھیڑ خانیاں کرتا رہا، اُسے ہنساتا رہا۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب ریتا نے ہمیں کھانے کی میز پر چلنے کی دعوت دی۔ کرنل کے قدموں میں کوئی ڈگمگاہٹ نہیں تھی۔ اُس کا چہرہ اور سرخ ہوگیا تھا مگر کوئی زاہد یہ فتوا صادر نہیں کر سکتا تھا کہ اُس نے شراب پی ہے۔ مجھے اُس کی برداشت پر بڑی حیرت ہوئی جب ہم اُٹھنے لگے تو فون کی گھنٹی نے سب کو ڈسٹرب

کر دیا۔ کرنل نے بے اعتنائی سے ریتا کو اشارہ کیا، اُس نے فون اُٹھایا۔ دوسری طرف سے مخاطب شخص کرنل ہی سے بات کرنے پر بضد تھا۔

کرنل نے ریسیور ریتا کے ہاتھ سے لے کے منہ بنا کر ہیلو کہا۔ "کیا؟" وہ چونک پڑا۔ "وہ کب سے نہیں ہے؟" میرا ماتھا ٹھنکا اور میری سماعت اپنی تمام توانائی سے اُس کی طرف مرکوز ہو گئی۔ "بارہ بجے سے۔" کرنل کی آواز میں حیرت تھی۔ "اُس کے بعد سے کوئی اطلاع نہیں؟" کچھ توقف کے بعد اُس نے سوال کیا۔ "تم نے کہیں پوچھا؟"

بتانے والے نے بتایا ہو گا کہ تمام ممکنہ ٹھکانوں پر اُسے پوچھا جا چکا ہے۔ کرنل کی آواز میں تعجب کا عنصر بڑھتا گیا۔ اُس نے غیر ارادی طور پر میری اور ریتا کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ "ابھی اُس کا انتظار کرو۔ وہ کسی رنگین کے ہاں موسیقی سن رہا ہو گا اور شراب پی رہا ہو گا۔ ممکن ہے اُس کی گاڑی خراب ہو گئی ہو، وہ آتا ہی ہو گا۔ اُس کا انتظار کرو۔" کرنل نے یہ کہہ کے فون رکھ دیا۔

"کیا بات ہے ڈیڈی؟" ریتا نے تشویش سے پوچھا۔

"میجر رابرٹ ابھی تک چھاؤنی واپس نہیں آیا ہے۔"

"تو یہ کون سی اہم بات ہوئی۔" ریتا نے سادگی سے کہا۔

"مگر اُسے اطلاع ضرور دینی چاہیے تھی کہ وہ تاخیر سے آئے گا۔ اُس کی بہن پریشان ہو رہی ہے۔ میجر ڈگلس کا فون تھا۔"

"میجر رابرٹ۔" میں نے بحث کے درمیان میں دخل دیا۔ "وہ دلچسپ آدمی ہے۔ وہ بہت زندہ دل ہے۔ یقیناً وہ راجپوتوں کے کسی رنگ محل میں ہو گا۔ اُسے ہندوستانی موسیقی کا چسکا پڑ گیا ہے۔ کہیں بیٹھ گیا ہو گا۔ کسی ہندوستانی دوشیزہ کے ساتھ باغ میں بیٹھا ہو گا۔ کئی دن ہوئے میں نے اُسے پہاڑیوں میں ڈگلس کی ایک بہن کے ساتھ گشت کرتے دیکھا تھا۔ وہ چھریری سی لڑکی۔ وہ پریت۔ ہاں وہی۔" میں نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ "ابھی وہ میرا ایکسیڈنٹ کرتی۔ جیسے ہی میں نے پرکاش بھون کے صدر دروازے سے گاڑی نکالی، وہ سامنے آگئی۔ ذرا سی کسر رہ گئی تھی۔ آیئے کرنل کھانا کھائیں، اب برداشت نہیں ہوتا۔" کرنل پھر مسکرا پڑا۔ ہم تین اشخاص ایک بڑی آراستہ میز کے گرد بیٹھ گئے۔ سفید وردیوں اور پگڑیوں والے ہندوستانی بیروں میں کھلبلی مچ گئی۔ میز پر مختلف کھانوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ "کیا آپ روز اتنا ہی کھاتے ہیں؟" میں نے اُن سے پوچھا۔

"اوہ نہیں۔ یہ سب آپ کے لیے ہے۔" کرنل نے شگفتگی سے جواب دیا۔

"سنا تھا، انگریز کھانے کی قسم سے زیادہ کھانے کے طریقے پر زور دیتے ہیں، آج یہ قول غلط ثابت ہوا۔" میں نے سفید نیپکن اپنے گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر، تم کچھ دن ہمارے ہاں رہ کیوں نہیں جاتے؟" ریتا نے لقمہ

نیرنگی

کراچی سے ابوظفر زین

ابراہیم بن مہدی خلیفہ کا بیٹا تھا۔ بہت دنوں تک اُس نے شہزادگی کی نعمتوں میں وقت گزارا اور باپ کے مرنے کے بعد خود خلیفہ بنا۔ چند سال بعد معزول ہو کے نئے خلیفہ کا مصاحب اور درباری بنا۔ پھر معتوب ہوا۔ عمر کے آخری حصے میں اس نے گانا گا کر اپنا پیٹ پالا حالانکہ بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ وہ ایک اچھا گانے والا تھا۔

عباسی خلفا کے زمانے میں مشہور وزیر قاسم بن عبداللہ کا آخری وقت تھا۔ قاسم کی سانس اکھڑ گئی۔ اُس کے دونوں بیٹے ابو علی اور ابو جعفر باہر آتے۔ عباس نامی ایک شخص وہاں کھڑا تھا۔ اُس نے باری باری دونوں کے ہاتھ چومے کیوں کہ قیاس یہ تھا کہ اب انھی دونوں میں سے ایک نیا وزیر بنے گا لیکن کچھ دیر بعد دربار سے یہ اعلان ہوا کہ عباس وزیر بنا دیا گیا ہے۔ اس پر مرحوم وزیر کے دونوں بیٹوں نے باری باری اُس کا ہاتھ چوما۔

کے درمیان لقمہ دیا۔ "ڈیڈی آپ ان سے کہیے کہ یہ مجھے ہندوستان کھانے کی زحمت کریں۔"

"آپ نے سنا پروفیسر، ریتا کیا کہہ رہی ہے۔" کرنل مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کچھ کچھ۔ ریتا ہندوستان کے بارے میں کچھ کہہ رہی ہیں، پُراسرار ہندوستان کے بارے میں۔"

"اور میں کہتا ہوں ہندوستان سے زیادہ پُراسرار آپ ہیں۔"

"آپ سچ کہتے ہیں۔ کبھی کبھی خود میں بھی یہی سوچتا ہوں لیکن آپ سے اور ریتا سے میرے کچھ اور ہی رشتے قائم ہو گئے ہیں۔ اس لیے اعتبار کیجیے کہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

کرنل نے مختصر لفظوں میں ترجمہ کر کے ریتا کو سنایا۔ وہ اٹھلا کے بولی۔ "ڈیڈی میں سمجھتی ہوں، ہمیں پروفیسر کے پیروں میں زنجیر ڈالنی پڑے گی ورنہ میرا ہندوستان کا دورہ ناکام ہو جائے گا۔ آپ دن بھر یہاں مصروف رہتے ہیں۔ پروفیسر وہ شخص ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ آپ انھیں روک لیجیے ڈیڈی! ان سے کہیے کہ یہ اچانک غائب نہ ہو جایا کریں۔ آپ ان سے درخواست کیجیے۔"

"ہاں ہم درخواست ہی کر سکتے ہیں، نہ معلوم پروفیسر کی کیا الجھنیں ہیں۔" کرنل نے اپنی بیٹی کو سمجھایا۔

میں اُن دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ پہلی ملاقات جیسی بے تکلفی کی فضا اب نہیں تھی۔ اس عرصے میں کرنل نے میرے بارے میں اور معلومات فراہم کر لی ہوں گی اور اُسے یقیناً یہ عرفان ہو گیا ہو گا کہ دنیش کے سوا، پرکاش بھون میں پروفیسر زاہدی کی شخصیت سے کوئی واقف نہیں ہے۔

"آپ کی درخواست سر آنکھوں پر کرنل!" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "آپ شاید الجھنوں کا ذکر کر رہے تھے۔ بلاشبہ بہت سی الجھنیں ہیں۔ براہِ راست

میرا تعلق کسی واقعے سے نہیں ہے لیکن میں راج کمار دنیش کا بلا شرکت غیرے دوست ہوں، آپ بہت سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں کرنل! ایک باخبر اور اطلاعات سے مسلح شخص کی حیثیت ہی سے آپ اپنی ذمے داری بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ آپ کس قدر جانتے ہوں گے، آپ کی ٹھنڈک، نرمی، شفقت اور آپ کے تحمل نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے، آپ ہندوستان پر حکومت کرنے والے انگریزوں سے مختلف ہیں، آپ مجھے اودھ کے کوئی شخص معلوم ہوتے ہیں، دھیمے دھیمے، میٹھے میٹھے سے۔ میری کچھ الجھنیں ہیں۔ کچھ زیادہ ہی۔" میں نے جھجک کر کہا۔ "ہم ادھر ادھر کی گفتگوئیں کیوں کریں۔ راجے پور میں آئے دن جو واقعات رونما ہو رہے ہیں، آپ اُن کے اسباب سے خوب واقف ہیں۔ انگریز کے خلاف ایک ہندوستان گیر تحریک ہے لیکن راجے پور میں ایسی کوئی متشدد تحریک نہیں ہے۔ راجے پور کے امرا جانتے ہیں کہ انگریز کے پاؤں ہندوستان کی زمین میں کس قدر اندر تک ہیں۔ صرف راجے پور میں انگریزوں کے خلاف بہت بڑا فساد کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس طرح انگریز ہندوستان سے نہیں نکل جائیں گے۔ راجے پور کے رئیس اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ وہ انگریز سے بیر دشمنی مول لیں۔ وہ تو دوستی چاہیں گے۔ اُن کے وسیع تر مفادات کا تحفظ دوستی ہی میں مضمر ہے۔ آپ کی دوستی کی تمنا میں لوگ کتنے مضطرب ہیں کرنل! آپ سے عشق کرنے کے لیے بے چین ہیں۔"

کرنل ہنسنے لگا۔ "پروفیسر! آپ بہت نادر باتیں کر رہے ہیں۔ ازراہِ کرم سلسلہ جاری رکھیے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب راجے پور میں آپ سے قریب ہونے کی لڑائی ہو رہی ہے۔ کون پہلے آپ کی نگاہِ کرم اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوتا، اس کا فیصلہ آپ پر اور آپ سے رفاقت کے دعوے داروں کی جدوجہد پر منحصر ہے۔ آپ اونچی نشست پر بیٹھے ہوئے اپنے مشتاقوں کا جلوہ کر رہے ہیں کہ آپ کس کے گلے میں ہار ڈالیں۔ آپ کی بڑی شان ہے کرنل! ایسی صورت میں میری کیا مشکلیں ہو سکتی ہیں اور کیا خواہشیں، آپ سمجھتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ انھیں وضاحت سے بیان کیا جائے۔ میں آپ سے ایک اور اہم بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی اس سلسلے میں شدت سے اصرار کیا تھا، میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ میرا درجہ اپنی نظروں میں محترم رکھیے کیونکہ میں روایتوں پر یقین رکھتا ہوں، آپ کے ذہن میں میری آمد کا کوئی مقصد متعین ہوگا، آپ نے اعلاظرفی کا ثبوت دیا ہے مگر میں ایک مختلف آدمی ہوں کرنل صاحب! مجھے آپ سے یہ تعلق بے حد عزیز ہے، میں اچھے لوگوں کی تصویریں اپنے دل کے البم پر چپکا لیتا ہوں کیونکہ میں ایک دل بھی رکھتا ہوں۔ تمام انسان اپنی اغراض کے رشتے رکھتے ہیں عالی جناب لیکن زندگی صرف فولاد اور پتھر نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ غرض کے سوا بھی آ سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں سے یوں ہی ملنے اور باتیں کرنے کو طبیعت چاہ سکتی ہے، کچھ لوگ اچھے بھی لگ سکتے ہیں، آپ سن رہے ہیں کرنل کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔" اُس نے مستعدی سے کہا۔

"نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کی زبانی اپنے متعلق آپ کا تاثر سنوں، میں آپ کی نظروں میں اپنا نرخ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں انگریز چھاؤنی میں بیٹھا ہوں کرنل! یہ خیال رہے کہ میری جیب میں ایک پستول ہے، میں بلند آواز سے گفتگو کرنے کی جسارت بھی کر رہا ہوں، ایسا شخص کون اور کیا ہو سکتا ہے، ہم بہت صاف صاف باتیں کر رہے ہیں، آپ نے عمر گزاری ہے جناب!" میں نے خوش گوار برہمی سے کہا۔ "میں آپ سے صاف گوئی کی درخواست کروں گا۔" یہ کہہ کے میں خاموش ہو گیا۔

"ایکسیلنٹ۔" کرنل نے بردباری سے کہا۔ "آپ نے ایک مشکل سوال کیا ہے پروفیسر! جو آپ کہنا چاہتے ہیں، وہ پوری طرح مجھ تک منتقل ہو چکا ہے۔"

"لیکن میں کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔" میں نے جذباتی ہو کے کہا۔ "میں سوال کر رہا ہوں، مجھے واپسی کا راستہ معلوم ہے۔"

"آپ نے ایک سانس میں بہت سی باتیں کہہ دی ہیں۔"

"لیکن ان سب کا مقصد ایک ہی ہے۔"

"میں آپ کا احترام کرتا ہوں پروفیسر!" کرنل نے شستہ انداز میں کہا۔ "کیا آپ کے ساتھ یہ خوب صورت وقت گزارنا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ میں آپ کو سفیر اور وکیل سے زیادہ ایک شخص، ایک دوست سمجھتا ہوں۔"

"آپ نے مجھے دوستی کا اعتماد بخشا ہے کرنل! میں آپ کا ہرکارہ یا ملازم نہیں ہوں۔ یہ شرف میں آپ کو بھی بخشتا ہوں۔"

کرنل کا قہقہہ نکل گیا۔ "کیا پروفیسر نے کوئی بہت دلچسپ بات کہی ہے؟" ریتا نے اشتیاق کے ساتھ اپنے باپ سے پوچھا۔

"بے حد۔ یہ ایک بے حد عجیب آدمی ہے۔"

"کرنل! میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔" میں نے شوخی کی۔

"بہت شان دار۔ آپ بہت خوب صورت ہیں، آپ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ صرف چند چیزیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔"

"یقیناً آپ کا اشارہ اس طرف ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "زندہ رہنے کے لیے آدمی کو بڑے بڑے بہروپ بھرنے پڑتے ہیں صاحب! اس روپ پر نہ جائیے، اس کے اندر جو شخص چھپا بیٹھا ہے اُسے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔"

"میرے سامنے وہی ہے۔"

"تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

کھانا کھا کے ہم لان میں بیٹھ گئے۔ لان میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ میں بہت مطمئن تھا۔ اس موقع پر میں اپنی داڑھی اُتار کے کرنل کے لیے

کچھ اور دلچسپی کا سامان فراہم کرسکتا تھا۔ اب داڑھی کے بال چبھنے لگے تھے اور یہ کچھ زائد سی معلوم ہونے لگی تھی لیکن کرنل کا سکون دیکھ کے میں نے وہ چہرے پہ برقرار رہنے دی۔ لان پہلے ہی گیلا تھا، اب دوبارہ پھوار پڑنے لگی تھی۔ اس لیے ہم واپس اندر آگئے۔ کرنل نے غالباً دانستہ راجے پور کے سیاسی حالات کا ذکر شروع کر دیا تھا۔ ہماری بات چیت کا یہ انتہائی نازک وقت تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میں کم گوئی اختیار کروں اور کرنل کا کلام بلاغت نظام سنتا رہوں مگر کرنل ایک ذہین شخص تھا۔ شراب کے خمار کے باوجود وہ بہت سنبھل سنبھل کے ٹھہر ٹھہر کے اشاروں کنایوں میں بات کر رہا تھا، اگر میں انگریز ہوتا تو اُسے ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے سب سے اعلا عہدے پر تعینات کر دیتا مگر میں اتنا خوش نصیب کیوں ہوتا کہ برطانیۂ عظما میں پیدا ہونے کا اعزاز حاصل کرتا۔ سارا قصور پیدائش کے محل وقوع کا ہے، کوئی زرخیز زمین میں پیدا ہوگیا، کوئی بنجر میں، کسی نے زندگی بھر محنت کی اور کفن بھی نصیب نہ ہوا، کوئی آیا تو اس کے غلام اُس سے پہلے آچکے تھے، کوئی پرکاش بھون میں پیدا ہوا، کوئی الٰہ آباد کے ایک متوسط گھر میں۔ ہماری بات چیت ابھی جگدیپ کی حویلی تک پہنچی تھی کہ فون نے پھر دخل در معقولات کی۔ میں چوکنّا ہو کے بیٹھ گیا۔

"کیا وہ ابھی تک نہیں آیا؟" کرنل نے درشتی سے پوچھا۔ "اسے معلوم تھا کہ میس میں رقص کا پروگرام ہے؟" جواب دیا گیا ہوگا، ہاں اُسے معلوم تھا، کرنل کے ماتھے پر مکڑی نے جالا تُن لیا۔ "پھر گشتی گاڑیاں روانہ کرو، سنو، اُسے اب مختلف جگہوں پر پوچھنے کی کوشش نہ کرنا، ایک گھنٹے اور انتظار کرو، میں سمجھتا ہوں۔ آج اُس نے کسی جگہ زیادہ پی لی ہوگی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کی بہن مونا سے کہو کہ وہ اطمینان سے آرام کرے، میجر کسی وقت بھی آجائے گا۔ ممکن ہے وہ کسی اور اہم کام سے نکل گیا ہو۔" کرنل نے فون پٹخ دیا۔ "یہ میجر رابرٹ۔ نان سینس۔"

"کیا میجر رابرٹ ابھی تک واپس نہیں آتے؟"

"نہیں۔" کرنل نے جھنجلا کے کہا۔

"آجائیں گے، ایسی گھبراہٹ کی کیا بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"میجر کو آجانا چاہیے تھا۔" کرنل فکرمندی سے بولا۔

"چھوڑیے بھی، اُن کی عمر ابھی جلدی گھر آنے کی نہیں ہے۔ راجے پور میں حسین عورتوں کی کثرت ہے، کسی طرف نکل گئے ہوں گے۔"

کرنل کچھ مکدّر سا ہوگیا تھا اس لیے میں نے اُس سے اجازت لینی چاہی مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ریتا نے کہا۔ "ڈیڈی اب آپ کے سونے کا وقت ہوگیا ہے، آپ آرام کیجیے اب پروفیسر سے میں باتیں کرتی ہوں آپ انھیں آزاد کر دیجیے۔"

"ابھی ہم نے باتیں شروع کہاں کی ہیں ریتا!" کرنل اپنی بیٹی سے غیر معمولی محبت کرتا تھا۔ ریتا اُس کی اکلوتی لڑکی تھی۔ ریاست پر کرنل کا حکم چلتا تھا اور کرنل پر ریتا کا۔ وہ تحکم سے بات کرتی تھی۔ کرنل نے کہا۔ "پروفیسر کو بہت دیر ہوگئی ہے، راستہ طویل ہے، میرا خیال ہے، میں پروفیسر کو آج کی شام کے شکریے کے ساتھ رخصت کر دینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے آپ اپنے کمرے میں آرام کیجیے۔" وہ ناز سے بولی۔ "میں پروفیسر کو روک لوں گی۔ جب سے وہ آئے ہیں، آپ ہی باتیں کیے جا رہے ہیں۔"

"پروفیسر! یہ لڑکی جو تم دیکھ رہے ہو۔" کرنل نے مسکراتے ہوئے ریتا کی کمر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "یہ لڑکی میری بیٹی ہے، اس کا نام ریتا ہے، یہ ابھی تک بہت بچی ہے، ضد کرتی رہتی ہے۔ اسے سمجھاؤ، یہ اس وقت تمھیں مزید روکنا چاہتی ہے۔"

"آئیے، اٹھیے پروفیسر!" ریتا نے میری انگلیاں اپنی نازک انگلیوں کی گرفت میں لے لیں۔ میں نے پھولوں کی زنجیریں پہن لیں۔ میں نے بظاہر بے بسی سے کرنل کی طرف دیکھا۔ کرنل شفقت کے انداز میں سر کو حرکت دے رہا تھا۔ انگریز باپ ہو کے کیسا بدل جاتا ہے، اس میں اور ایک ہندوستانی میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ وہ ایک مربیانہ تبسم، ایک بوڑھا تبسم۔ میں نے راجے پور میں لندن کی سیر کی، کئی دن کا انگریز دیکھا، ریتا نے اپنے باپ کے سامنے میری اُنگلی پکڑ لی تھی، انگلستان کے اطوار ہی انوکھے تھے۔ غالباً یہ ذات کے زیادہ اعتماد کی دلیل تھی۔ انگریزوں نے ذات کا سفر ذرا تیز کیا تھا۔ ہندوستان میں ہر جگہ پردے لٹکے ہوتے ہیں مگر انگلستان والے کھلی فضاؤں کے قائل ہیں، وہ چلمن نہیں لگاتے، اُن کے دروازے کھلے ہوتے ہیں، وہ جھانکتے نہیں، صاف سامنے آجاتے ہیں۔ کرنل نے مخمور نگاہ سے ہمیں دیکھا۔ "اب آپ سے کب ملاقات ہوگی پروفیسر؟" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کسی وقت بھی، جب بھی آپ نے شدّت سے یاد کیا، مجھے پتہ مل جائے گا۔ شرط یہی ہے کہ آپ یاد کریں۔" میں نے یاد کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

مامون رشید کے زمانے میں ابراہیم بن رستم نامی ایک عالم گزرے ہیں۔ وہ شہر مرو میں دبّاغوں یعنی چمڑا پکانے والوں کے بچّوں کو پڑھاتے تھے۔ مامون ایک بار مرو گیا۔ اُس نے ابراہیم کو بُلایا اور اُنھیں قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا۔ "مجھے درس و تدریس ہی کا شغل مرغوب ہے، میں کوئی اور شغل اختیار نہیں کرسکتا۔"

پھر مامون کا وزیر فضل برمکی ابراہیم کے پاس پہنچا۔ فضل برمکی خلیفہ کے بعد ملک کا سب سے بااختیار آدمی تھا مگر ابراہیم اس کی تعظیم کے لیے کھڑے نہیں ہوئے، وہ بھی بیٹھے رہے اور اُن کے طلبہ بھی بیٹھے رہے۔ فضل کے ایک ساتھی نے اُن سے کہا۔ "ابراہیم! تعجب ہے کہ تم محض دبّاغوں کے اُستاد ہو اور تم تعظیم کے لیے بھی نہیں اُٹھتے۔"

ابراہیم کے بجائے اُن کے ایک طالب علم نے جواب دیا۔ "اب ہم لوگ چمڑا نہیں پکاتے۔ ہم وہ علم سیکھ رہے ہیں جس نے ابراہیم کو اس مرتبے پر پہنچایا کہ وزیر اُن سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔"

"میں نے آپ کو بھلایا کب ہے؟ آپ بھلائے جانے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔" کرنل یہ کہہ کے جھومتا ہوا پہلو کے دروازے سے کہیں گم ہو گیا اور میں ریتا کی مخروطی انگلیوں کی ڈوری سے بندھا بندھا سیڑھیاں چڑھنے لگا، سب کچھ خواب سا معلوم ہوتا تھا، رگوں میں گردش کرتا ہوا خون جل رہا تھا۔ شہزادی کے آنے کی سرسراہٹ پر سارے ملازم مؤدب ہو گئے، ریتا انھیں نظر انداز کرتی ہوئی مجھے کوٹھی کے سب سے اونچے کمرے میں لے آئی۔ یہاں سے چھاؤنی کی عمارتوں کی روشنیاں بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں نیچے لان کا گداز سبزہ تھا۔ اوپر آسمان پر ستاروں کا جھرمٹ، نیچے درختوں کی شاخیں کھڑکیوں کو بار بار بوسے دے رہی تھیں، جدید ساز و سامان سے آراستہ اس کمرے سے چاروں سمتوں کی ہوائیں گزرتی تھیں۔ رات کا وقت تھا، گہری رات کا وقت، سب کچھ موجود تھا، کمرے کی ہلکی سُرخ روشنی جیسے اُس کے رخساروں سے پھوٹ رہی تھی۔ اُس کے ابروؤں کی کمانیں کھنچی ہوئی تھیں، تیز دھار کے چاقو سے کٹے ہوئے اُس کے ہونٹ رخساروں کی پلیٹ میں رکھے ہوئے تھے جیسے کسی نے لال امرود کی قاشیں کمال لطافت سے کاٹی ہوں۔ میں نے اُس کے دونوں شانے تھام لیے اور گم سُم ہو کے اُس کا نظارہ کرتا رہا۔ وہ بھی اضطراب آمیز خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی، کبھی وہ نظریں جھکا لیتی، کبھی سٹ پٹا کے مجھے دوبارہ دیکھنے لگتی۔ "ریتا!" مجھے اپنی آواز پر خود حیرت ہوئی۔ وہ جھنجھنا رہی تھی۔

"ہاں!" اُس نے لرزتے ہوئے کہا۔

"ٹھیرو!" مجھے یاد آیا کہ دنیش نے میری جیب میں ایک انگوٹھی رکھ دی تھی۔ میں نے عجلت میں انگوٹھی جیب سے نکال کے اُسے پہنا دی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ اشتیاق سے انگوٹھی دیکھتی ہوئی بولی۔

"کچھ نہیں، بس جی چاہا کہ جا رہا ہوں تو تمھارے لیے کوئی چیز لے کے جاؤں۔" میں نے اُس کی اُنگلی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

"اوہ پروفیسر!" وہ بار بار انگوٹھی دیکھتی تھی۔ "تو تم نے محسوس کر لیا، تم نے محسوس کر لیا؟" اُس نے تکرار کی۔ "میں تم سے ملنے کے لیے شدید بے قرار تھی، میں نے کتنی ہی بار تمھیں فون کیا مگر تم نہیں ملے۔" اُس کا سیلاب رُکا ہوا تھا، صرف ایک اشارے سے اُمڈ پڑا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کتنی بے قرار تھیں۔ میں پرکاش بھون میں موجود تھا لیکن تم سے فون پر بات نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے صاف انگریزی میں کہا۔ وہ میری زبان کی شستگی اور روانی پر حیرت زدہ تھی۔

"تمھاری حیرانی بجا ہے، میں تمھیں کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ میں سوچتا تھا کہ تم ایک معزز انگریز افسر کی لڑکی ہو اور میں ایک گم گشتہ، گم کردہ راہ مسافر، وہ ایک جذباتی تاثر جو تم پر مہاراجا کی دعوت میں قائم ہو گیا ہے، وہ خود بخود ختم ہو جائے گا لیکن تم نے پھر مجھے اپنے پاس کھینچ لیا، آج میں یہ سوچ کے آیا تھا کہ تمھیں سب کچھ بتا دوں گا لیکن تمھارے مغربی قالب میں ایک مشرقی لڑکی کی رُوح موجود ہے۔ تمھیں کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا اور تم نے سب کچھ کہہ دیا۔ تم اچانک اتنی تیزی سے لپکیں کہ مجھے خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں تم آگے جا کے گر نہ جاؤ، تمھیں چوٹ لگ جائے گی۔ ممکن ہے تمھارے ڈیڈی نے میرے بارے میں تم سے کچھ مبہم باتیں کی ہوں۔ تم بہت سادہ اور معصوم ہو لیکن تم کچھ نہیں جانتیں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

"میں صرف تمھیں جانتی ہوں۔" اُس نے اعتماد سے کہا۔

"مجھے بھی تم نہیں جانتیں۔ یہ پروفیسر جو تمھارے سامنے کھڑا ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ دیکھو۔" میں نے اپنی مونچھیں کھینچ لیں۔ "یہ دیکھو۔" پھر میں نے وحشت میں اپنی داڑھی نوچ لی اور چشمہ اُتار کے کرسی پہ پھینک دیا۔ "میں یہ ہوں۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے نزدیکی سے میرے جسم پر ایک نظر ڈالی۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ "اوہ تم یہ ہو۔" اُس نے کشمکش کے لہجے میں کہا۔

"ہاں میں یہ ہوں، تم مجھے پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔" میں نے نڈھال ہو کے کہا۔ "میں راج کمار دنیش چندر کا ایک ادنا ملازم، محکوموں کا محکوم ہوں، میرا نہ کوئی گھر ہے نہ در، میں دنیا کا سب سے تنہا آدمی ہوں۔ یہ میں ہوں موہن داس! تم نے دیکھا ریتا؟ اسی لیے میں تم سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ تم واپس چلی جاؤ۔"

"میں نے اُسی دن تمھیں پہچان لیا تھا۔" وہ میری توقع کے خلاف پُرمسرت لہجے میں بولی۔ وہ لرزیدہ تھی۔ "مجھے یقین تھا کہ تم وہی ہو، تم ....." وہ اچانک میرے سینے سے لگ گئی۔ "تمھیں یہ بہروپ بھرنے کی ضرورت کیوں پڑی؟" اس طرح کوئی سینے سے نہیں لگتا جب تک وہ خوابوں اور خیالوں میں اس کی ریہرسل نہیں کر لیتا۔ میں نے اپنا روپ ریتا پر اُسی وقت ظاہر کیا تھا، جب مجھے یہ اعتماد حاصل ہو گیا تھا کہ میں اپنا چہرہ سیاہ کر کے بھی اس کے سامنے پیش کر سکتا ہوں، یہ اعتماد میری مساعی سے حاصل نہیں ہوا تھا، خود ریتا نے آگے بڑھ کے اتنی جلدی ایسا مکمل اظہار کیا تھا کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا دعوا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں قید کر لیا۔ اس سے پہلے میں نے کسی انگریز کو روتے اور سسکتے نہیں دیکھا تھا۔ اس چشم گنہ گار نے یہ منظر بھی دیکھا۔ میں نے اُسے خود سے علیحدہ کیا اور اس کا چہرہ سامنے کر کے کہا۔ "مجھے معاف کر دو، میں نے تم سے بہت جھوٹ بولے لیکن میں بہت مجبور آدمی ہوں۔ یہ سچ بھی تم نے بکوایا ہے، سچ بولنے کی منزل آ گئی تھی۔ میں نے سوچا، میں زیادہ دیر جھوٹا رہا تو تمھاری نظروں میں گر جاؤں گا۔ میں نے سوچا، میں تمھیں سب کچھ صاف صاف بتا دوں تاکہ ایک خوب صورت لڑکی جلد سنبھل جائے، زیادہ دیر تو نہیں ہوئی ہے؟"

"یہ سب کیوں ہے پروفیسر؟" اُس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"یہ سب ایک لمبی داستان ہے۔ سنو گی؟ حوصلہ رکھتی ہو؟ آؤ بیٹھ جاؤ۔" ہم دونوں ایک ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُس کے ہاتھ میری گرفت میں تھے۔

"میں تمھیں یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہوں، اس میں کون سا جذبہ شامل ہو سکتا ہے، یہ تم ضرور محسوس کرو گی۔" میں نے اُس کے رخساروں پر لرزتے ہوئے قطرے پھونک مار کے اُڑا دیئے۔ "سنو ریتا! میں آج بھی کرنل کو بتانے والا تھا لیکن پھر چند مصلحتیں آڑے آگئیں، وہ تم سے میرے متعلق کوئی بات کریں تو اشارتہً انھیں بتا دینا کہ وہ جتنا کچھ سمجھتے ہیں، صحیح سمجھتے ہیں، ضروری نہیں کہ میں اُن کے سامنے اصل چہرے کے ساتھ ہی آؤں، راج کمار دنیش چندر کے ملازم کی حیثیت سے میرا یہاں آنا مناسب نہیں ہے۔ دنیش چندر ایک نیک اور شریف النفس نوجوان ہے۔ پہلے وہ بھی مجھے ملازموں کی طرح برتتا تھا۔ پھر وہ میرا دوست ہو گیا، بہت گہرا دوست۔ میرے سارے عزیز مر چکے تھے اس لیے میں دل شکستہ و درماندہ پرکاش بھون میں آ کے پڑ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہاں ایسے حالات پیش آئے کہ مجھے بہت سے معاملوں میں ملوث ہونا پڑا۔ تم نئی نئی آئی ہو۔ تمھیں راجے پور میں ہونے والی سازشوں اور خون ریزیوں کا علم نہیں ہو گا۔ یہ ریاست اور سیاست ایک گورکھ دھندا ہے۔ میرا دوست دنیش چندر بھی انھی سازشوں کا شکار ہے۔ ہم نے اپنی بقا کے لیے کسی نہ کسی طرح سازشوں کا جواب دیا ہے۔ کوئی بھی ہماری جگہ ہوتا تو یہی کرتا مگر سازشیں ختم نہیں ہوتیں۔ دنیش چندر سے قربت کے باعث میں بھی زد پر ہوں۔ حالات معمول پر ہوتے تو دنیش چندر یہ اعلان کرنے میں کوئی تاخیر نہ کرتا کہ میں پوری طرح اُس کا دوست ہوں۔ بھون میں میری حیثیت اور ذمے داریاں بڑھا دی جاتیں۔ میری نمائشی اور مصنوعی حیثیت ختم ہو جاتی لیکن بھون میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آشیانے سے مخلص نہیں ہیں۔ میں پس پردہ رہ کے اپنے دوست دنیش چندر کے زیادہ کام آ سکتا ہوں۔ سب کو یہی معلوم ہے کہ میں دنیش کا خاص ملازم ہوں۔ اُس دن جب تم آئیں تو اور لوگ بھی موجود تھے۔ تم نے فون کیا اور آنے پر اصرار کیا تو ہمیں یہ بہانہ بنانا پڑا کہ پروفیسر زاہدی باہر گیا ہوا ہے، پروفیسر زاہدی کو بھون میں کوئی نہیں جانتا اس لیے وہ تمھارے سامنے نہیں آ سکتا تھا اور نہ موہن داس ایک ملازم اور انگریز آفیسران کمانڈر کی لڑکی کا میل جول بھون کے لوگوں کو پسند آتا۔ وہ ملازموں کو کم تر درجے کی نسل سمجھتے ہیں جس طرح بعض انگریز ہندوستانیوں کو سمجھتے ہیں۔ ایک دن دنیش کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ میرا بھیس بدل کے مجھے مہاراجا کی خصوصی دعوت میں لے گیا۔"

"یہ راج کمار دنیش چندر نے میرے ساتھ احسان کیا ہے۔ میں اُن کی ممنون ہوں۔" ریتا مسکرا کے بولی۔ وہ بہت محویت سے میرا بیان سن رہی تھی

"اور میرے ساتھ بھی۔" میں نے اُس کی گردن میں بازو حمائل کر دیے۔ "تم نے اندازہ کیا کہ ہمیں تم سے کوئی معقول عذر پیش کرنے میں کیسی مشکل پیش آئی ہو گی۔ سمجھ رہی ہو نا؟ جب کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی تو میں نے تمھارے پاس آنے اور سب کچھ کھل کر بتا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب تمھارا مجرم تمھارے سامنے پیش ہے۔"

"تم داڑھی کے بغیر کتنے اسمارٹ اور دلکش نظر آتے ہو۔" وہ شیفتگی سے بولی۔ "اوہ تم نے کتنا اچھا کیا کہ یہ اندھیرا دور کر دیا۔ اُف تم کتنے بڑے اداکار ہو۔ مجھ سے غلط سلط انگریزی بولتے رہے، تم نے مجھے بہت ستایا۔"

"اور اب تمھیں جھوٹ بولنا ہے۔ یہ باتیں میں نے تمھیں بتائی ہیں، ایک لڑکی ریتا کو، انگریز کرنل کی بیٹی کو نہیں، میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم یہ تمام تفصیلات کرنل کے گوش گزار نہ کرنا صرف یہ بتا دینا کہ پروفیسر زاہدی وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے، وہ خود بھی یہی کہتے ہیں لیکن تم میری انگریزی دانی وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں بتاؤ گی۔ ورنہ کرنل سے مجھے بڑی ندامت ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری ہدایت پر عمل کرو گی اور چھاؤنی میں مجھے کمزور نہیں کرو گی۔"

"لیکن یہ صورتِ حال تو اب بھی موجود رہے گی۔ میں تم سے اب بھی نہیں مل سکتی، نہ میں بھون آ سکتی ہوں اور نہ تم یہاں۔"

"کیوں نہیں۔ تم دنیش کی دعوت پر کچھ دنوں کے لیے بھون میں آ جاؤ۔ اب تم مجھے دیکھ کر چونکو گی نہیں۔ بھون کے دوسرے لوگوں کے سامنے مجھ سے تمھارا رویّہ بے نیازی کا ہو گا جیسا ملازموں کے ساتھ ہو سکتا ہے اور جب دوسرے لوگ سامنے نہیں ہوں گے تو ہم دونوں کو تنہائی کا خوب موقع ملے گا، خوب باتیں کریں گے، خوب ملا کریں گے۔ صرف میرا دوست دنیش چندر میرے اور تمھارے تعلق کا رازدار ہو گا اور اُس کی کوشش یہی ہو گی کہ وہ اپنے دوست کو ہر حال میں آسودہ رکھے۔ اِدھر میں پروفیسر

زاہدی کے روپ میں کبھی کبھی کرنل سے ملنے آتا رہوں گا کسی کو یہ علم بھی نہیں ہوگا کہ دنیش جیندر کا ایک ملازم آفیسران کمانڈ سے ملنے آتا ہے تو کیوں آتا ہے۔ تم وہاں آؤ گی تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، میں تمھیں راجے پور کی سیر کراؤں گا، اپنی سیر کراؤں گا۔"

"اوہ، یہ سب کچھ کتنا دل کش، کتنا پُراسرار اور خواب ناک ہے۔"
ریتا اُچھل کے بولی۔ "میں ڈیڈی سے اجازت لے کے بھون میں ضرور آؤں گی۔ یہ ایک دلچسپ ایڈونچر ہوگا۔"

رات خاصی گزر چکی تھی۔ وہ اب میرے پہلو میں آگئی تھی اتنی باتیں ہونے کے بعد کوئی دُور کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ میرا حال عجیب تھا، جی چاہتا تھا کبھی صبح نہ ہو، میں نے اُس کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی۔ "اب میں چلوں گا۔ دنیش میری وجہ سے اب تک سویا نہیں ہوگا۔ مجھے اجازت دو۔"

"کچھ دیر اور بیٹھو۔" تمام عورتیں ایک جیسی باتیں کرتی ہیں، میں نے اُسے اور اپنے پہلو میں سمیٹ لیا اتنا کہ کوئی گنجائش نہیں رہی۔ ہم دونوں خاموش ہوگئے، وہ میرے تناور درخت کی چھاؤں میں آنکھیں موندے بیٹھی تھی اور میں اُس کے بدن کی جنت پہلو میں سمیٹے ہوئے تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی سانسیں سُنتے رہے گہری، طویل سانسیں اور دل کی دھڑکنیں۔

"ریتا!" میں نے مدھم روشنی کی طرح مدھم آواز میں اُسے آواز دی۔

"ہاں۔" اُس نے غنودگی میں کہا اور سر اٹھایا تو اُس کے گلابی ہونٹ میری آنکھوں کے سامنے آگئے۔ میں نے وہ آگ اپنے منہ میں رکھ لی۔ اُس میں ایسی بجلی تھی کہ میں لرز گیا، پھر میں اچانک تیزی سے اُٹھ گیا۔ وہ بہکتے ہوئے قدموں سے میرے شانوں پر جھولتی ہوئی آگے بڑھی۔ ہم نے زنانہ عبور کیا تو دفعتہً مجھے خیال آیا کہ میں اپنی داڑھی اور مونچھیں اور عینک چھوڑے جا رہا ہوں۔ انھیں اُٹھا کے میں نے چپکایا، ریتا مسکراتی رہی، میری ٹیڑھی مونچھ اس نے سیدھی کی، پتہ نہیں، میں پہلے کی طرح لگ بھی رہا تھا یا نہیں لیکن اس وقت میک اپ کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم دونوں سیڑھیاں اُتر کے ایک کمرے میں آگئے۔ "ڈیڈی جاگ رہے ہیں۔" اُس نے حیرت سے کہا۔ ایک کمرے کی کھڑکیوں سے روشنی آ رہی تھی، ہم قریب پہنچے تو کرنل کی گرج دار آواز رات کے سناٹے میں صاف سنائی دے رہی تھی، وہ فون پر احکام صادر کر رہا تھا۔ ریتا ساتھ نہ ہوتی تو میں چھپ کر اُس کے الفاظ ضرور سُنتا، جو بات میرے کان میں پڑی، وہ بہت مختصر تھی کرنل اپنے ماتحتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میجر رابرٹ کی آج کی اور گزشتہ دنوں کی سرگرمیوں کی رپورٹ تیار کرو۔ وہ کس کس سے ملا اور کہاں کہاں گیا؟ مجھے کرنل پر بڑا ترس آیا۔ ذرا سی بات تھی، کرنل کو جاگنا نہ پڑتا۔ میں صرف اتنا کہہ دیتا، فکر کیوں کرتے ہو رابرٹ راجے پور کے نواحی علاقے کی ایک سبزہ زار پہاڑی پہ آرام کر رہا ہے میں نے خود اُسے دیکھا تھا۔

ہم پورچ میں آگئے تھے۔ ریتا نے اصرار کیا کہ چھاؤنی کے کسی ڈرائیور یا اردلی کو ساتھ لیتا جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ کسی ہندوستانی ڈرائیور یا اردلی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ریتا کے سامنے کچھ سُبکی بھی محسوس ہوتی تھی، راستہ طویل اور خطرناک تھا اور وقت بھی بہت گمبھیر تھا۔ میں صبح ہونے تک کرنل کے ہاں ٹھہر سکتا تھا مگر مجھے دنیش جیندر کی فکر تھی۔ ادھر کسی وقت بھی انگریزی فوج کے گشتی دستے میجر رابرٹ کی لاش دریافت کر سکتے تھے۔ اس کے بعد راجے پور میں پھیلنے والے انتشار کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے جلد سے جلد بھون میں ہونا چاہیے تھا۔ جب میری گاڑی چلی تو وہ پورچ میں کھڑی حسرت سے ہاتھ ہلاتی رہی، میں اُس کی نم آنکھیں زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکا۔

گیٹ اُسی سعادت مندی سے کھول دیا گیا جس کا مظاہرہ آتے وقت کیا گیا تھا۔ اب میرے سامنے شہر کی طرف جانے والی سڑک تھی اور میں تھا۔

ہر سمت ایک بھیانک سکوت چھایا ہوا تھا، یہ ایک سیاہ رات تھی، آسمان پہ ابھی تک گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، زمین گیلی تھی کچھ دور جا کے اونچے نیچے چکردار پہاڑی راستے شروع ہو جاتے تھے۔ میں نے گیلی زمین کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بہت کم رکھی، ذہن پر بیک وقت متضاد خیالوں کی یورش تھی۔ گاڑی کسی شرابی کی طرح آگے بڑھ رہی تھی، جب چھاؤنی سے ملحق ہموار راستہ گزر گیا تو پہاڑیاں شروع ہو گئیں، میں نے اور احتیاط کا مظاہرہ کیا اور خوب اطمینان کرنے کے بعد موڑ کاٹتا رہا۔ ایک تنگ راستے سے گاڑی گزر رہی تھی۔ آگے جا کے ایک بڑا موڑ تھا۔ ہارن بجاتا ہوا میں اُس موڑ پہ آیا تو اچانک گاڑی کا توازن بگڑ گیا۔ میں نے تیز بریک لگائے، بریک کی چیخیں اردگرد کی پہاڑیوں میں دُور تک گونج گئیں، سامنے سڑک پر دو آدمی ڈھاٹے باندھے کھڑے تھے، گاڑی کی تیز روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ بے اختیار میرے ہاتھ ہارن پہ گئے مگر وہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں تنی ہوئی تھیں جن کا رُخ میری جانب تھا، یہ بات ایسی نہیں تھی کہ جلد سمجھ میں نہ آجاتی۔ اُن کے تیور باغیانہ سرکشانہ تھے۔ میں نے براہِ اخلاق ایک بار پھر ہارن بجایا اور انھیں ہٹانے کے لیے گاڑی اور آگے کی۔ وہ ذرا سے ٹھٹکے کچھ گھبرائے مگر دیکھتے دیکھتے اِدھر اُدھر کے پہاڑی اندھیروں سے کچھ آدمی سڑک پر کود گئے۔ اُن سب کی بندوقوں کا رُخ میری گاڑی کی جانب تھا۔ ایک لمحے میں مجھ پر لاکھوں چیونٹیوں نے حملہ کر دیا۔ سارا جسم یخ ہو گیا، کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی، رگ پٹھے جیسے کسی نے چمٹے سے پکڑ لیے۔ ایک لمحے میں ہزاروں فیصلے کیے اور مسترد کیے۔ اب میں نے گاڑی روک دی تھی اور بہ سرعت پستول اندر کی جیب سے نکال لیا تھا۔ بڑی آسانی سے میں اُن میں سے تین کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ روشنی میں اُن کا نشانہ لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یوں بھی میرے نشانے کی خاصی دھوم مچی ہوئی تھی لیکن یہ نشانے بازی کے جوہر دکھانے کا وقت نہیں تھا۔ بہت

سنجیدہ وقت تھا۔ میری دو تین گولیوں کے بدلے میں ساری گاڑی چشم زدن میں چھلنی کی جا سکتی تھی۔ میں نے تصور میں اپنے جسم کی دھجیاں اُڑتی دیکھیں۔ اگر میں تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دیتا تو تین چار کو وہیں چیر پھاڑ کے رکھ دیتا لیکن آگے صاف سڑک نہیں تھی، جگہ جگہ موڑ تھے، گاڑی تیز نہیں بھگائی جا سکتی تھی۔ پیچھے سے گولیوں کی ایسی بوچھار ہوتی کہ گاڑی چند قدم چل کے اوسان کھو بیٹھتی۔

ایک لمحہ دو لمحے تین لمحے، چند لمحوں بعد میں اپنے خلاف خود کو بدترین فیصلہ سنا چکا تھا۔ کاش میں ریتا کی بات مان لیتا اور چھاؤنی سے ایک شخص کو ساتھ بٹھا لیتا۔ گو صورت حال پھر بھی مختلف نہ ہوتی مگر ایسی ویرانی تو نہ ہوتی۔ اُس شخص کی زندگی بڑی تھی جسے میں ساتھ نہ لا سکا۔ پستول سے گولی چلاؤں ؟ گاڑی اُن پر چڑھا دوں یا نیچے اُتر کے خود کو سامنے پیش کر دوں ؟ ممکن ہے یہ محض لٹیرے ہوں اور دہشت کی دی ہوئی رقم نکال کے اپنا راستہ لیں، فضول خون خرابے میں کون پڑتا ہے۔ گاڑی گھیرنے کے بعد وہ ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اور دو آدمی آگے بڑھے۔ ان کی چال سے اطمینان ظاہر ہوتا تھا جیسے انھیں کوئی جلدی نہ ہو۔ میں نے ایک ہاتھ سے پستول تھاما، دوسرے سے ہینڈل لوز کیا اور اُن کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ جلد ہی گاڑی کے نزدیک آ گئے۔ میرا ایک ہاتھ ابھی تک دروازے کے ہینڈل پر جما ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ دروازے سے آدھے قدم کے فاصلے پر آئے میں نے دروازے کو پوری طاقت سے جھٹکا دیا۔ وہ ٹھیک اُن کے سینوں پر تیزی سے جا لگا اور ان کی گھٹی ہوئی چیخیں بندوق کی گولی کی طرح اچانک فضا کا سناٹا چیرتی ہوئی بکھر گئیں۔ ایک ثانیے کی دیر ہو جاتی تو میں اپنی نشست پر بیٹھا رہ جاتا۔ پستول کی نوک سے میں نے آناً فاناً روشنی کا بٹن دبایا تاکہ ہر طرف اندھیرا پھیل جائے۔ ادھر وہ گرے اُدھر تاریکی پھیلی، ادھر میں بجلی سے زیادہ تیز پھرتی کے ساتھ گاڑی سے کود گیا اور اندھیرے میں لپک گیا۔ زندگی اور موت میں ایک آن کا فاصلہ ہوتا ہے، نشانے پر آیا ہوا ہرن جتنا تیز دوڑ سکتا ہے، اُس سے زیادہ تیز میں نے یہ سب کچھ کیا۔ چند ہی قدم بھاگا تھا کہ پاؤں رپٹا اور ایک گڑھے میں آ پڑا۔ اُدھر گاڑی کے ارد گرد افراتفری مچ گئی تھی، تیز سرگوشیاں، گالیاں اور برہم قدموں کی تیز چاپ۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ اندھیرے نے زندگی کی اُمید برقرار رکھی۔ ورنہ اتنی بندوقوں کے سامنے زندگی کا چراغ کہاں ٹھیر سکتا ہے، زندگی کو بندوقوں اور گولیوں سے رغبت نہیں ہے۔ میں جس جگہ زمین سے چپکا ہوا تھا، وہ سخت غیر محفوظ تھی، مجھ سے بہت قریب وہ اشتعال انگیز سرسراہٹ کے ساتھ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ اُن میں سے چند گاڑی میں گھس گئے۔ چند گاڑی کے نیچے کچھ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے سر اوپر کر کے دیکھا اور موقع غنیمت دیکھ کے گڑھے سے آہستہ

مولوی صاحب نے داڑھی آنسوؤں سے تر کرتے ہوئے دُعا مانگی "مولا! بستی میں کوئی موت ہو جائے تاکہ مجھے نہلانے اور جنازہ پڑھانے کے دس رُپے مل جائیں ـــــ مجھے اگلے ہفتے کا راشن لانا ہے۔"
شام کو مولوی صاحب کا لڑکا فوت ہو گیا۔

سیالکوٹ سے خالد محمود آزاد

آہستہ بلند ہونا شروع کیا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے پھر اپنا سر گردن میں چھپانا پڑا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ کسی طرح یہاں سے کچھ فاصلے پر منتقل ہو جاؤں۔ پستول نے اس وقت اپنے دل سے زیادہ ساتھ دیا۔

اور اُس وقت میرے پاس، کوئی چارہ نہیں رہا جب میں نے اپنے سر کے قریب تین وحشت زدہ شورہ پشتوں کو محسوس کیا۔ کسی بھی لمحے اُن کا پیر میرے جسم پر پڑ سکتا تھا یا اُن کی اندھیرے سے مانوس ہوتی ہوئی نگاہیں میری طرف اُٹھ سکتی تھیں۔ میں نے کسی آہٹ کے بغیر اپنا ہاتھ اوپر کیا اور یکے بعد دیگرے تین فیر کیے، جواب میں بندوق کی گولی بھی چلی مگر اس مختصر ترین مدت میں وہ تینوں تڑپتے ہوئے گر گئے تھے۔ میں مینڈک کی طرح گڑھے سے اُچھلا۔ دوسرے حرام زادے ذرا دُور تھے۔ اس لیے مجھے ایک درخت کا سہارا لے کے پہاڑی پر چڑھنے کا موقع مل گیا۔ جھاڑیوں، کانٹوں اور درختوں کی پروا کیے بغیر میں گرتا پڑتا چڑھتا چلا گیا۔ اوپر درختوں میں اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں کسی بھی جگہ ٹھوکر کھا کے نشیب میں گر سکتا تھا مگر میں موت سے نبرد آزما تھا۔ زندگی بچانے کے لیے آدمی اپنے جسم کی جاتی ہوئی طاقت کا آخری سرا مشکل سے چھوڑتا ہے۔ میں کانٹوں اور جھاڑ جھنکار کی زمین پر لیٹ گیا اور رینگتا ہوا ایسی جگہ آ گیا جہاں میں نیچے کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ نیچے گولیاں چل رہی تھیں اور چیخ پکار ہو رہی تھی۔ ان کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میرے پستول میں صرف تین گولیاں باقی رہ گئی تھیں لیکن ایک پستول میرے پاس اور موجود تھا جس نے دوپہر میجر رابرٹ کی طاقت مفلوج کر دی تھی۔ میں نے اُسے اندر سے نکال کے باہر کی جیب میں رکھ لیا۔ سڑک اور گاڑی کے قریب میری تلاش میں ناکامی کے بعد اُن کا سڑک کے دونوں طرف کی پہاڑیوں پر چڑھنا لازم تھا۔ اُن میں سے چند میرے مقابل کی پہاڑی پر چڑھے، چند ادھر بڑھے جہاں میں دبکا ہوا تھا۔ آنکھیں اندھیرے سے کچھ کچھ مانوس ہونے لگی تھیں اور ایسے وقت تو تمام حواس حقِ رفاقت نبھاتے ہیں۔ میں نے اُن کے لپکتے ہوئے سایوں اور گالیوں کی آوازوں پر یکے بعد دیگرے گولیاں چلا دیں۔ دو تو اُسی وقت زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ تیسری گولی ضائع گئی لیکن اس طرح اُن کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ شاید کوئی اندھا دھند پیچھے بھاگنے کی کوشش میں سڑک پر گر پڑا۔ ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ جو نیچے پہنچ چکے تھے، اُنھوں نے اوپر کی

سمت گولیاں داغنی شروع کر دی تھیں۔

میرے اندازے کے مطابق چھ آدمی ٹھنڈے ہو چکے تھے، باقی کا حوصلہ جواب دے گیا ہوگا۔ میں نے دوسرا پستول جیب سے نکال کے چھاؤنی کی سمت بھاگنا شروع کر دیا تھا پھر پہاڑی کا ایک مختصر چکر کاٹ کے میں دوبارہ سڑک پر آ گیا اور سڑک پر اُن کے تھرکتے ہوئے سایوں کا نشانہ باندھا۔ سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ دوسرا پستول بھی خالی ہو گیا لیکن چار پانچ کو گرا کے خالی ہوا۔ اب وہ میری سمت آنے کے بجائے پہاڑیوں پر چڑھنے لگے اور میں آہستہ آہستہ گاڑی کی طرف رینگنے لگا۔ مجھے اُن کی گولی لگنے یا گرفت میں آنے کا کوئی خوف نہیں تھا، اتنا بہت تھا۔ اُن میں سے چند کا زندہ رہنا ضروری تھا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کی لاشوں سے سڑک صاف کر سکیں۔ یقیناً ان غنڈوں میں سے کوئی یہ پسند نہیں کرے گا کہ اُن کا کوئی ساتھی شناخت کر لیا جائے۔ میں انھیں گن تو نہیں سکا تھا، چار پانچ ہی زندہ ہوں گے یا دو تین اور۔ وہ پہاڑیوں میں بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ گاڑی کے پاس پہنچ کے میں اچک کر اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ چابی سوئچ میں لگی ہوئی تھی لیکن میں نے اُسے فوراً اسٹارٹ نہیں کیا۔ ہینڈ بریک آہستہ سے لوز کیا تو گاڑی پیچھے کی طرف لپکی، میں نے تیزی سے گیر ڈالا اور کلچ دبا کے چابی گھما دی۔ انجن نے دہاڑنا شروع ہی کیا تھا کہ میں نے کلچ سے پیر اُٹھا کے ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالا۔ گاڑی فرّاٹے سے بھاگی۔ انھوں نے گاڑی کی آواز پر مڑ کے دیکھا ہوگا۔ گولیاں چلیں لیکن گاڑی اُن کی زد سے دور آ چکی تھی۔ چیختی چنگھاڑتی ہوئی، گھومتی ہوئی جھٹکے کھاتی ہوئی ایک میل کے فاصلے پر پہنچ کے میں نے سانس لیا اور گاڑی کی رفتار کم کی۔

خوب! بہت مناسب اور موزوں جگہ کا انتخاب کیا تھا صرف آدمی کے بارے میں غلط اندازہ لگایا گیا تھا۔ شاید شگون نہیں لیا تھا۔ میری سانس پھول رہی تھی اور لباس پسینے سے تر بتر تھا۔ سامنے سڑک پر نظر تھی لیکن ذہن سڑک پر نہیں تھا۔ وہ لیٹرے نہیں تھے۔ لیٹرے کسی آدمی کے خلاف اتنے تشدد نہیں ہوتے۔ ہر ممکن احتیاط برتی گئی تھی، پھر کیسے خبر ہو گئی؟ کیا کرنل نے مخبری کر دی؟ ریتا نے فریب کیا؟ ساری بات صاف تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریز چھاؤنی پر تعینات ہندوستانی سنتریوں کا گزارا اُن کی مقررہ تنخواہوں میں نہیں ہوتا تھا اور انھیں ادھر اُدھر سلام دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھانے پڑتے تھے۔ پرکاش بھون سے چلتے ہوئے ایک ہی شخص راستے میں ٹکرایا تھا۔ اُس نے اس سے پہلے پروفیسر کو بھون میں نہیں دیکھا ہوگا۔ یقیناً رابرٹ اور دوسرے انگریزوں کے ذریعے اُسے خبر ہو گی کہ انھیں دنیش کے ساتھ ایک پروفیسر مہلا راجا کی دعوت میں ملا تھا۔ باتوں میں بہتا دریا تھا، قد و قامت میں اونچا درخت تھا، رنگ روپ میں گلاب کا پھول تھا، اُس کا نشانہ سچا تھا جب اُس نے داڑھی والے اس شخص کو دنیش کی خاص گاڑی میں جاتے دیکھا ہوگا تو اُسے شبہ ہوا ہوگا۔ تصدیق کے لیے اُس نے موہن داس کو پوچھا ہوگا۔ موہن داس غائب تھا۔ پھر جگدیپ سے رابطہ قائم کیا ہوگا تو چھاؤنی کے گیٹ پر ہندوستانی پہرے داروں نے اطلاع دی ہوگی کہ ایک بارِیش شخص کرنل ہارڈنگ سے ملنے گیا ہے۔

پر یہ جتنا وقت گزر رہا تھا، میرے دل میں اُس کی قدر و منزلت بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس میں کیا تیزی و طراری تھی۔ گھوڑا بھی خوب بھگاتی تھی، آدمی بھی خوب بھگاتی تھی، کتنی چوکنّی رہتی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ بتدریج اُس کے دل میں بھی میرا درجہ بڑھ رہا ہوگا۔ شہر کی حدود میں آتے آتے مجھے کچھ قرار آیا اور میں نے ٹھنڈی ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لیں اور گاڑی کو ڈھیل دے دی۔ گرم گھاؤ میں چوٹ کا پتہ نہیں چلتا، ٹھنڈی ہوا زخموں پر لگی تو کرب بڑھ گیا اور پرکاش بھون کے صدر دروازے پر آ کے تو عالم ہی دوسرا ہو گیا۔ بند دروازے پر گاڑی ٹکرا کے مکل جانے کو جی چاہا۔ سارا خون آنکھوں میں سمٹ آیا، رگیں کھنچنے لگیں۔ میں نے اضطراب میں ہارن بجایا۔ اونگھتے ہوئے دربانوں نے لالٹین اُٹھا کے میرا چہرہ دیکھا۔ داڑھی بے ترتیب ہو گئی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑوں پر دھول جمی ہوئی تھی۔ "دروازہ کھولو۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔

"کون ہے؟" دربان نے چندھی آنکھوں سے میرا چہرہ ٹٹولا۔ "کون صاحب ہیں؟"

"یہ گاڑی نہیں پہچانتے؟ میں راج کمار کا مہمان ہوں۔"

"گاڑی تو اُنھی کی ہے مگر راج کمار کے مہمان آئی رات گئے؟" وہ بڑبڑا کے بولا اور کچھ سوچنے لگا۔

"راج کمار کو مطلع کر دو کہ پروفیسر واپس آ گیا ہے۔"

"وہ اس وقت آرام کر رہے ہوں گے سرکار!"

"نہیں، وہ جاگ رہے ہیں اور میرا انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے تحکم سے کہا۔

"سرکار کو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔" وہ تساہل سے بولا۔ "گرامت نانیے حضور! آج کل پہرا سخت ہو گیا ہے۔"

"زیادہ باتیں نہ کرو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس عرصے میں دوسرا دربان بھی اونگھتا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ قریب آ کے وہ سرپٹ بھاگا اور پہلے والے دربان کو ہٹا کے مجھے جھک کے سلام کیا۔ "کھول دو۔ سرکار کا حکم ہے کہ اُن کی گاڑی جب بھی آئے، دروازہ کھول دیا جائے۔"

میں نے اُن کے سلام کا جواب نہیں دیا کیونکہ میں اپنے توازن میں نہیں تھا۔ نہ جانے کس طرح یہاں تک گاڑی کھینچتا ہوا لایا تھا۔ اندر جا کے میں نے گاڑی ایک کونے میں پارک کر دی اور داڑھی مونچھیں نوچ کے کوٹ کی جیب میں ڈال لیں۔ راہ داری کے پاس بیٹھا ہوا دربان بھی اونگھ رہا تھا۔ میں چپکے سے اندر کھسک گیا اور دنیش کے کمرے ہی میں پہنچ کے رُکا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ اُس

کے پاس میز پر فون رکھا تھا۔ میرے کھٹکے پر وہ بے چینی سے اُٹھا۔ میرے پیر ڈگمگانے لگے۔ میں نے خود کو اُس کے بازوؤں میں گرا دیا۔ "کیا ہوا موہن؟" وہ سراسیمگی سے بولا۔

"کچھ نہیں۔ مجھے ایک گلاس پانی پلایئے اور میرا سر کاٹ دیجیے اب یہ سر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا" میں نے اپنے بال جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو" اُس نے مجھے صوفے پر لٹایا اور بھاگ کے گلاس میں پانی لے آیا۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے پانی پلا کے اُس نے میرا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

صبح کے قریب مجھے ہوش آیا، میرے سر کے نیچے تکیہ رکھا ہوا تھا اور وہ ٹانگیں پھیلائے صوفے پر غنودہ تھا۔ میں بوکھلا کے اُٹھ بیٹھا۔ ٹائی میرے گلے میں نہیں تھی، پیر میں موزے اور جوتے بھی نہیں تھے۔ میری آہٹ پر وہ بیدار ہو گیا۔ میں نے ندامت میں اسے دیکھنے کی کوشش کی، اُس کے لبوں پر کچھ بھری مسکراہٹ تھی۔ "کیسی طبیعت ہے؟" اُس نے مضمحل آواز میں پوچھا۔

"بالکل۔ بالکل ٹھیک ہے" میں نے خجالت سے کہا۔ "مگر آپ سوئے نہیں، ساری رات یہیں گزار دی، مجھے خبر ہی نہیں کہ میں کب آیا اور آتے ہی یہ کیا ہو گیا"

"تم بہت تھکے ہوئے تھے بے حد۔ اب اُٹھ کے جلدی سے نہا لو۔ میں چائے منگواتا ہوں" میرے نہانے سے پہلے ہی اُس نے مجھے گھڑوں پانی میں بھگو دیا تھا، میں اُس کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا اس لیے دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہوا اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ غسل کے بعد میں چولا بدل کے آیا تو چائے تیار تھی۔ "دونوں پستول خالی کر دیے؟" اُس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔

ہما اچھل پڑا، چائے کی پیالی گرتے گرتے رہ گئی۔ کیا صبح صبح اُس کے پاس کہیں سے کوئی اطلاع آ گئی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے اندازے کے برعکس وہ ناہنجار اپنے ساتھیوں کی لاشیں سڑک پر چھوڑ کے فرار ہو گئے۔ پھر فوراً مجھے خیال آیا کہ نہیں، بات یہ ہے کہ اس نے میرے کوٹ کی تلاشی لی ہو گی اور دونوں پستول خالی دیکھے ہوں گے۔ میں نے نظریں جھکا کے کہا۔ "ہاں"

"کتنی گولیاں ضائع ہو گئیں؟" اُس نے بظاہر سرد مہری سے پوچھا۔

"شاید دو یا تین"

اُس کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ "کتنے بچ نکلے؟"

گن نہیں سکا۔ اندازاً پانچ چھ یا کچھ اور"

اُس نے سکون سے چائے پیالی میں انڈیل لی اور دوسری پیالی بنانے لگا۔ "اب ایک مدت تک تم بھون سے باہر قدم نہیں نکالو گے" اُس نے حکمیہ

لہجے میں کہا۔

"بہتر ہے" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں مہاراجا راجے پور کی جانشینی سے دست برداری کا اعلان کر دوں گا" وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

"ہونہہ" میں نے زہرخند سے کہا۔ "گویا موت دوسرے عنوان سے قبول کی جائے گی"

"وہ زندگی بے کار ہے جس کا یقین نہ ہو"

"زندگی ہمیشہ بے یقین ہوتی ہے"

"یہ باتیں کم از کم مجھے متاثر نہیں کر سکتیں" اُس نے بے دلی سے کہا۔

"اگر آپ نے رات کے خونیں واقعے سے اثر لیا ہے تو یہ ایک رنگین کی بات تھی، ہمیں اس کا پہلے سے اندازہ تھا۔ آپ نے چلتے وقت کسی خطرے کے پیشِ نظر ایک پستول میری جیب میں رکھ دیا تھا۔ ایک پستول پہلے سے میرے پاس تھا۔ ایسی ہی اندیشوں کے لیے یہ ہتھیار ایجاد کیے گئے ہیں حالانکہ خاصے غیر جمالیاتی ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس ہتھیار ہیں، انھیں چلانے کے لیے مضبوط ہاتھ ہیں، نمک خواروں کے لیے نمک کا ذخیرہ موجود ہے۔ سوچنے سمجھنے کے لیے گردن پر سر بھی رکھے ہوئے ہیں بس ایک ذرا سے عزم کی ضرورت پڑتی ہے۔ چھاؤنی سے واپس ہوتے وقت میں پوری طرح محتاط تھا، کسی وقت بھی کہیں سے آفت آ سکتی تھی۔ کوئی بھی خلافِ توقع واقعہ رونما نہیں ہوا۔ وہی ہوا جو ان حالات میں ہونا چاہیے۔ زندگی ایک میدانِ کارزار ہے۔ خارجی اور داخلی عناصر کا توازن قائم ہے تو بقا ہے ورنہ فنا ہے"

وہ زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ "خارجی حالات کی اب کیا صورت ہے

کسی نے دیکھا تو نہیں ہے؟"

"اندھیرا موافق خارجی عنصر ثابت ہوا۔ دن ہوتا تو وہ بھی یہ جرأت کرتے ہوئے دس مرتبہ سوچتے۔ فیصلہ عجلت میں کیا گیا۔ اندھیرے سے انھوں نے فیض حاصل کرنا چاہا، مجھے بھی مدد ملی۔ لیکن کچھ اور چیزیں اُن کے موافق نہیں تھیں، مثلاً انھوں نے اپنے مطلوب کا تخمینہ نہیں لگایا تھا۔"

"کون لوگ ہیں؟"

"کون ہو سکتے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور شروع تا آخر تمام واقعہ اُس کے گوش گزار کر دیا۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ نتیجہ سامنے موجود تھا، میں بقیدِ حیات تھا۔ میری رُوداد سُن کے وہ حیرت کے ساتھ مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اُس سے پریت کا ذکر نہیں کیا کہ وہ مجھے باہر صدر دروازے پر ٹکراتی تھی۔ خدشہ تھا کہ پریت کا ذکر سُن کے کہیں اُس کے تحمل کا ظرف چھلک نہ پڑے۔ وہ فکر میں پڑ گیا کہ آخر کس نے میری مخبری کر دی تھی؟ کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ پروفیسر زاہدی کرنل ہارڈنگ سے ملنے چھاؤنی گیا ہوا ہے۔ میں نے اُسے پُرسکون رہنے کی تلقین کی مگر وہ پریشان ہی رہا۔ آٹھ بجے کے قریب ملاقاتی کمرے کا دروازہ عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا اور میں صوفے سے اٹھ کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ میں پریت کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے قیاس کے مطابق وہ بروقت دنیش کے محل میں نمودار ہوئی۔ میں سوچا اندر کمرے میں چھپ گیا اور کان باہر ہی رہنے دیے۔ دیکھیں، وہ ستم پیشہ کیسے شعر سُناتی ہے۔

"ارے پریت تم؟ لباس بھی تبدیل نہیں کیا، خیریت تو ہے؟" دنیش کی آواز آئی۔

"یہاں بھی اُداسی ہے۔" پریت نے جھرجھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں؟" دنیش نے پوچھا۔ "تمھاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں جیسے رات بھر جاگتی رہی ہو، کیا بات ہے؟"

"طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں واقعی رات بھر جاگتی رہی ہوں۔"

"اب تمھارا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔" دنیش نے شوخی کی۔

"کیسا بندوبست؟" میں اندر کسمسانے لگا۔ شرم کی حالت میں وہ کیسی لگتی ہوگی۔

"ارے کسی کو پکڑ کے لانا پڑے گا۔"

دیر تک اُس کی آواز نہیں آئی، شاید وہ شرما رہی تھی۔ "چائے کا انتظام نہیں ہو سکتا؟ یہاں کوئی ملازم بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ سب کہاں مر گئے؟ موہن داس کہاں گیا؟" پریت نے تلخی سے کہا۔

میں الرٹ ہو گیا ؎ زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا۔ دنیش نے کہا۔

"موہن داس اندر موجود ہے۔"

"اندر؟" پریت نے حیرت سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کی آواز کچھ گھٹ گئی تھی۔ اُسی لمحے دنیش نے مجھے آواز دے کے بُلایا۔ میں ہانپتا ہوا باہر آ گیا۔

"نمسکار دیدی جی!" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ میرے پہنچنے پر اُس کی آنکھوں میں ایک ناقابلِ بیان بے چینی پیدا ہوئی۔ اس کی یہ اضطرابی کیفیت دیکھ کے میری رات کی ساری تھکن دُور ہو گئی۔ "کیا سیوک سے کوئی کام پڑ گیا ہے؟" میں نے خالص ریاستی ملازموں کے لہجے میں کہا۔ "بڑے بھاگیہ کہ آج کماری پریت دیدی نے یاد کیا۔ میں سرکار سے کہہ کے سفارش کروانے ہی والا تھا کہ کماری مجھے کبھی خدمت کا موقع نہیں دیتیں۔ کماری ناراض رہتی ہیں۔"

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ وہ شدید ذہنی کشمکش میں نظر آتی تھی۔ متذبذب، پریشان حال، واقعی اُس کی آنکھیں سُوج رہی تھیں۔ میرا تصوّر بھی کہاں کہاں تک تھا، وہ مجھے بار بار گھور کے دیکھتی تھی اور پہلو بدلنے لگتی تھی۔ اُس وقت بلاشبہ وہ دنیش سے یہ کہہ سکتی تھی کہ اس نے کل رات ایک داڑھی والا شخص دیکھا تھا، وہ کون تھا؟ پہلے تو کبھی یہاں نظر نہیں آیا مگر اُس نے کمال ذہانت کا ثبوت دیا، کوئی لفظ نہیں کہا۔ کم سخنی ویسے بھی بڑی مفید چیز ہوتی ہے۔ آدمی فلسفے کی کتاب معلوم ہوتا ہے۔ میں بڑی باقاعدگی سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی اُڑی اُڑی سی رنگت، بے قراری، شب خوابی کے لباس میں اُس کا نازک سراپا۔ "موہن داس! پریت کی خاطر تواضع کا اہتمام کرو۔" دنیش نے تیکھے پن سے کہا۔

"جناب!" میں نے گردن جھکائی اور گھنٹی بجا کے ایک ملازم کو طلب کیا اور دنیش کا حکم آگے بڑھا دیا کیوں کہ وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پریت کا بدن کا پودا سامنے کھلا ہوا تھا، چھوئی موئی کا پودا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" دنیش نے بانکپن سے کہا۔ "موہن داس نے کچھ کہا ہے پریت! اس کی خطائیں معاف کر دو۔"

"اوہ۔" اُسے جیسے کسی نے کاٹ لیا۔ "موہن داس... " اُس نے اپنی زبان کی لگام تھامی، اس وقفے میں اُسے اپنی برہمی کم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ تندی سے بولی۔ "یہ شخص کیا بک رہا ہے، یعنی... "

"پریت!" دنیش اشتعال میں اُسے مخاطب کر رہا تھا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے اُسے منع کیا۔ اُس کا لہجہ احتجاجی ہو گیا۔ اُس نے انگریزی میں کہا۔ "تم موہن داس کو مِس کر رہی ہو، یہ بہت خدمت گزار آدمی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اُس نے انگریزی کے بجائے ہندوستانی میں حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا تم میرے پاس اس کا تبادلہ کرنے کی سفارش کر رہے ہو؟"

"نہیں۔" دنیش نے بے پروائی سے کہا۔ "چائے بناؤ۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اچھے ملازموں کو پہچاننا ضرور چاہیے، وہ ہمدردانہ نظروں کے لیے ترستے ہیں۔"

پریت کے ہاتھ میں چائے کی پیالی کانپ رہی تھی۔ وہ کم بولنا چاہتی تھی لیکن دنیش کوئی نہ کوئی بات کہہ کے اُسے چڑا دیتا تھا۔ مجھے اُس سے

ہمدردی ہے۔" اُس نے طنز سے کہا اور میری طرف دیکھا شاید اُسے میری آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ پسند نہیں آئی۔

میں نے درمیان میں دخل دیا۔ "سرکار! جان کی امان پاؤں تو ایک بات کہوں؟"

"کہو موہن داس!" دنیش نے فراخ دلی سے کہا۔

"جناب! راج کماری پریت سے زیادہ تیز، ذہین اور بہادر راجکماری پورے بھون میں نہیں ہے۔ انہیں تو کسی راجا کی رانی بننا چاہیے۔ میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے لیکن جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ مجھ سے ناراض رہتی ہیں تو مجھے اپنے دل سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ صاحب! نہ جانے کیوں میرا من کرتا ہے کہ یہ اپنے ہاتھوں سے مجھے سزا دیں، میرا گلا گھونٹ دیں۔"

دنیش اس پر بے ساختہ ہنسنے لگا۔ پریت کا چہرہ تمتما گیا لیکن دنیش کو ہنستے دیکھ کے وہ بھی مسکرا پڑی، پھیکی، زہریلی، جلتی ہوئی، خوف زدہ مسکراہٹ۔

"سنا تم نے، یہ تمہارے لیے اپنے دل میں کیسے جذبات رکھتا ہے۔"

"یقیناً۔" وہ ترشی سے بولی۔ "میں تمہاری سفارش پر اسے سمجھنے کی کوشش کروں گی۔ میں ضرور تلافی کروں گی۔"

دروازے پر کسی کے چھنکنے کی آواز آئی جیسے مکئی کے دانے گرم بالو میں چٹخیں، جیسے بلبل چڑیاں پھڑکیں، جیسے پتنگے اُڑیں، وہ اس طرح سرشار جھومتی گنگناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ الھڑ، بدمست، خود سے بیگانہ سندھیا۔ للا لا للا لا للا لارا۔ تنانا تنی تی تنانا را۔ اُس نے ایک ہاتھ اٹھا کے دونوں کو مستانہ انداز میں سلام کیا اور جب میں اُس کی نظر کے نشانے پر آیا تو اُس کا غنچہ چٹک گیا۔ "اوہ۔ موہن!" اُس نے بے ساختہ مجھے پکارا۔ "شام کو تم کہاں تھے؟"

"یہیں تھا سندھیا جی! میں کہاں جاتا۔ کیسے مجھ سے کچھ کام پڑ گیا؟"

"میں نے تمہیں ہر جگہ تلاش کیا۔" اُس نے بے باکی سے کہا حالانکہ میں نے کل ہی اُسے تلقین کی تھی کہ وہ اپنے اور میرے تعلق کا ذکر کسی سے نہ کرے، شاید اُسے یاد آ گیا۔ وہ تمکنت سے بولی۔ "ہمیں تم سے کام تھا۔ انکل دنیش سے پوچھو، میں تمہیں پوچھتی ہوئی آئی تھی یا نہیں؟"

"سندھیا! ہم نے تمہیں بتایا تھا نا کہ موہن ضروری کام سے گیا ہوا ہے۔" دنیش نے ناگواری سے کہا۔ "تم اپنا کام کسی اور شخص سے کرا لیتیں، یہاں ملازموں کی کمی نہیں ہے۔"

"انکل! سارے ملازم گندے اور حرام خور ہیں۔ موہن ان سب سے اچھا ہے۔" سندھیا نے دنیش کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

اُسے قرار نہیں تھا، بے کل تھی۔ دنیش نے اُس کے بال پکڑ لیے۔ "ہری سندھیا! تمہاری زبان اب تیز چلنے لگی ہے۔ میں تمہیں انگلینڈ بھیج دوں گا، تم وہاں صحیح تربیت پاؤ گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ یہاں کے اور وہاں کے ملازموں میں کیا فرق ہے۔ تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی، اس طرح باتیں نہیں کہتے پیاری بچی!"

اُس نے اپنا سر دنیش کی آغوش میں دے دیا تھا اور وہیں سے مجھے تک رہی تھی۔ شوخی پھوٹی پڑ رہی تھی لیکن میری نظر اس پر زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکی۔ اِدھر پریت بیٹھی تھی۔ ہم دونوں کی پتلیاں بار بار آمنے سامنے ہو جاتی تھیں۔ اُس کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ آج دن میں کسی وقت انگریزی فوج کی گشتی گاڑیاں میجر رابرٹ کی لاش دریافت کر لیں گی۔ اس کے بعد بھی پریت کی حالت دیدنی ہوگی جیسے لال مرچ کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دی جاتی ہے۔ اُس نے تھک کے صوفے سے سر ٹکا لیا تھا اور چھت کے نقش و نگار دیکھ رہی تھی۔ اُس کا بدن کتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اُس کی کھنچی ہوئی گردن کی نسیں اُبھری ہوئی تھیں۔ آدمی کی سوچ پر کس نے قدغن لگائی ہے۔ میں نے تصور میں اس کے سوا بھی اُسے نئے نئے زاویوں سے دیکھا اور سوچا۔

ابھی سندھیا کو آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ پارو ٹھمکتی ہوئی کمرے میں نمودار ہوئی۔ اُس نے پیازی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اُس میں سے اُس کا سراپا جھلک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آج ہی بنی ہے، تر و تازہ، شگفتہ، بالکل نئی۔ پارو پر یہ الزام تھا کہ وہ آں جہانی پرکاش چندر کی آخری رانی تھی، کسی ایسی نئی نئی لڑکی کی شادی نہیں ہوتی اور ہوتی ہے تو وہ اتنی نئی نہیں ہوتی۔ آں جہانی پرکاش چندر نے موت سے پہلے شاید اُسے دیکھنے ہی پر اکتفا کیا تھا، اُس کے صرف نظارے کے لیے شادی کی تھی کیونکہ اُس کے بدن کی ٹہنی بڑی سرسبز تھی۔ وہ جاہ و جلال سے، ایک شانِ دل رُبائی سے اندر داخل ہوئی۔ میرے سینے میں ہلچل سی مچی اور میری گردن تن گئی۔ دنیش، پریت اور سندھیا سے رسمی باتوں کے بعد اُس نے اپنی نگاہ کی کمند مجھ پر پھینکی اور ایک لمحے میں ساری شکایتیں کر ڈالیں۔ میں نے آنکھیں میچ لیں کہ میرے پاس اُن شکایتوں کے باقاعدہ جواز ہیں۔ پھر شکنتلا آگئی، سریش آگیا پھر چندر رانیاں آ گئیں، دیکھتے دیکھتے خاصا اژدہام ہو گیا۔ غالباً جس نے کسی کا دروازہ کھٹکھٹایا، اُسے یہ خبر ملی کہ وہ دنیش کی طرف گیا ہے چنانچہ سب کا رُخ اسی طرف ہو گیا مگر وہ نہیں آیا جسے میری آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ نہ جانے کس عالم میں ہوگی؟ کتابوں میں بیٹھی ہوگی اور گبن کے ساتھ ہوگی یا ملٹن کی اُنگلی پکڑ کے گلستانوں کی سیر کر رہی ہوگی یا مارکس کے ساتھ برٹش میوزیم میں بیٹھی ہوگی یا ڈارون کے ساتھ بیگل پر سفر کر رہی ہوگی، پریاں اُسے ستا رہی ہوں گی یا وہ بھوت سے ڈر رہی ہوگی، اُس کی سیاہ دراز زلفیں، سیاہ زلفیں، رخساروں کے آنگن میں کھیل رہی ہوں گی۔ شاردا وہاں نہیں تھی۔ اس لیے میں دنیش کی خواب گاہ میں چلا آیا، میں اُن سب لوگوں کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا جو مجھ پر مرکوز ہوتی جاتی تھیں۔

میری پشت سرہانے کی جانب تھی اور میں کرسی پر بیٹھا دنیش کے سرہانے رکھے ہوئے انگریزی رسائل کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے جھرجھری آگئی۔ کسی نے میرے کان میں تنکا کیا۔ میں کرسی سمیت گھوم گیا، وہ سندھیا تھی۔

وہ اُن سب لوگوں کے سامنے آگئی تھی۔ "آپ ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ اندر کیسے آگئیں ؟"

"ایسے۔" وہ پھرتی سے دو قدم پیچھے ہٹ کے پھر آگے آگئی مجھے وہ نورجہاں لگی، نورجہاں نے بھی سلیم کو ایسا ہی جواب دیا تھا۔ یہ ادا مجھے کچھ ایسی بھائی کہ بے اختیار میرے دونوں بازو پھیل گئے اور وہ میرے سینے میں اُتر پڑی۔ میں نے اُسے دونوں بازوؤں سے جکڑ لیا اور اُس کی گردن پر اپنے ہونٹوں کی آگ رکھ دی، شاید وہ جل گئی، تڑپنے لگی اور مجھے بر وقت کسی نے اندر سے ٹھوکا مارا۔ میں نے اُسے فوراً آزاد کر دیا۔

"جائیے۔" میں نے گھبراہٹ میں کہا۔ "کوئی بھی اندر آسکتا ہے۔"

"آنے دو۔" وہ سرکشی سے بولی۔

"پھر میں مر جاؤں گا، آپ کا کچھ نہیں ہوگا۔"

"میں بھی مر جاؤں گی۔"

"اِس وقت آپ چلی جائیے۔" میں نے منّت کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں باہر۔۔۔"

"رات کو فون کرو گے نا ؟ جب میں ہاں کہہ دوں، چلے آنا۔"

"فون کسی اور نے اٹھایا تو۔۔۔؟"

"میں اُسے اپنے قریب ہی رکھ لوں گی۔"

"گھنٹی کی آواز سے کوئی جاگ گیا تو ؟"

اُس کا چہرہ بجھ گیا۔ "ہمارے لیے بڑی مشکلیں ہیں۔"

ایک بار پھر میرے ہاتھ اُسے آغوش میں لینے کے لیے مچلے لیکن دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ رات کو سونے سے پہلے اس طرف آئے میں کوئی تدبیر سوچ کے رکھوں گا۔ اگر میں یہ نہ کہتا تو سوال و جواب میں نہ جانے کتنی دیر لگ جاتی۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا، دروازے پر آہٹ ہوئی، میں سنبھل کے دور جا کھڑا ہوا، پاروہ تیزی سے اندر آئی تھی سندھیا کو دیکھ کے وہ ٹھٹک گئی، اُس کے لب مرتعش ہوئے، وہ واپس ہونا چاہتی تھی کچھ سوچ کے ٹھہر گئی۔ مجھے اُس کے اضطراب کا حال معلوم تھا۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی ہو گی۔ اصولاً سندھیا کو اب یہاں سے چلا جانا چاہیے تھا۔ میں گومگو کی حالت میں کھڑا تھا کہ اُس سے کیا کہوں کیا نہ کہوں ؟ رات کو نہ آنے کا عذر کس طرح بیان کروں ؟ کیا بتا دوں کہ رات کو تو میں مر گیا تھا۔ آج میرا نیا جنم ہے۔ سندھیا بہت تیز لڑکی تھی سکھاں کہاں نہ رُسوا کرے گی۔ وہ آپس میں گفتگو کرنے لگیں میں چپکے سے باہر جانے لگا، مجھے یہی ایک بات مناسب نظر آئی لیکن پاروکی آواز نے میرے قدم روک لیے۔

"بھون سے باہر جاؤ تو مجھے اطلاع دے کے جانا۔" اُس نے سختی سے کہا۔

"آج موسم خراب ہے۔" میں نے جرأت کی۔ "گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں شاید بارش ہو۔ رات بھی بجلی چمک رہی تھی اور گھن گرج ہو رہی تھی، میں رات راج کما کے کام سے گیا تھا راستے میں پھنس گیا۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے رانی صاحبہ آج میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

اُس نے میرا بیان نظر انداز کر دیا اور سندھیا سے باتیں کرنے لگی میں باہر آیا تو وہاں پر کاشی بھون کی آدھی آبادی جمع تھی۔ پریت اُن میں نہیں تھی۔ میں اُس ہجوم سے گزرتا ہوا راہ داری میں آگیا۔ شاردا اپنے محل میں نہیں تھی۔ مالتی نے بتایا کہ وہ لائبریری میں بیٹھی ہے۔ میں لائبریری کی طرف نکل گیا وہ ایک موٹی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھی۔ وہاں تنہائی نہیں تھی مگر مجھے تو اُسے بس دیکھنا تھا۔ اُس نے کنگھی کر کے بال کھلے چھوڑ دیے تھے۔ میں ان سیاہ بالوں کے مُرقع میں اُس کا بے نقاب چہرہ دیکھتا رہا اور آنکھوں میں سُرمہ لگا کے چلا آیا، پھر میں اپنے کوارٹر میں آکے دراز ہو گیا۔ ڈالی موجود نہیں تھی۔ تنہائی آوارہ خیالوں کا نشیب ہوتی ہے۔ میں نے کمر ٹکائی ہی تھی کہ خیالات بہنے اور اودھم مچانے لگے۔ میری آنکھ لگ گئی لیکن خیالوں کو جسم کی نیند سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اور سرشور ہو جاتے ہیں۔ سارا میدان صاف ملتا ہے، چوکیدار سو جائے تو یہی ہوتا ہے۔

دوپہر کے وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میری آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر پرنام کرتا ہوا پنڈت اشوری لال موجود تھا۔ میں نے اُسے اندر بُلا لیا۔ "آج مہاراج استھان پر ہی مل گئے۔" وہ ریشہ خطمی ہو کے بولا اور میرے چرن چھو لیے۔

"کیا ارادہ ہے اشوری لال ؟" میں نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"جو مہاراج کا ارادہ ہو، سیوک تو تیار بیٹھا ہے۔"

"اب یہاں سے جی اُکتا گیا ہے کہاں چلو گے ؟"

"ایک دن ایسا ہی ہونا تھا۔" پنڈت نے اشتیاق سے کہا۔ "ویسے تو دیوی کو جو استھان بھاتے پر ہمالیا کی طرف زیادہ شانتی ہوگی۔"

مجھے پنڈت کے غیر معمولی اشتیاق سے تجسس پیدا ہوا، سادھو پورن اور پنڈت دونوں مجھے بھون سے نکلنے اور ویرانوں میں چلنے کی تلقین بار بار کرتے رہتے تھے اور میں نے کبھی اُن سے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کیوں ایسا کہتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ میں کچھ کے بارے میں اپنی کم علمی کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ کی وجہ سے وہ مجھ پر مہربان تھے، یہ اور بات ہے کہ خود مجھے کچھ کے اسرار کا علم نہیں تھا۔ اشوری لال اور سادھو کی سنجیدگی بے سبب نہیں ہوسکتی تھی۔ "کچھ اور کام نمٹانے رہ گئے ہیں پنڈت !" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"سنسار کے کام کبھی ختم نہیں ہوتے اور دیوی کی آشا سے بڑا کون سا کام ہے سمے پر نہ پہنچے تو دیوی ناراض ہو جائے گی۔" وہ ایسے دبے دبے لفظوں میں بولا جیسے میری شانِ والا صفات میں گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

"نہیں پنڈت اشوری لال ! دیوی کیوں ناراض ہوگی۔ تمام کام نمٹا کے چلیں گے تو من شانت رہے گا۔"

"تم بڑے بھاگیہ والے ہو مہاراج ! میری اتنی بنتی ہے کہ مجھے بھول

نہ جانا۔ تمھارے چرنوں میں رہوں گا تو جیون سپھل ہو جائے گا۔"

"ہاں ایشوری لال! تم سے اچھا سیوک کہاں ملے گا۔"

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں مہاراج! میں نے تمھیں پہچاننے میں کتنی دیر کر دی۔ میں نے تمھیں دکھ دیے اور تم نے مجھے شما کر دیا۔ میرے ہردے میں اب بھی یہ کانٹا چبھا ہوا ہے کہ میری طرف سے تمھارا من پوری طرح صاف ہوا ہے یا نہیں؟" وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔

"تم نے مجھے کب پہچانا؟" میں نے دل چسپی سے پوچھا۔

"جانے دیجیے مہاراج! پچھلی باتیں دہرانے سے کیا ہوگا۔" وہ ندامت سے بولا۔ "میں بڑا ابھاگی تھا، میں سمجھا کہ وہ کوئی معمولی کالی شکتی ہوگی جو تمھارے ساتھ ہے، پھر مجھے پتہ چلا کہ وہ تو دیوی ہے جس کی شکتی اونچی ہے، میرے من میں پاپ آیا اور مجھے تم سے بیر ہو گیا۔ میں یہاں بیٹھ کے اور آسن جما کے دیوی کو راضی کرنا چاہتا تھا لیکن یہی مجھ سے بھول ہو گئی۔ دیوی نے پہلے ہی تمھیں چن لیا تھا۔"

میرے ذہن میں بہت سے سوال آئے۔ وہ سب ابتدائی نوعیت کے سوال تھے۔ مثلاً دیوی کون ہے؟ اس کی شکتی کیا ہے؟ وہ کیا چاہتی ہے؟ ہمالیا کی پہاڑیوں میں جانے سے کیا فرق واقع ہوگا؟ میں اتنا کم عقل نہیں تھا کہ سادھو دیو راج اور پنڈت ایشوری لال کی غیر متوقع نوازشوں سے کچھ نہ سمجھ سکتا۔ کوئی بات ضرور تھی، کوئی انوکھی بات۔ کیسے کیسے مشکل موقعوں پر نمودار ہوئی تھی۔ عقل نے کیسی غیر عقلی باتوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ میں نے پنڈت کی کمر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اس اثنا میں ڈالی بھی آگئی اور پنڈت کو گھر میں دیکھ کے اس کی تیوری چڑھ گئی۔ اس نے رسمی انداز میں پنڈت کو سلام کیا، جس کا جواب پنڈت نے بہت تپاک سے دیا۔ لیلا کی گنیا بھی بڑی شے ہوتی ہے۔ کیتا ڈالی آگئی تھی۔ میں اس کے غرانے اور بھونکنے کا منتظر تھا، اپنا پلا صحن میں چھوڑ کے وہ باورچی خانے چلی گئی۔ گدگدا کھل کھلاتا ہوا میری سمت تیزی سے بڑھنے لگا اور مجھ پر سوار ہو گیا۔

"پھر کب کا ارادہ ہے مہاراج؟" پنڈت نے چپکے سے پوچھا۔

"سمے نہیں آیا ہے پنڈت! انتظار کرو اور مجھ سے ملتے رہو۔"

"اگر تم حکم کرو تو میں یہیں ڈیرا ڈال دوں؟ یہاں یا کوارٹر کے باہر پیپل کے نیچے استھان جما لوں؟"

"نہیں، تم مندر ہی میں رہو۔" میں نے حکماً کہا۔ "اب جاؤ۔"

"جیسی آپ کی اچھا مہاراج!" پنڈت نے اٹھ کر پھر سے میرے پیر پکڑ لیے۔ ڈالی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

ڈالی نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی البتہ مجھے خوب جی بھر کے کھانا کھلایا، وہ شاید اس انتظار میں رہتی تھی کہ میں اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤں۔ میں سامنے بیٹھا رہوں اور وہ توے پہ روٹیاں ڈالتی رہے۔ میں نے

کراچی ایئرپورٹ
سے رمیش چندر

ایک

آدمی بھوکا پیاسا ایک ہوٹل میں داخل ہو کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

بیرا ادب سے اس کے پاس آیا۔ "کیا لاؤں سر؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "ایک بوتل شراب لاؤ۔"

بیرا شراب لے آیا۔ اس شخص نے شراب غٹاغٹ پی لی۔ بیرا پھر بہت ادب سے اس شخص کے پاس پہنچا۔ "اب کیا لاؤں سر؟"

اس شخص نے کہا۔ "اب کھانا لاؤ۔ سنو کھانے میں قیمہ، مرغی اور پلاؤ لانا۔"

بیرے نے تعمیل کی۔ اس شخص نے اطمینان سے سب کچھ کھایا، ایک گلاس پانی پیا، اور ڈکار لے کر کرسی پر ٹیک لگا لی۔ بیرا پھر آیا۔ اس شخص نے کہا۔ "اب چائے لاؤ۔"

چائے بھی آگئی۔ پھر اس شخص نے کہا۔ "اب پان لاؤ۔"

پان بھی آگیا۔ بیرے نے پوچھا۔ "سر! اب کیا لاؤں؟"

اس شخص نے پان چباتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "اب پولیس کو لاؤ۔"

یہ بات محسوس کی تھی کہ وہ کھانے کے دوران میں میرا منہ چلتا ہوا دیکھ کے خوش ہوتی تھی اور میں اسے چولھے کے قریب دیکھ کے خوش ہوتا تھا۔ چولھا عورت کا وجود مکمل کر دیتا ہے ورنہ عورت خالی خالی آدھی آدھی سی محسوس ہوتی ہے۔ چولھے کی گرمی سے رخساروں پر پسینے کے جو قطرے ابھرتے ہیں وہ موتی سے لگتے ہیں۔ چولھے کے قریب بیٹھ کے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ میرا خیال ہے ایسا کھانا جلد ہضم ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں دباؤ نہیں ہوتا۔ ادھر ادھر کے دباؤ کیا کم ہوتے ہیں زندگی میں۔ آدمی جتنا شامل ہوتا جاتا ہے دباؤ بڑھتے جاتے ہیں اور یہی زندگی ہے۔

میں نے چپ چاپ وہاں سے نکل جانے میں عافیت سمجھی۔ ایسے عالم میں جب رات راجے پور میں گزشتہ رات نو دس قتل ہو گئے ہوں اور انگریز افسر میجر رابرٹ پُراسرار طور پر غائب ہو گیا ہو، مجھے گھر میں بیٹھ کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر لاشیں سڑک سے نہ اٹھائی گئی ہوں گی تو راجے پور کی پولیس کا کھانا پینا اور سونا جاگنا حرام ہو گیا ہوگا اور آئی جی مہتا صاحب کو ایک بار پھر میرے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ جتنا سوچتا تھا پیچیدگیاں ہی پیچیدگیاں نظر آتی تھیں۔ اس لیے میں نے سوچنا کم کر دیا۔ میں نے رتنا، پارو، شاردا اور پریت کے حسن و جمال اور خد و خال پر شاعری شروع کر دی۔ بہت سے شعر لفظوں میں منتقل نہیں ہوتے۔ اکیلا آدمی اپنے اندر کہتا سنتا اور سر دھنتا رہتا ہے مگر دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب عالم تاب شباب پر تھا اور یہ وقت شعر و شاعری کے لیے موزوں نہیں تھا۔ پھول بھی ایسے وقت پر جھلس جاتے ہیں، بارش کے بعد جب سورج نکلتا ہے تو انتقام لیتا نظر آتا ہے، دمیش کے پاس سے بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ اس نے کمرہ بند کر دیا اور سیکرٹری کو ہدایت کر کے مجھے خواب گاہ میں لے گیا، وہ کچھ پریشان معلوم

ہوتا تھا۔" موہن!" اُس نے منتشر لہجے میں کہا۔ "ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ راجے پور کی ہر سڑک پر انگریزی فوج کی گاڑیاں گشت کر رہی ہیں۔"

"کیا لاشیں دریافت کر لی گئیں؟" میں نے اطمینان سے پوچھا۔

"معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے ایک پولیس افسر کو فون کیا تھا۔ وہ ہمارے خاندان کا قدیم نمک خوار ہے۔ اُس نے اشاروں میں بتایا کہ میجر رابرٹ گم شدہ ہے۔"

"اور لاشوں کا کوئی ذکر نہیں کیا اُس نے؟"

"نہیں۔ اُس نے کچھ اور نہیں بتایا۔" وہ وحشت میں بولا۔

"تو پھر آرام کیجیے۔ اصل مسئلہ لاشوں کا تھا۔ اگر اُن میں سے ایک آدمی بھی پہچان لیا جاتا تو جگ دیپ کے بہت سے لوگوں کو پریشان ہونا پڑتا۔ اِدھر میں گرفتار کر لیا جاتا لیکن جگ دیپ بابو بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ اُنھوں نے میرے ساتھ بھی سلوک کیا، خود بھی محفوظ رہے، یار زندہ صحبت باقی۔ آپ مطمئن رہیے۔ یہ پتہ نہیں چلے گا کہ مقتول کبھی پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں۔ اِسے راجے پور کی پہاڑیوں کے قبائل کا باہمی جھگڑا سمجھا جائے گا ویسے بھی یہ ایک ناممکن بات ہے کہ صرف ایک طرف کی لاشیں گری ہوں۔ یہ تو صریحاً آپس کا فساد ہے اور انگریز کو ہندوستانیوں کی لاشوں سے اتنی دل چسپی کیوں ہونے لگی۔ ان کی تعداد جتنی کم ہوگی، انگریزوں کے لیے مسرت کا سبب بنے گی۔ وہ تو ہندوستان میں کوئی ہندوستانی دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"تمھارا تجزیہ قرینِ قیاس ہے مگر یہ رابرٹ کہاں غائب ہو گیا؟" اُس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا، "رات بھی اس کے سلسلے میں فون آیا تھا۔ تم اس بات کو کوئی اہمیت کیوں نہیں دے رہے ہو؟"

"اس خبر سے تشویش مہاراجا اور راج کمار جگ دیپ کو ہونی چاہیے۔ مہاراجا کے نظم و نسق پر داغ آیا اور جگ دیپ کا ایک دوست لاپتہ ہو گیا۔ آپ کیوں پریشان بیٹھے ہیں؟"

"اگر میجر کو کوئی حادثہ پیش آگیا تو یہ ریاست کے لیے ایک لرزہ خیز بات ہو گی۔" دنیش نے میری صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے مگر ریاست جوں کی توں قائم رہے گی۔ شک ہم پر بھی کیا جائے گا، ممکن ہے بعد میں ہمارے حق میں مفید نتائج برآمد ہوں کیونکہ یہ بے بنیاد شک ہوگا۔"

"تم بہت —— بہت وثوق سے باتیں کر رہے ہو۔" دنیش نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"شدید خواہشوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

میں نے میجر کی گم شدگی پر دنیش سے غیر محتاط تبصرہ کیا تھا۔ فون کی گھنٹی بروقت بجی۔ دنیش نے جلدی سے ریسیور اٹھایا اور نہایت توجہ سے مخاطب ہوا مگر پھر اس کے چہرے پر شادمانی بکھر گئی۔ میں سمجھا تھا کہ راج کماری کنول ہے مگر وہ ریتا تھی۔ دنیش نے اُس سے شکایت کی کہ اُس نے آنے کا وعدہ کیا تھا، اب تک کیوں نہیں آئی؟ وہ اُس سے رسمی شگفتہ باتیں کرتا رہا۔ پھر اچانک کرسی سے اچھل پڑا۔ "موہن داس؟" اُس نے حیرت سے دہرایا۔ "وہ.... موہن داس؟ چند لمحے ٹھہریے۔" اُس نے مجھے گھور کے دیکھا اور ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "وہ تمھارا نام لے رہی ہے۔"

"لائیے فون مجھے دیجیے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ دنیش پر ایسی حیرت کبھی طاری نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے ریسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ "او ہیلو ریتا!" میں نے شائستہ انگریزی میں اُسے مخاطب کیا۔ "تم کیسی ہو؟"

"مجھے رات بھر فکر رہی، تم خیریت سے تو پہنچ گئے تھے؟"

"ہاں، یہ ایک خوب صورت سفر تھا۔ تم کب آ رہی ہو؟ بس اب آ جاؤ؟ سنورات کی باتیں یاد ہیں نا؟"

"میں انھیں کبھی نہیں بھول سکتی۔" اُس نے عزم سے کہا۔

"یہاں آؤ تو پروگرام بنائیں۔ تم نے کرنل سے اجازت لے لی ہو گی اور ہاں کرنل کا کیا حال ہے؟ میرا خیال ہے رات میرے اور اُن کے درمیان ایک دلچسپ مناظرہ ہوا تھا۔"

"ڈیڈی تم سے بہت متاثر ہیں، اُنھوں نے مجھے اجازت دے دی ہے۔"

"تو کب آ رہی ہو تم؟"

"شام تک سرِ شام آ جاؤں گی۔" اُس کے لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

دنیش چندر کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ میں اُس کے سامنے رواں اور پختہ انگریزی میں ریتا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ مجھے تیز اور وحشت زدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے ریتا سے پوچھا۔ "مسٹر میجر رابرٹ کا کیا ہوا؟ کیا واپس آگیا؟"

"پتہ نہیں، ڈیڈی ابھی ابھی کسی سے فون پر کہہ رہے تھے کہ اُسے ہائی کمان نے اچانک طلب کر لیا ہے، مجھے ان باتوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔" وہ اکتاہٹ سے بولی۔

"تو ہم بے چینی سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ظاہر ہے مجھ میں دنیش سے نظریں ملانے کی جرأت نہیں تھی۔

چند لمحوں تک کمرے میں بھیانک سناٹا طاری رہا۔ پھر دنیش چندر کی گلوگیر آواز آئی۔ "شرما کیوں رہے ہو؟" وہ میرے قریب آگیا تھا۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کے اُٹھایا اور بے تحاشا گلے سے لگا لیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے گریجویشن کی ڈگری آج ملی ہے۔ وہ مجھے گلے سے لگاتے کمرے میں ناچنے لگا۔ پھر تھک کر مسہری پر گر گیا۔ "تم نے بہت ستایا ہے موہن! میں تمھیں شوٹ کر دوں گا۔" میں سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ "تم نے خود کو اس قدر کیوں چھپایا؟ اوہ تم کتنی اچھی انگریزی بول رہے تھے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔" وہ شدید جذباتی لہجے میں کہہ رہا

تھا۔" اور۔ اور یہ سب تمھیں تمھارے مُنہ پر گالیاں دیتے رہے اور تم سنتے رہے تم کیا بلا ہو موہن؟ تم تو مجھے تباہ کر دو گے۔"

"میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ شرمندہ ہو رہے ہیں یا شرمندہ کر رہے ہیں۔ کرنل کی لڑکی ہم سے زیادہ تیز نکلی، جو ہم نہیں جان سکے، وہ اس نے جان لیا۔"

"اس کے سوا اور کیا صورت تھی، وہ یہاں آ رہی ہے اور اسے یہاں آنا چاہیے۔ میں نے کل رات اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب ہم اطمینان سے اس کی مہمان نوازی کر سکیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم سے آپ کب تک دُور رہیں گے؟"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" میری آواز بھرّا گئی۔

"موہن!" اُس نے والہانہ انداز میں مجھے پکارا۔ "سب پردے اُٹھا دو موہن۔ بعض اوقات بہت دوری، بہت اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔"

"اب کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ بس آنکھوں کا حجاب رہ گیا ہے۔"

وہ بھرا اداس سا ہو کے آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ جی میں آیا، اب سب کچھ اُسے صاف صاف بتا دوں کہ میرا اصل نام کیا ہے۔ میں کون ہوں اور یہاں دیواروں میں چھپنے کیوں آیا تھا۔ "وہ پردے رہنے دیجیے دنیش بابو! جن سے کسی کی پردہ پوشی ہوتی ہو اور آپ کے لیے وہ بے ضرر بھی ہوں۔ میں تو آپ کو ان پردوں کے اندر سے بھی نظر آ رہا ہوں۔" میں نے اُس کا ہاتھ کھینچ کر اُسے اُٹھایا۔ "اب آیئے اُٹھیے۔ ریتا کی مہمان نوازی کے احکام صادر کیجیے اور میرے چند مشورے بھی دل پر نقش کر لیجیے، خیال رہے آقا زادی آ رہی ہے۔ غلاموں کو سر اعتبار سے مستعد اور چاق و چوبند ہو جانا چاہیے۔ اُن کی خوشی میں ہماری خوشی، اُن کی رضا میں ہماری رضا ہے۔ ملکہ برطانیہ کی مہمان نوازی کا اعزاز حاصل ہے۔"

"میرا اعزاز تو تُو ہے موہن! اب مجھے خوف رہنے لگا ہے کہ مجھ سے یہ اعزاز چھن نہ جائے۔" اُس نے میرے کاندھوں پر ہاتھ ڈال کے کہا۔ "میں تجھے تہہ خانے میں بند کر دوں گا یا تیرے لیے ایک پنجرا بنوا دوں گا۔ کاش تو لڑکی ہوتا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ میری آپ سے شادی ہو چکی ہے۔"

بظاہر یہ لفظ شاعری نظر آتے ہیں مگر اُس شاعری میں اثر نہیں ہوتا جسے سینے کی تپش سے سینکا نہ گیا ہو جس کے آمیزے میں خون کے چھینٹے نہ ڈالے گئے ہوں۔ لفظوں کا ایک چہرہ ہوتا ہے اور چہرے پر سب کچھ نظر آ جاتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ؟ میں دنیش چندر سے بہت کچھ چھپا رہا تھا مگر میرا چہرہ بھی تو سلگ رہا تھا۔ وہ جب میری آنکھیں دیکھتا تھا تو اپنے تمام مطالبے، اپنے تمام سوال واپس لے لیتا تھا۔

عزت مآب کرنل ہارڈنگ کی لڑکی کے لیے دنیش کے برابر والے خصوصی مہمانوں کے کمرے مختص کر دیے گئے، ملازموں اور باندیوں کی ایک فوج وہاں تعینات کر دی گئی۔ آناً فاناً بھون میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ آفیسرانِ کمانڈ کی دخترِ نیک اختر جلوہ افروز ہو رہی ہے۔ میرے مشورے پر پارو کو ریتا کے پروٹوکول کا انچارج بنایا گیا۔ بھون کے پُرانے ملازموں کو بلا کے رقص گاہ، طرب گاہ، میوزیم، لائبریری، ریس کے میدان، اصطبل، ہاتھی خانے اور باغ کی صفائی کا حکم دیا گیا، حوض کا پانی بدلنے کا بھی حکم صادر ہوا اور راجے پور کے نواح سے بازی گر، جوگی، سازندے، طوائفیں اور بھانڈ طلب کر لیے گئے، باورچیوں کو اعلا قسم کی پکوان بنانے کی ہدایت کی گئی، شام تک دنیش حکم پر حکم دیتا رہا۔ حکم دیتا ہوا آدمی کتنا بڑا لگتا ہے، زندگی میں کامیاب آدمی کی ایک ہی نشانی ہے کہ وہ کتنے زیادہ حکم دینے پر قادر ہے۔

شام کو بھون میں ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ ریتا کا جلوس شان و شوکت سے بھون میں داخل ہوا، وہ ایک بڑی سیاہ گاڑی میں رونق افروز تھی۔ پیچھے دو گاڑیاں اُس کی نگراں تھیں۔ ایک باڈی گارڈ دستہ، اینگلو انڈین گورنس، باقی گاڑیاں رخصت ہو گئیں۔ راج کمار اور اُس کی بہنوں اور رانیوں نے ریتا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہندوستانیوں کی یہی باتیں تو انگریزوں کو بہت مرغوب تھیں، ہندوستانی ہر فرنگی کو بادشاہ اور ہر فرنگن کو ملکہ سمجھتے تھے۔ ایک طرف پارو، دوسری طرف دنیش، دائیں بائیں بہت سی رانیاں، شاردا اُن میں سب سے پیچھے تھی اور سریتا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب نے رنگ برنگے لباس پہن رکھے تھے۔ بدن کے رنگ کیا کم تھے کہ لباس کے رنگوں نے دھوم مچا دی۔ ریتا بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، ملاقاتی کمرے میں دنیش نے سب سے اُس کا تعارف کرایا۔ میں دور کھڑا ہوا یہ عبرت ناک نظارہ کر رہا تھا۔ آخر ریتا کی آوارہ نظر مجھ پر آ پڑی۔ میں نے ادب سے گردن خم کر دی، میں اُس کا تاثر نہیں دیکھ سکا۔

کرنل ہارڈنگ نے اپنی لڑکی ریتا کو نازک وقت میں دنیش کے ہاں بطورِ مہمان آنے کی منظوری دے دی تھی اور میجر رابرٹ کی گم شدگی کا عذر تراش لیا تھا۔ اس سے کرنل کی فراست کا اظہار ہوتا تھا، وہ ریاست کے عوام کو یہ تاثر دینا نہیں چاہتا تھا کہ اب انگریز آسانی سے غائب کیے جا سکتے ہیں، اقتدار کا پہلا نکتہ برداشت ہے، زندگی کے اقتدار کا بھی یہی نکتہ ہے۔ یہ بات ابھی تک لاینحل تھی کہ انگریز کھوجی میجر کی لاش دریافت کرنے میں کامیاب ہوتے یا نہیں؟ یا یوں ہی حفظِ ماتقدّم کے طور پر کرنل نے میجر کی گم شدگی کو دوسرا رنگ دے دیا؟ بہر حال کچھ بھی ہو، مجھے راج کمار جگ دیپ کا خیال آ رہا تھا، باپ سے محرومی، پیاری جانی پرشوتم سے جدائی، راست دس جاں نثاروں سے اتنی انقطاع، میجر رابرٹ جیسے دوست کا روٹھ جانا اور اب پرکاش بھون میں ریتا کی آمد۔ ان صدموں سے اُسے جاں بر تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ انگلستان سے تازہ وارد اُس کی بہن انیتا

بھی بطور مہمان پرکاش بھون میں جلوہ فرما ہو چکی ہے اُسے دوبارہ دیکھنے کو ویسے بھی طبیعت چاہ رہی تھی، رات تک نہ جانے کیا کیا ہنگامے ہوتے رہے غسل تپنے کی طویل نیند سج گئی۔ شاردا نے آنکھوں آنکھوں میں مجھ سے درخواست کی کہ میں وہاں سے دفع ہو جاؤں کیونکہ میری موجودگی میں کھانا اُس کے حلق سے نہیں اُترے گا۔ میں نے دنیش کے اُس کمرے میں پناہ لی جہاں کی دیواریں میرے بہت سے مناظر کی شاہد تھیں۔

مجھے پروگرام معلوم تھا۔ کھانے کے بعد بڑے ہال میں نغمہ و سرود کی محفل سجنے والی تھی ہم نے ترنّم کو جان بوجھ کر اُس میں شامل نہیں کیا تھا۔ یہ شب راجے پور کی مشہور طوائفوں کے گلے کی نمائش کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ گانا شروع ہو چکا ہوگا لیکن اِدھر میں تنہا اس وسیع و عریض کمرے میں پڑا ہوا تھا کہ دنیش نے آکے مجھے اُٹھایا اور اصرار کر کے محفل میں لے گیا۔ مجھے یہ دیکھ کے حیرت ہوئی کہ اُن میں سے ایک حسین و جمیل لڑکی میری شناسا نکل آئی۔ حسین چہرے آسانی سے کوئی نہیں بھولتا، یاد کیا تو یاد آیا کہ وہ راگنی ہے جسے ایک بار میں نے راجے پور کے بازارِ حُسن میں دیکھا تھا۔ اُسی نے میری شناخت کر کے پہلے کچھ دیر آنکھیں پٹ پٹائیں پھر بڑے ناز سے سلام کیا۔ اُس کا یہ غمزہ اتنا برملا رہا اور واضح تھا کہ میں سب کی نگاہوں کا ہدف بن گیا اور وہیں زمین میں دھنس گیا جہاں کھڑا تھا۔ نشست فرشی تھی اور ہجوم کم نہیں تھا۔ میں نے پریت کو تلاش کیا۔ اُس نے شاید رات کے واقعے اور سجر کے سانحے سے اتنا گہرا تاثر لیا تھا کہ رتیا کی پذیرائی کے لیے بھی نہیں آئی۔ پریت اُداس ہو کے اور دل کش ہو جاتی تھی۔ گویہاں بڑی نادرِ روزگار حسین دوشیزاؤں کا اجتماع تھا لیکن میرا دل پریت کو دیکھنے کے لیے تڑپنے لگا۔ دنیش دور بیٹھا تھا اور میں خالی ہاتھ پریت کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ دنیش کے پاس سب کے آگے جا کے اُس کے کان میں کچھ کہنا آدابِ محفل کے خلاف تھا۔ نہ جانے کیسے سندھیا کھسکتی ہوئی جوتیوں کے قریب آگئی۔ اُدھر مغنیّہ نے راگ چھیڑا، اِدھر اُس نے چپکے سے کہا۔ "چلو۔ سب لوگ یہاں موجود ہیں۔ میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں اور دروازہ کھلا رکھتی ہوں یا جہاں تم کہو۔ تھوڑی دیر میں تم آجانا۔"

"میری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔" میں نے خوف سے جواب دیا۔

"دھت تم کیسے آدمی ہو۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں، یہ گانا تو تم روز سن سکتے ہو۔ ایسا موقع پھر کب آئے گا۔"

"آپ یہاں بیٹھیے۔ میں باہر کا جائزہ لے کے آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں وہاں سے اُٹھ کے لہراتا ہوا عمارتوں کے درمیان سے گزرنے لگا اور میرے پیر اپنے آپ پریت کی جانب بڑھنے لگے۔ جیب میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی، دونوں خالی پستول صبح دنیش نے جیب سے نکال لیے تھے۔ پریت کی قیام گاہ کی کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ جب سے بلیارانی کا قتل ہوا تھا، یہاں خاصی احتیاط کی جانے لگی تھی، میں ایک آڑ سے محلِ وقوع کا جائزہ لیتا رہا۔ خون ایک آتشِ سیال تھا جو رگوں میں گرج اور دھمک رہا تھا۔ اردگرد سناٹا تھا۔ جن دربانوں اور محافظوں نے مجھے دیکھا، میں نے انھیں چوکس رہنے کا مشورہ دیا جیسے میں حفاظتی اقدام کے معائنے کے لیے نکلا ہوں۔ سب جانتے تھے کہ راج کمار کی نظروں میں میری کیا حیثیت ہے۔ میں چلتا ہوا دوبارہ موسیقی کی بزم میں پہنچ گیا۔ سندھیا اب کھسکتے کھسکتے دروازے پر آگئی تھی۔ میں نے مایوسی کے اظہار میں اپنے کاندھے اور ہونٹ سکیڑ لیے۔ وہ تلملا گئی۔ "ہر جگہ پہرا ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "تمام دربان جاگ رہے ہیں۔"

مجھے احساس تھا کہ اس محفل کے اختتام کے بعد میری مصروفیت کس قدر بڑھ جائے گی، جب سے رتیا آئی تھی، آنکھوں آنکھوں میں بات ہوتی تھی۔ دل پر عجیب بے چینی سی طاری تھی۔ مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ جیسے ہی سندھیا کی توجہ کسی اور جانب مبذول ہوئی، میں وہیں سے اُٹھ گیا اور ہال کے باہر اندھیرے صحن میں آکے ستارے تکتا رہا، یہاں بھی اندر کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں کچھ اور دُور چلا گیا اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ کسی دل کش آواز نے اندھیرے میں آہستہ سے مجھے پکارا۔ "سنو۔"

میرے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ کون ہو سکتا ہے؟ میں نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ اندھیرے میں اُس کی شکل صاف نظر نہیں آئی البتہ اُس کے لباس کی سرسراہٹ اور خوشبو سے کسی بھی حسین ترین لڑکی کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ "کون؟" میں نے اپنی جگہ ٹھہر کے پوچھا۔

وہ اور قریب آگئی، جب میں نے اُسے شناخت کیا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ انیتا تھی، جگ دیپ کی بہن اور اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول موجود تھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اُس نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

امربیل

ایک نوجوان کی زندگی کے
عجیب و غریب واقعات
میر جمشید عالم کی آپ بیتی
فرض کیجیے ایسے واقعات آپ کے ساتھ
پیش آئے

دانشمندی کا تقاضہ
سینفورائزڈ
کپڑا تیار کیجئے

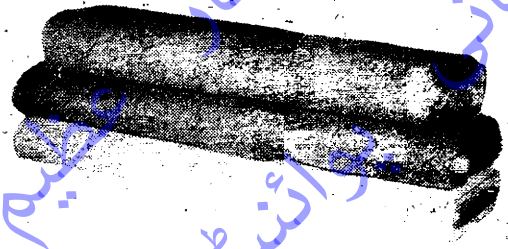

کپڑا تیار کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا فروخت کرنا۔ لیکن سینفورائزڈ کے لیبل کے ساتھ کپڑا ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ کپڑا کبھی نہیں سکڑتا۔ بازار میں آنے سے پہلے اسے سُکڑنے کے اعلیٰ ترین معیار پر جانچا جاتا ہے۔ سینفورائزڈ کا مشہور زمانہ ٹریڈ مارک ساری دنیا میں جانا پہچانا ہے۔ اس لئے دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ سینفورائزڈ کپڑا تیار کر کے باہر بھیجا جائے اس طرح نہ صرف آپ کے ملک کا نام روشن ہوگا بلکہ آپ ملک وقوم کے لئے قیمتی زرمبادلہ بھی حاصل کرسکیں گے۔

•SANFORIZED•

جاری کردہ :۔ کلیوٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داریوں کے ساتھ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رجسٹر شدہ) مالکان رجسٹرڈ ٹریڈ مارک سینفورائزڈ۔
مالکان صرف ان کپڑوں پر اس ٹریڈ مارک کے استعمال کی اجازت دیتے ہیں جو سکڑنے سے محفوظ ہونے کی کڑی جانچ پڑتال پر پورے اترتے ہیں۔

خاص کہانی کے یہ صفحات پڑھتے وقت آپ اپنا ذہن آمادہ کر لیں کہ آپ کوئی بہت ہی مختلف منفرد اور علیحدہ سی تحریر پڑھنے والے ہیں، میرے چچا ابوالفضل صدیقی مجھ پر بہت شفقت فرماتے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے میں اس کہانی کے سلسلے میں بعض وضاحتوں کے لیے ان کے پاس گیا تو وہ بڑے اداس تھے۔ کہنے لگے بس اب اپنا چل چلاؤ کا وقت ہے، میں نے کہا چچا ابھی تو آپ کو بہت سی چیزیں لکھنی ہیں۔ ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑنا ہے۔ ابھی تو آپ نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ جب سب رنگ جوان ہوا تو آپ ایسی باتیں کرنے لگے،

یہ کہانی پڑھیے اور میرے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھایئے۔ چچا ابوالفضل صدیقی ہزاروں برس زندہ رہیں اور ہر برس کے دن پچاس ہزار ہوں۔ بھلا ایسی خوب صورت اور زندہ تحریریں لکھنے والے کو بھی موت کی باتیں کرنی چاہئیں؟

شکیل عادل زادہ

خان صاحب

محمود خاں کی فوری طلبی قسم کی دعوت پر جب ہم جنگل میں اُن کے کیمپ پر پہنچے تو اُن کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ تھی کہ حادثے کی ڈرامائی ستم ظریفی کے باوجود ہم میں سے کسی کی ہمت ہنسنے کی نہ پڑی اگرچہ ہر ایک کے پیٹ میں ہنسی کی ہلوریں اٹھ رہی تھیں لیکن ہر شخص خشک چہرہ بنا کر خان صاحب کو پُرسا ہی دے رہا تھا۔ مس نزاکت کو اغوا ہوئے آج آٹھواں روز تھا۔ میں نے غور کیا کہ بوڑھے خاں صاحب پر آج تک اتنا شدید اثر تھا جیسے کسی نوجوان کی نا کتخدا محبوبہ کو کوئی رقیب اغوا کر کے لے جائے۔ اندھیری رات میں اغوا ہونے کا واقعہ پھر صبح پیچھا کرنے کی داستان انھوں نے ہم سب کے سامنے بڑے پُر درد انداز کے ساتھ فریاد کی آواز میں سنائی۔ انھیں ذاتی طور پر نزاکت کے جانے کا اس قدر شدید ملال تھا کہ حادثے کے اس پہلو کا قطعاً احساس نہ تھا کہ اُن سے جواب طلبی بھی ہوگی۔ حقے کے کشوں کے ساتھ وہ اپنی بھاری آواز میں بولے چلے جا رہے تھے۔ ہر دو لفظوں کے آگے اور پیچھے چار چار گالیاں لگا کر اپنی فصیح گفتگو میں بلاغت پیدا کر رہے تھے۔ خود کو گالیاں، حرامی بچے چوکیداروں کو گالیاں، سؤر کے بچے فیل بانوں کو گالیاں، گیدڑ کے بچے کتوں کو گالیاں، حرام زادے جنگل اور حرام زادی اندھیری رات کو گالیاں۔ نزاکت اور اکڑا کو تو نہ معلوم کتنی گالیاں۔ بس گالیاں ہی گالیاں اور کچھ نہیں یوں بھی بعض ہر قسم کی نجیب الطرفین گالیاں تو اُن کی زبان کو شیر مادر تھیں لہٰذا اُن کی بات چیت کی لغت میں ان کے معنی گال کے نہ تھے

اکڑا اور نزاکت کی بات تو سچ مچ گال والی بات تھی اور خاں صاحب کا جی جلا ہوا تھا۔ لہٰذا خضاب آلود پٹھانی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے لال لال ہونٹوں کے اندر سے مشینی انداز میں کٹ کٹ کر اور پھسل پھسل کر بڑی سڈول اور جسیم گالیاں ٹپک رہی تھیں اور یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ یہ ہونٹوں میں سے پھسل رہی ہیں یا حقے کے غلیظ دھوئیں کے ابھارے آواز کا روپ دھار لیتے ہیں کسی کسی وقت حقے کی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ایسی مدغم ہو جاتی جیسے یہ بھی گالیاں ہیں۔

ہم لوگ بخشنے والے نہ تھے مگر کیا کرتے اوّل تو خاں صاحب کا رنج پھر اس سے زیادہ جواب طلبی والا پہلو ہمیں ذرا نازک معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے کہ خیر خاں صاحب کو جو نزاکت کے ساتھ شغف تھا وہ تو تھا ہی لیکن بذات خود سرکار کی اُس کے ساتھ مخصوص دلچسپیاں وابستہ تھیں کم از کم ہم سب لوگ یہ جانتے تھے کہ سرکار نزاکت کے اغوا ہونے کی خبر سن کر بہت برہم ہوں گے اور نہ معلوم نزلہ کدھر رجوع ہو جائے لیکن خاں صاحب کے دل پر نزاکت کی جدائی کا تیر اتنا شدید پڑا تھا کہ انھیں اس کا قطعاً احساس نہ تھا۔ میں نے اتنا البتہ کہا کہ میاں خاں صاحب اس وقت اگر تم نے ہمارا کہا مان لیا ہوتا اور بس ایک کیمپ کا انتظام کر دیا ہوتا تو یہ دن کیوں دیکھتے؟ خیر ہم لوگ مار نہ سکتے تو سالے کو بھگا تو ضرور ہی دیتے اور وہ سالا مرتا یا نہ مرتا آج تمھاری مس نزاکت کو بھگانے کے لیے تو یہاں نہ ہوتا۔ اس پر خاں صاحب نے اپنی گل گچھوں اور داڑھی سے ڈھکے ہوئے سرخ رخساروں پر کئی چپت اپنے ہاتھوں سے مارے اور روہانسی آواز میں گالیاں در گالیاں گالیوں میں لچھے سے پڑنے لگے اور گالیوں کے

ریاست رام پور کے جنگلوں کا ایک سچا واقعہ

اس تحریر کے بعض کردار اب تک زندہ ہیں اور پاکستان میں موجود ہیں

اردو کے صاحب طرز ادیب ابوالفضل صدیقی کے قلم سے

اِس ماہ کی خاص کہانی
خوش ذوق قارئین کے لیے

مِتنے قدیم و جدید مصدر ہیں اُن سب کی گردان ایک سانس میں اپنے اوپر کر ڈالی اور اس طریقے سے ہمارے سامنے اظہارِ ندامت و عفو کیا اور انداز ایسا ہو گیا جیسے عنقریب اپنی کلائیاں بھنبھوڑ اٹھیں گے اور خیر ہم لوگ ہی کیا خوش باش اور بذلہ سنج خاں صاحب کے وسیع دائرۂ احباب میں ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو اُن سے سنجیدگی سے بات کرنا گناہ نہ خیال کرتا ہو اور جس سے وہ سیدھے سادے بات کرتے ہوں اور نزاکت کے بھگا کر لے جانے کی خبر پر ہم لوگ اُن کی دعوت پہ مذاق کرنے آئے تھے مگر اُن کی حالت دیکھ کر ہمیں بھی سنجیدگی کا روپ بھرنا پڑا۔

وہ ریاست رام پور کے فوجی افسر تھے اور مہتمم سواری اور انچارج فیل خانہ، اصطبل، گئو خانہ وغیرہ تھے اور ہز ہائی نس کی سواری کی موٹر گاڑیاں اور شکاری اسلحہ خانہ بھی انھی کی سپردگی میں تھا جس میں بے شمار پرانے ہتھیاروں کے علاوہ جدید ترین ولایتی ساخت کے اعلا شکاری رائفل اور بہترین بندوقیں تھیں جن میں سے اکثر بڑے انگریزی کارخانوں میں خاص آرڈر دے کر تیار کرائی گئی تھیں مگر اس ساز و سامان کے باوجود اور ایک بڑے اچھے نشانے باز ہوتے ہوئے بھی حضرت کو خود شکار سے شوق نہ تھا اگرچہ سرکار اور سرکار کے مؤقر مہمانوں کے لیے شکار کیمپ کا انتظام کرانا بھی آپ کے منصبی فرائض میں تھا جسے بڑی خوش اسلوبی اور حسنِ انتظام کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

اکرِلا کی تباہ کاریوں کی اطلاعات جب ضلع نینی تال کے محکمہ جنگلات کے عمّال نے ریاست کے عمّال کو دے کر متنبہ کیا اور ریاست کے محکمہ جنگلات سے خبروں کے تبادلے کی درخواست کی اور شہر میں طرح طرح کی افواہیں اڑیں تو ہم نے خاں صاحب سے کہا کہ ایک کیمپ کا انتظام کر دیں، کچھ موٹے رائفل اور اچھے کارتوس نکال دیں لیکن انھوں نے صاف اڑا دیا اور ہر صورت سے شکار کو جانے سے باز رکھا یہاں تک کہ آج یہ دن دیکھا کہ اکرِلا اُن کی محبوب ترین فیل خانے کی شہزادی قسم کی لاڈلی ہتھنی پر ہاتھ صاف کر گیا جس کی پشت پر پالتو ہاتھی کی ایک تاریخ تھی اور جو اپنی جگہ مستثنیات میں سے تھی۔

اپنی پارٹی میں بڑے بڑے شکاری تھے۔ ریاست کے انجینیئر رائٹ صاحب، سنگھ بابو اور ہز ہائی نس کے میر شکار جمّا میاں بھی تھے جنھوں نے سینکڑوں شیر مارے تھے اور کئی آدم خور شکار کیے تھے۔ خود سرکار یا سرکار کے مؤقر مہمانوں کے شکار کی کامیابی انھی کے دم قدم سے تھی۔ مشہور تھا کہ اُن کا ہاتھ موت کا طمانچہ بن کر پڑتا ہے اور بہت کم خالی جایا کرتا ہے۔ جلال خاں نام تھا اور جمّا میاں عرف۔ سرکار نے آدم خور شیروں کے شکار کی بہادریوں سے خوش ہو کر جلال شیر خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا پھر اسی نام سے ریاست کے اندر سرکاری کاغذات میں لکھے جانے لگے۔ یوں تو مکمل شکاری تھے اور ہر قسم کے شکار کا بڑا شوق تھا لیکن ہاتھی کے شکار سے کوئی مس نہ تھا۔ ویسے ہم سب کے اُستاد تھے اور ہمارے ساتھ موجود تھے لیکن ہر ترغیب دلانے کے باوجود اُن کے اندر ہاتھی کے شکار کی گدگدی پیدا نہ ہو سکی۔ خیر اُن کا ساتھ ہونا ہی ہمارے لیے بڑی تقویت تھی کیونکہ ہاتھی کے شکار کا اور پھر خونی ہاتھی کے شکار کا تجربہ ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ ویسے رائٹ صاحب دعوا کرتے تھے کہ وہ برما اور آسام میں ہاتھی کا شکار کھیل چکے ہیں لیکن وہ بھی خونی ہاتھی کے شکار کا تجربہ ہونے کا دعوا نہ کرتے تھے۔

اکرِلا کی بازی گاہ کا جغرافیہ میرے اور میرے دوسرے ساتھیوں کے دماغ میں تھا اور جو چیزیں کچھ دھندلی تھیں، وہ جمّا میاں نے واضح کر دی تھیں۔ وہ ضلع نینی تال کی تحصیل بلاس پور اور ریاست رام پور کی ایک تحصیل شاہ آباد کے رقبے کے اندر دریائے کوسی کے دونوں کناروں پر مار دھاڑ کر رہا تھا اور تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار مربع میل میں ہراس پھیلائے ہوئے تھا۔ تباہ کاریوں کی تفصیل میں جانے سے قبل ہم نے اُس کی حیثیت اور شکل و صورت کے متعلق معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ وہ ایک دانت والا ہاتھی ہے اور مقامی بولی میں اکرِلا اکیلے کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عادات کے لحاظ سے بھی عام ہاتھیوں سے منفرد رہنے کے سبب ہمیشہ تنہا نظر پڑتا ہے چنانچہ وہ داخلی و خارجی اعتبار سے اکرِلا تھا اور دیہاتیوں نے یہ نام اسے بڑا مکمل دیا تھا اگرچہ عام لوگ صرف ایک دانت ہونے کی مناسبت سے اسے اکرِلا کہتے تھے اور جب وہ خونی نہ ہوا تھا اُس وقت سے اُس کی بعض مخصوص عادتوں اور اکیلے دانت کے سبب اسے خوب پہچانتے تھے۔ یہ اکیلا دانت جنگل بھر میں اسے ممیّز کرتا تھا۔ اُس کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ چونکہ بہت نٹ کھٹ اور لڑاکا ہے لہٰذا کسی لڑائی میں دوسرا دانت جھڑ گیا ہے یعنی اچھے خاصے پُرامن دور میں جب آدمیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع نہ کیا تھا ہاتھیوں سے روزانہ ایک دو دنگل لڑے بغیر اُس کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ پھر یہ دانت! یہ دانت دیکھنے کو تو ایک کڈھنگا بے ڈول دانت تھا مگر در اصل چار دانتوں کا ایک دانت تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا۔ شروع میں ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ دوسرا دانت کسی لڑائی میں جھڑ گیا ہے مگر پہلے قیاس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یا درزاد عیب ہے پھر انکشاف ہوا کہ دوسرے دانت کی جگہ ایک گومڑی سی ہے جیسے نکلنے کی کوشش میں دوسرا دانت ٹھٹھر کر جہاں کا تہاں رہ گیا ہے۔ اکرِلا کا یہ ایک دانت موٹے سے موٹے دانت سے سوایا ڈیوڑھا موٹا اور ایسا ہی غیر معمولی لمبا تھا اور بڑا مضبوط اور نوک دار تھا۔ عام ہاتھیوں کے دانتوں سے بالکل مختلف خم کے ساتھ جما ہوا تھا۔ پھر اکرِلا اچھے تن و توش والے ہاتھیوں میں تھا۔ جسم کا گٹھا ہوا بڑا اچھا تھا اگرچہ بھدا تھا لیکن بلا کا مضبوط۔ ٹانگوں میں عجیب قسم کا خم تھا جیسے گھٹنوں کے جوڑ ٹیڑھے میڑھے تھے اور ٹانگوں کے عجیب سے خم اور اس دانت کی نوک کے زاویے نے شاید اُس کا حملہ بڑا شدید اور بے پناہ بنا دیا تھا یا یوں کہیے کہ اپنے مقابل پر اُس کا حملہ کچھ ایسے نادر قسم کے داؤ پیچ کے ساتھ پڑتا کہ وہ اس کا بچاؤ نہ کر پاتا۔ دوسرے الفاظ میں قدرت نے عام ہاتھیوں کے حملے کا بچاؤ تو سب ہاتھیوں کو سکھایا تھا مگر اُس کے حملے سے بچنے کا طریقہ اور اُس کے مقابلے پر اپنی مدافعت کوئی ہاتھی نہ جانتا تھا کیونکہ اُس کی جسمانی ساخت عام ہاتھیوں سے مختلف تھی۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ مزاج میں شورش اور جبلت میں شرارت تھی گویا ہاتھ پاؤں اور دانت کے خموں کے ساتھ فطرت بھی کج تھی اور خصلت میں مادرزاد حرامی پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کھرا، کینہ پرور، غصہ ور، شورش زا اور تخریب پسند واقع ہوا تھا۔ نتیجے میں بڑے بڑے ہاتھیوں سے چودھری اور ذی وقار سردار اُس کی کج فطرت اور بے ڈھب دانت کے مقابلے پر ایک بھی اچھی طرح ٹِک نہ پاتے اور پہلے ہی حملے میں دُم دبا کر میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے

اور یہ بے وجہ اور بغیر لحاظِ عمر و مرتبہ ہر ایک پر حملہ کر بیٹھتا اور مار بھگاتا لیکن ساتھ ہی ساتھ اتنا کھرا اور اوچھے دماغ کا واقع ہوا تھا کہ نہ غول کی سیادت سنبھالنے کی صلاحیت تھی، نہ کبھی اس پہلو کی جانب اس کی توجہ جاتی تھی۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک کسی سے بنا کر چلنا نہیں جانتا تھا لہٰذا غول کے اندر نر تو در کنار ماداؤں پر بھی کوئی رعب و وقار نہیں تھا اور ہوتا کیسے بڑوں کو چھوڑیے، وہ تو خیر پٹنے کے لیے تھے ہی یہاں چھوٹوں کا بھی لحاظ نہیں تھا۔ ماداؤں سے نہ بات کرنے کا سلیقہ، نہ بہلانے کا ڈھنگ، مغلوب الغضب ایسا کہ خیر ہاتھیوں کے تو بے پناہ دانت کے بھالے سے پرخچے اڑاتا ہی تھا، متھنیوں کو بھی نہ بخشتا۔ جنگل بھر میں کوئی جوان یا بوڑھی متھنی ایسی نہ تھی جو شیں شیں کرکے ڈرائی دھمکائی نہ جاتی ہو اور ہفتے عشرے دیکھتے دو چار مکے آپ کی سونڈ کے نہ کھا لیتی ہو۔ اس فطرت و جبلت کے ساتھ جسم میں مناسب طاقت بھی، پھر بے پناہ ہتھیار سے مسلح اور حملے کے نادر طریقے سے آشنا تھا لہٰذا خود کو بہادر خیال کر لینا لازمی امر تھا۔

جب مستی کا زمانہ آتا تو جنگل کی ہوا آپ کو بھی لگتی۔ غول میں نئی جوان پٹھوریں بھی ہوتیں، دو ایک اچھوتی کنواریاں بھی ہوتیں، اچھی کاٹھی پٹھے کی درست کسی بنی ادھیڑیں بھی ہوتیں لیکن لبھانا پٹانا تو در کنار آپ سیدھی سادی بات کرنے کے سلیقے سے بھی نابلد تھے اور نئی پٹھوریں تو اس وقت بڑے نخرے دکھاتی ہیں اور ادھیڑیں بھی ناز برداریاں کراتی ہیں، اچھوتی کنواریاں بھولی بھالی ضرور ہوتی ہیں لیکن بیچاریاں مستی کی پہلی گت اپنے اندر بجتے سن کر اس قدر گھبرائی ہوئی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے عاشق سے اور ساتھ والیوں سے غمزہ اور عشوہ طرازیاں سیکھنا چاہتی ہیں اور یہاں رجوع ہونے کا طریقہ ہی اتنا بھونڈا تھا کہ جوان اور کنواریاں تو در کنار کوئی ادھیڑ بھی منہ نہ لگاتی اور اپنے اپنے وقت پر اپنے اپنے جوڑے بنا لیتے اور آپ تو جوان تھے یہاں بوڑھے بوڑھے تک جوان اور کنواریوں کو پٹا کر لے جاتے اور آپ اپنے بلوں میں اینٹھتے ہی رہتے۔ یہاں تک کہ کوئی بڑی بوڑھی جو کہیں آپ کی دادی نانی لگتی ہوگی اور جس میں اپنے وقت پہ تھوڑا سا دھواں سلگ اٹھتا اور راگ واگ مستی وستی کیا اور ان کی دیکھا دیکھی کسی کونے کھدرے میں کوئی چنگاری چمک اٹھتی اور جیسے کوئی جوان ہاتھی تو در کنار سوکھا پلپلا بوڑھا بھی نہ سونگھتا وہ آپ کو تاڑ لیتی اور احمق بنا کر لے بھاگتی اور آپ کی بھرا بھر نوجوانی کی دہکتی آگ کے ساتھ اپنے بجھے بجھائے خالی خول بڑھاپے کے کوئلے اور راکھ خوب دہکاتی اور بھرپور دادِ عیش دیتی اور ان گدھے کو پتہ بھی نہ چلتا کہ سچ مچ صنفِ نازک کیا ہوتی ہے اور اتنے بڑے فاتح ہونے کے باوجود کبھی ڈھنگ کا جوڑا ملنا تو در کنار اچھی طرح ایک بوسہ بھی نہ ملا اور کنواری تو بڑی چیز ہے، وہ تو بھلا ہاتھ آتی ہی کیسے کبھی کسی ڈھنگ کی ادھیڑ نے بھی منہ نہ لگایا۔

ہمارے خاں صاحب محمود خاں ضلع نینی تال کے موضع بجے پور میں کیمپ کیے ہوئے تھے۔ یہ گاؤں کمایوں ڈویژن کی سب سے اہم شکار گاہ میں واقع ہے۔ ہز ہائی نس نواب یوسف علی خاں ناظم خوش گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے شوقین شکاری بھی تھے اور مناظرِ فطرت اور صحرائی زندگی کے شیدائی تھے۔ انھوں نے یہاں جملہ اقسام کے جنگلی جانوروں کی کثرت دیکھ کر یہ رقبہ اپنی شکارگاہ کے لیے منتخب کیا اور برٹش گورنمنٹ سے خرید کر یہ گاؤں آباد کر دیا۔ ریاست کی حدود سے تو باہر ہے لیکن شمالی سرحد سے چند میل دور ہے، جبھی سے یہ ریاست کی شکارگاہ چلی آتی ہے اور اس گاؤں کی رعایا سے صرف کیمپ اور شکار کی خدمات لی جاتی ہیں جس میں انھیں بڑی مہارت ہو گئی ہے کیونکہ وہ انھی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو نیم خانہ بدوش نیم کاشت کار ہیں۔

خاں صاحب کو فیل خانے بھر میں نرالی اور اس کی بیٹی نزاکت سے بڑی انسیت تھی اور دونوں کو اپنی خاص سواری میں رکھا کرتے تھے اور اس وقت بھی کیمپ میں دونوں ان کے ساتھ سواری میں تھیں۔ دونوں متھنیاں اپنی صورت شکل، خصلت اور خاصیت کے لحاظ سے خاں صاحب کو بے نظیر معلوم ہوتی تھیں اور اپنی مخصوص روایات رکھتی تھیں۔

پالتو متھنی بچہ نہیں دیا کرتی یا ہاتھیوں سے نسل کشی نہیں کرائی جاتی اور نرالی کے بطن سے خاص فیل خانے کے اندر نزاکت پیدا ہوئی تھی۔ خیر پہلی عجوبہ چیز پالتو متھنی کا بچہ دینا ہی تھا، پھر یہ کہ نرالی کھیدے میں پکڑی گئی تھی اور جنگل سے تقریباً آدھے دنوں سے کچھ اوپر حاملہ آئی تھی۔ بالعموم کھیدے میں جو متھنیاں گابھن آیا کرتی ہیں ان کے حمل کھیدے سے لے کر سدھ جانے تک کی چپقلش برداشت نہیں کرتے اور یہی چپقلش کے اسقاط ہو جاتے ہیں، اور اگر خاص احتیاط نہ کی جائے تو حاملہ متھنی بھی مر جاتی ہے کیونکہ کھیدے میں پکڑ کر مانوس ہونے تک جو مار دھاڑ اور تکالیف پہنچائی جاتی ہیں ان میں ہاتھی ادھ مرا ہو جاتا ہے جب وحشت دور ہو پاتی ہے اس کے بعد پھر ایک مدت میں کام پر لگ پاتا ہے لیکن شاید نرالی غیر معمولی سخت جان بھی تھی اور خلقی طور پر شائستہ تھی۔ بڑی جلدی سدھ گئی یوں بھی سانٹھ ماروں نے بھانپ لیا تھا کہ حاملہ ہے لہٰذا مخصوص احتیاطیں شروع ہی سے برتی گئی تھیں۔ شائستہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود تکلیفیں بھی کم اٹھائیں اور پیٹ کا بچہ بھی زندہ بچ گیا۔ پوری مدتِ حمل سے کچھ دنوں قبل پیدائش ہو گئی اسی لیے نزاکت بہت کمزور تھی۔ چند روز تو زندگی کی امید نہ رہی مگر ریاست کے اندر بڑی اچھی طبی امداد موجود تھی، بہترین ویٹری ڈاکٹر اور بڑے بڑے تجربہ کار اور ماہر عطائی پڑے ہوئے تھے اور بچہ بیمار تو نہ تھا صرف پیدائشی کمزور تھا۔ وہ ہفتے بھر سسکتی رہی، انھیں علاج معالجہ غذائیں پہنچانے کا وقت ملا اور وہ کھڑی ہو گئی۔ نہایت لاغر اور بڑی نحیف، جب ذرا اچھلنے کودنے لگی تو خاں صاحب نے اسی رعایت سے نزاکت نام رکھ دیا۔ پرورش کے لیے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ گاؤ خانہ میں سینکڑوں من دودھ ہوتا تھا، خاں صاحب کی نظرِ شوق بھی تھی۔ خود نرالی ذرا تیکھے مزاج کی متھنی تھی اور اسی بنا پر خاں صاحب نے یہ نام دیا تھا اور اسی وجہ سے خاں صاحب کی بڑی محبوب سواری تھی اور کچھ اس کی بیٹی ہونے کے سبب

اور کچھ خانہ زاد ہونے کی وجہ سے نزاکت فیل خانے کی لاڈلی بن گئی اور شاید انھی نازبرداریوں کے سبب بڑی شوخ و شنگ اور چنچل منچنی اٹھان اُٹھ رہی تھی اور بڑی جلدی عمر کے اُس دَور میں پہنچ گئی جب بچپن جوانی کی سرحدیں چھونے لگتا ہے۔ خاں صاحب محمود خاں نے اُسے بھی ٹرینڈ کرنا شروع کردیا اور جب نزاکت نے ذرا اور پَر پُرزے نکالے تو خاں صاحب کی نگاہِ شوق ماں سے زیادہ بیٹی پر گہری ہوگئی اور کبھی کبھی اُس پر بھی ہلکی پھلکی سواری لے لیا کرتے جس میں انھیں بڑا لُطف آتا تھا۔

جس رات کی یہ بات ہے وہ بڑی اندھیری رات تھی۔ جاڑے کی ماں سمن خلیج بنگال سے اُٹھ کر ہمالیہ سے ٹکرائی تھی اور بادلوں نے بارش کے بجائے کہرے کی شکل اختیار کرلی تھی پھر زوالِ ماہ کی آخری تاریخیں تھیں، پوری کی پوری چوبیس گھنٹے کی طویل راتیں اندھیری ہی اندھیری ہو رہی تھیں۔ اس پر سیاہ کہرا اور پہاڑیوں اور گڑھوال کی بلندیوں سے اُترتے ہوئے کالے کالے بادلوں کا سلسلہ نیچے نیم سیاہ زمین آسمان سے جیسے سیاہی کے تودے زمین کی جانب لڑھک رہے تھے۔ زمین پر گویا بحرِ ظلمات میں طوفان اُٹھ رہا تھا اور فضائے بسیط میں سیاہیوں کا سیاہیوں سے تصادم ہو رہا تھا۔ ہوا دم بخود تھی، مستقل تمام رات نغمہ سرائی کرنے والے جنگلی پرند خاموش تھے حتیٰ کہ جھینگر بھی چُپ تھے۔ کہیں سے کا نکڑہ سانجر چیتل کی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ دُور کہیں کوئی اُلّو کڑکتا تو غلیظ کہرے اور نمی سے بھری ہوئی فضا میں آواز پھیل نہ پاتی اور وہاں کی نہاں منجمد ہوکر گھٹ کر رہ جاتی۔

جنگل، میدان، آبادی، کیمپ ہر چیز سیاہیوں میں گم تھی، صحیح معنوں میں ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے رہا تھا اور مہیب خاموشی یہ تاریکی سیاہ تر بنا رہی تھی خاموشی اور تاریکی کچھ ایسی مدغم تھیں جیسے دونوں ایک ہی کیفیت سے معمور ہیں گویا ایک ہی چیز ہیں۔ خاں صاحب محمود خاں کا کیمپ گاؤں سے تھوڑی دُور کے فاصلے پر لگا ہوا تھا اور تاریکی میں ہر چیز گم تھی، حتیٰ کہ خاں صاحب کے خاص خیمے کے سامنے جو مٹی کے تیل کی لالٹین نصب تھی وہ بھی غلیظ کہرے کی تہوں میں روشنی پھینکنے سے معذور تھی۔ کیمپ سے دو سو گز پر ایک برگد کے درخت کے نیچے نزاکت بندھی ہوئی تھی اور عین اُس کے سامنے دو سو گز مخالف سمت پر ایک اور برگد کھڑا تھا جس کے نیچے نرالی بندھی ہوئی تھی۔ درمیان میں کیمپ کی جھول داریاں مائل تھیں۔ دونوں کو ایک دوسری سے علیحدہ اور اتنی دُور اس لیے باندھا جاتا تھا کہ اگر ایک جگہ باندھی جاتیں یا قریب قریب ہوتیں تو تمام رات شور کرتیں اسی لیے کہ یہ چار سو گز کے فاصلے سے بھی باتوں کی جھڑی لگادیں گی یہ اہتمام کیا تھا کہ درمیان میں جھول داریاں تھیں اور یہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل بھی تھی۔

تقریباً چھ ماہ سے نزاکت کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہو رہی تھی آہستہ آہستہ وہ چنچل پن اور سیمابی کیفیت کم ہو رہی تھی اور انداز مائل بہ شائستگی ہوتا جا رہا تھا۔ یہ جبر مستی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے مگر اسے نہ تو خاں صاحب سمجھے نہ کوئی فیل بان وغیرہ۔ دراصل یہ سب لوگ اُن علامات سے واقف ہی نہ تھے جو ہتھنی میں بالغ ہونے کے بعد پہلی مرتبہ مستی آنے پر پیدا ہوتی ہیں ورنہ اس زمانے میں جب ہاتھی ہتھنیاں مستی پر ہوا کرتے ہیں احتیاط کی جاتی ہے اور کتیرا وغیرہ بار دار مسکّن دوائیں اور ایسی مخصوص غذائیں دے کر بہت جلد یہ کیفیت ختم کردی جاتی ہے کیونکہ ایسی حالت سواری وغیرہ میں مانع ہوتی ہے۔

نزاکت کی ننھی ننھی آنکھوں میں مدّتوں سے نشہ سا بھر رہا تھا، چلتے چلتے جھومتے جھومتے ایک دو قدم رقص جیسے ڈال جاتی۔ ہوا میں ہمہ وقت سونڈ لہرا لہرا کر دُور دُور کی خوشبو لینے کی کوشش کرتی، کان بار بار ساکت کرکے جیسے کسی دُور کی آواز پر لگاتی۔ انداز ایسا تھا جیسے کسی بڑی دُور سے آنے والے کی ہمہ وقت منتظر ہے، ہمہ تن مشتاق اور آج رات اُس کی کشش نے جو زور مارا تو دُور کا آنے والا سچ مچ پہنچ گیا۔

حُسنِ اتفاق سے اکرا اُن دنوں یہیں تھا۔ مستی کا زمانہ تھا اور اکرا بھی بھرپور مستی پر تھا اب کی مرتبہ غول میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے اور سخت ڈوئل لڑنے کے بعد بھی کوئی ہاتھنی نہ آئی تھی اور محرومی در محرومی اور بدنصیبی در بدنصیبی یہ تھی کہ اکرا جس مال زادی کے لیے لڑتا تھا وہ بجائے اُس کے ہاتھ آنے کے اسی بھاگے ہوئے رقیب کے ساتھ بھاگ جاتی تھی یہاں تک کہ اب کی مرتبہ اس بڑھیا ٹھڑ یا نے بھی منہ لگایا جو ہمیشہ بچی بچائی رہ جایا کرتی تھی۔

سب کے سب اپنے جوڑے بنا بنا کر غائب ہوگئے اور غول منتشر ہوگیا اور اکرا تنہا رہ گیا اور عشق کی ناکامی میں دیوانہ سا ہوگیا، حواسِ خمسہ بڑے زور سے بروئے کار آگئے، ہجر میں عشق کا جوش انتہا کو پہنچ گیا مگر جنگل میں دُور دُور کہیں محبوبہ کی خوشبو نہ تھی بجز اس کے چارہ نہ تھا کہ ہلدو اور سال کے دیو پیکر درختوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر رہ جائے۔ اسی بے تابی میں وہ آنکھ ناک کان سے تلاش کرتا ہوا جدھر بھی منہ اُٹھا دیوانہ وار لپکتا رہا۔ نامعلوم شے کی جستجو، تلاش و جستجو، جستجو و آرزو۔ نہ چال میں توازن، نہ سمت اور منزل کا تعین بس تلاش ہی تلاش یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر بڑی بھینی بھینی خوشبو ناک میں پہنچی شاید کچھ ایسی جیسی مٹّی کے کورے برتن میں پہلی مرتبہ پانی پڑنے کے بعد ہماری ناک میں پہنچا کرتی ہے اور یہ خوشبو ہر سال اکرا سونگھا کرتے تھے مگر اتنی عمر ہونے کو آئی اور راستے بڑے پہاڑ سر راہ واقع ہوئے تھے مگر کبھی اس کی لذت سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ عمر میں پہلی مرتبہ تقدیر کا ستارہ ایسی تاب ناکی کے ساتھ چمکا اور پانچ میل سے نزاکت کی کنواری خوشبو لے کر ہوا کے رُخ پر ناک کی سیدھ پکڑا، چال میں چلنے کے بجائے جیسے کچھ کھنچنے والا انداز تھا اور سچ مچ گویا مقناطیس کی چٹان لوہے کا تودہ کھینچ رہی تھی۔ اکرا نے آناً فاناً یہ چند میل کا فاصلہ پاؤں میں لپیٹ لیا۔ کہرے کی سیاہ اور نم چادر سے نمودار ہوتے ہوئے جوں ہی کنواری اچھوتی نزاکت نے اپنے مطلوب کو دیکھا تو اُس کے سینے کے اندر بڑے زور سے کوئی چیز پھڑپھڑائی خوشبوؤں سے سرشار فضا مہک اُٹھی مخصوص پیار کی آواز بڑے ناز کے لہجے میں آہستہ

سے نکال اور یہ آواز جیسے اُس نے ابھی ابھی سیکھ لی تھی، اُدھر سے اکڑا نے اپنی ذرا کھُرّ قسم کی ناز برداری والی آواز میں صدائے لبیک دی اور اکڑا بیچارے کو تو آج تک اس آواز میں کسی نے خطاب ہی نہ کیا تھا جس میں نزاکت نے پکارا تھا۔ دعوتِ وصل کا یہ شیریں ترنم سُن کر اکڑا نہ تو کیمپ دیکھ سکا، نہ آتنی گہری قسم کی آدمی کی بو لے سکا، نہ سوتے آدمیوں کے خراٹے اور سانسیں سُن سکا، اسے اپنا ہی آگا پیچھا سجھائی نہ دیا جیسے اس کے حواسِ خمسہ اور چھٹی حس سب کے سب ایک نزاکت کے مرکز پر جمع ہو گئے ماں کے دو بچھڑے مل گئے، پہلے دونوں سونڈوں سے معانقہ ہوا، پھر یہ ذرا کھسکا اور وہ جھومی اور جھوم کر وجد سا کر گئی، کچھ ناچنے کا سا انداز بنا یا، دونوں سونڈیں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور ایک ہلکی سی جنبش نے اور قریب کر دیا اور سونڈوں میں ایک اور بل پڑ گیا سینوں کے اندر سے فیں فیں پریم بھری آواز بڑے مدھم سُروں میں نکلتی رہی، دونوں جانب ایک جھرجھری سی آ گئی یہاں تک کہ سونڈوں کے لوچ میں جتنی گنجائش تھی ایک دوسری سے لپٹ گئیں اور شاداب نم ناک ہونٹ، ہونٹ سے آملے۔ اندر سے گرم گرم زبانیں لپک پڑیں اور ایک دوسری کو رگڑنے لگی اور رگڑتے رگڑتے ہونٹوں کے ساتھ مل کر چسکیاں بھرنے لگی۔ امرت کی چسکیاں۔ آبِ حیات کے گھونٹ وہ غٹاغٹ پیتے رہے مُشک بو سانسیں تند نشے کی لہروں کی صورت ایک دوسرے رگ و ریشے میں اترتی رہیں نہ معلوم کتنی دیر یہ من تو شدم تو من شدی کے طویل بوسے کا تسلسل چلا۔ یہاں تک کہ خون میں اُٹھتے ہوئے جھاگ پھٹ پڑنے کی حد تک چڑھ گئے تو سونڈیں بوسے کا سلسلہ ختم کر کے جسم کی دوسری گولائیوں کا جائزہ لینے لگیں نزاکت کو زلزلہ سا محسوس ہوا جیسے اسی ارتعاش میں جھومتے ہوئے اکڑا کو اپنی رگ رگ میں سمو لے یا خود اُس کے وجود میں ضم ہو جائے۔ ڈھیلی ڈھالی بڑی بوڑھیوں کے ٹھنڈے لٹکتے کھُردرے جسموں کی روکھی پھیکی بے کیف روح لذت کے آشنا اکڑا نے آج عمر میں پہلی مرتبہ کسی اچھوتی کم سن کا کورا بدن چھوا تو دیوانہ سا ہو گیا جیسے سب کچھ کلیجے میں اُتار لینے کو جی چاہا۔۔۔ دو اُبلتے ہوئے وجودوں میں ایک دوسرے سے جتنی قربت کی گنجائش تھی، وہ مل گئے اور فیل خانے کی لاڈلی نزاکت پر شاید عروسی شب کی دلھن والی سب کچھ ابھی بیت جاتی مگر اکڑا کی بدنصیبی پٹھوں سے ملحق نیچے برگد کا موٹا تنا تھا اور نیچے پھیلی ہوئی جڑوں میں دو موٹی زنجیروں کے ذریعے نزاکت کے دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے اور رونگٹا رونگٹا ایک دوسرے سے چمٹے ہونے کے باوجود اکڑا نزاکت سے بہت دور تھا اور نزاکت اکڑا کی دسترس سے بالکل باہر تھی جھق جھق گرم گرم سانسیں جو ایک مرتبہ ملیں تو اکڑا کا اُبال بڑھتے بڑھتے جیسے ابھر سا پڑا۔ نزاکت کا وجود بڑے زور سے ہِل گیا اور یہ دوری قربت میں بدلنے کے لیے جیسے انھوں نے اندر ہی اندر ایک بل سا کھایا، اُن کی روحیں پھریریاں لے اٹھیں، اکڑا نے پینترا بدل کر اپنی سونڈ نیچے سے ڈال کر نزاکت کے سینے اور پسلیوں کو لپیٹ میں بھر لیا اور ایک اکھیڑ لگائی جیسے ہزار سالہ بوڑھے برگد کے ساتھ شاید یہ قطعۂ زمین ہی اندھیرا ماحول جہاں نزاکت کھڑی ہے سب کچھ کھینچ کرے جائے گا۔ اس رستخیز میں پچاس من کے اکڑا اور پینتیس من کی نزاکت دونوں چٹانوں کے اندر لاوا پورے زور سے بھڑ بھڑ اٹھا۔

نہ معلوم اس میں کچھ اکڑا کے جناتی عشق کی قوت کشش کو بھی دخل تھا یا نزاکت ہی کے جوشِ جنوں کے ایک جھٹکے نے دونوں زنجیریں توڑ کر ہاتھی کے زنجیر توڑنے کا ریکارڈ توڑ دیا اور چل پڑے

اوّل تو جو کچھ ہوا، وہ بہت مدھم آوازوں میں ہوا، راز و نیاز ہی جو تھے، پھر اخیر رات کی نیند اور سردی کا موسم چوکیدار اور فیل بان پہلے تو چونکے نہیں اور جو ایک آدھ کے نیند میں غلطاں دماغ کے اندر کچھ ہلکی ہلکی آوازیں پڑیں بھی تو یہ خیال کر کے کہ نرالی کھُل کر نزاکت کے پاس چلی آئی ہے اور ماں بیٹی باتیں کر رہی ہیں اور یہ فیل خانے کے اندر نرالی اور نزاکت کا اکثر معمول تھا اور ابھی سال ڈیڑھ سال پیشتر تک تو نزاکت کے پاؤں میں پابندی کے ساتھ زنجیر ڈالی بھی نہ جاتی تھی اور صبح سے شام تک اکثر و بیشتر وقت نزاکت کا ماں کے پاس ہی گزرا کرتا تھا۔ لہٰذا جاڑوں کی نیند میں اُن کا قیاس صحیح تھا اور وہ کروٹ بدل کر بدستور سوتے رہے مگر صبح جو دیکھا تو نرالی اپنی جگہ بندھی تھی اور نزاکت غائب تھی، میدان پر نظر کی تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، سب کے سب جمع ہو گئے نم زمین پر ایک بہت بڑے ہاتھی کے پاؤں کے نشان کے ساتھ نزاکت کے کھوج بنے ہوئے تھے اور دونوں بڑی تیز رفتار سے جنگل کی جانب گئے تھے کچھ دُور اُن کھوجوں پر چلے اور جب سب کچھ جو گزری تھی، سمجھ لی تو خاں صاحب کو بستر پر اطلاع دی کہ رات نزاکت کسی جنگلی ہاتھی کے ساتھ بھاگ گئی۔ خاں صاحب نے سر پیٹ لیا۔ پہلے اپنا فتح پوری کوڑا ہے کر پورے اسٹاف پر اکھرا ہاتھ جھاڑ دیا۔ پھر فیل بانوں اور چوکیداروں کو بوٹ کی ٹھوکروں سے مار مار کر فٹ بال بنا دیا اور دوبارہ

کوٹھے کی گردان کردی، جھاڑی اُدھیڑ کر پھینک دی۔ جب ذرا دھیمے ہوئے تو غصّے نے غم کی سی شکل اختیار کر لی۔ سو گز تک نزاکت اور اکرّا کے کھوجوں پر دوڑتے چلے گئے پھر بھاگتے ہوئے پلٹے، زور سے چلّائے "ارے حرامیو! کوئی میرا بڑا رائفل تو دو۔"

کسی کانپتے ہانپتے نوکر نے دوڑ کر رائفل دیا تو اضطراری کیفیت میں دونوں نالوں میں کارتوس بھر کے پھر کھوجوں پر لپک کر چلنے لگے جیسے یہیں کہیں سو پچاس قدم کے اندر ہاتھی نزاکت کو پکڑے بیٹھا ہے۔ پھر اُسی رفتار سے چلتے اور بڑے زور سے گالیوں کا ایک موٹا سا آبشار ہونٹوں سے بہا کر لوگوں کو ساتھ چلنے کے لیے آوازیں دی۔ اس کیفیت میں اور پھر ہاتھی مارنے کی بندوق ہاتھ میں دیکھ کر ہر شخص لرزہ براندام تھا۔ آواز کے ساتھ ہر ایک چل پڑا۔ تقریباً میل بھر چلنے کے بعد ذرا اور سکون پر آئے تو دس بارہ چیدہ چیدہ آدمی ساتھ لے لیے اور باقی لوگ واپس کر دیے کیونکہ انھوں نے کھوجوں سے رفتار کا اندازہ کر لیا۔ ہاتھی صحیح معنی میں نزاکت کو بھگا کر لے گیا تھا۔ صبح سے چل کر دو پہر ہو گئی اور وہ کھوجوں ہی کھوجوں کیمپ سے پندرہ سولہ میل دور پہنچ گئے تو انھی دور ٹانگوں کو حرکت دینے کے بعد غالباً نجیب الطرفین خاں صاحب کا دماغ کھلا اور شاید یہ سوچ کر کہ اگر مل گیا تو مارے گا کون؟ پلٹ پڑے اور واپسی میں پتہ چلا کہ اکرّا دو تین روز سے اس نواح میں دیکھا جا رہا ہے۔ مزید تحقیق کے لیے جس جگہ اکرّا کا دیکھنا دیہاتیوں نے بتایا تھا وہاں پہنچ کر کھوج بھی دیکھے تو وہ اُن کھوجوں کے بالکل مطابق تھے لہٰذا یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ رات والا ہاتھی وہی ہے جس کے کھوج دیہاتیوں نے دکھائے ہیں اور ساتھ ہی دیہاتیوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ایک دانت والا ہاتھی تھا اور اسی وجہ سے دیہات میں تھوڑا سا ہراس بھی تھا۔

اکرّا اُس وقت تک کئی خون کر چکا تھا۔ محکمۂ جنگلات والوں نے اُس کے استیصال کے احکام اُوپر سے منگوائے تھے مگر دیہات کی افواہیں دس کی نو اور نو کی ننانوے بن کر اڑا کرتی ہیں پھر یہیں جو اطلاعات ریاست کے محکمۂ جنگلات سے پہنچی تھیں وہ بھی گورنمنٹ کے محکمۂ جنگلات کی اطلاعات سے علیحدہ تھیں اور دیہاتی افواہوں کو کیا کہیں جب دو حکومتوں کے محکموں کی اطلاعات ہی مختلف تھیں لہٰذا ہماری نگاہ میں اُن کی بھی کوئی وقعت نہ رہی اور قاعدے کے مطابق شکار کو جانے سے قبل ہر قسم کی صحیح تحقیقات کر کے قدم اُٹھانا تھا۔ اب ہم سب موقع پر پہنچ گئے تھے اور نقشہ باقاعدہ جم رہا تھا۔ خاں صاحب شکار کے انتظام میں بڑے صاحبِ فن قسم کے منتظم آدمی تھے اور کیوں نہ ہوتے ساری عمر کیا ہی کیا تھا اور پھر اس وقت ان کی دلچسپی ظاہر تھی، وہ جانتے تھے کہ اب نزاکت کے ہاتھ آنے کی جبھی امید ہو سکتی ہے جب اکرّا مارا جائے لہٰذا اس شکار کا انتظام کچھ اس ٹھاٹ کے ساتھ کر رہے تھے جیسے سرکار کے ہاں وائسرائے بہادر مہمان ہوا کرتے تو ہوتا تھا۔ انھوں نے نہایت سائنٹیفک طریقے سے پروگرام ترتیب دیا اور اُسی کے مطابق انتظام کیا۔ یہ پروگرام پوری پارٹی کی مجلسِ شوریٰ نے کافی بحث و تمحیص کے بعد منظور کیا اور حسبِ ذیل قرار دادیں طے پائیں۔ ۱۔ اکرّا کی جبلّت کے متعلق کما حقہ واقفیت حاصل کرنا۔ ۲۔ افواہوں سے اہلیت چھانٹنا ۳۔ ہر وقوعے کی تحقیقات بذاتِ خود کرنا اور ہر جائے وقوعہ کا معائنہ کرنا ۴۔ اکرّا کی بازی گاہ کا صحیح تعین کرنا ۵۔ اس کے بعد اکرّا کا تعاقب کرنا اور شکار کرنا۔ اس کے علاوہ ریاست سے دو ہاتھی، چھ گھوڑے، ایک اسپورٹنگ فورڈ اور چھ ۴۰۰/۴۵۰ بور کے رائفل اور کارتوس منگانا۔

یہ اسکیم بنا کر انھوں نے بجے پور کے تقریباً تمام جوانوں کو طلب کیا۔ یہ کاشت کار تو ایسے ہی ویسے تھے مگر بہترین کھوج لگانے والے شکاری تھے اور گلہ بان اور لکڑہارے، شہد توڑنے والے کنجر پاسی اور بھیل وغیرہ نیم خانہ بدوش قسم کے لوگ تھے۔ آناً فاناً ہزاروں مربع میل پر جاسوسوں کا جال پھیل گیا۔ دوسرے ساتھیوں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ شکار کا اتنا مکمل اور محیط انتظام دیکھا۔ شکار سے زیادہ جیسے کچھ جنگ جیسا اہتمام تھا۔ ہم نے چند ہی روز میں اپنی تحقیقات مکمل کر لیں۔ افواہیں چھانٹ دیں، محکمۂ جنگلات کے کاغذات میں صحت کرائی۔ اکرّا کے خونی ہو جانے کی وجوہ بھی روشن ہو گئیں اور ہر چیز صاف ہو گئی۔ ہر جائے وقوعہ بھی اپنی آنکھ سے جا کر دیکھی۔ ہاتھی کے کھوج تو مہینوں نہیں مٹتے ہیں اکثر جگہ کھوج بھی دیکھے۔ تقریباً تمام مقتولین کے ورثا سے ملے، چشم دید گواہوں کے بیانات اکثر جائے وقوعہ پر لے جا کر لیے اور چپّا چپّا دیکھا۔

ہاتھی صلح پسند جانور ہوتا ہے یہاں تک کہ جنگل سے پکڑ کر آتا ہے پھر انسان کی خدمت اور محبت میں عمر کاٹ دیتا ہے لیکن اکرّا پیدائشی طور پر تخریب دار تھا۔ عام ہاتھیوں کی فطرت کے خلاف اُس کے اندر مار دھاڑ اور فتنہ و فساد ودیعت تھا اور اس میں اس کا واحد بے پناہ دانت اور ذرا عجیب انداز سے مڑی ہوئی ٹانگیں خاص طور پر ممد و معاون تھیں بلکہ حیوانات کی جبلّت کے ماہرین تو یہ کہیں گے کہ چونکہ وہ بے پناہ ہتھیار سے مسلح تھا اس لیے اُس کی یہ عادت ہو گئی تھی۔ غول سے علیحدہ بھی رہتا لیکن غول کا پنڈ بھی نہ چھوڑتا۔ غول کے ساتھ چلتا تو اپنی من مانی کرانا چاہتا۔ کوئی غول سے اسے علیحدہ تو کر ہی نہ سکتا تھا بلکہ جسے وہ جب چاہتا غول سے مار بھگا دیتا۔ چرائی کے وقت غول سے علیحدہ ہو جاتا اس لیے کہ وہ کاشتہ رقبوں پر ڈکیتی ڈالنے جایا کرتا اور پورا غول جنگل چارے سے پیٹ بھرتا۔ کاشتہ رقبوں پر اکرّا بڑی جلدی شکم سیر ہو جایا کرتا پھر اُدھم مچانے کے لیے غول میں آ دھمکتا۔ یہ بیچارے کہیں پیڑ، ٹانٹر، چاندر کے قطعے میں پیٹ بھرتے ہوتے یا کہیں کسی جوہڑ جھیل میں لڑ رسی کیسر سے منہ مارتے ہوتے ورنہ کہیں برگد، پیپل، پاکھر وغیرہ جنگلی درختوں کے جھنڈ میں شاخ شاخ توڑ کر اور محنت کر کر کے آہستہ آہستہ کھانے ہوتے لیکن اکرّا جتنے فسادی واقع ہوئے تھے، اتنے ہی کام چور اور حرام خور بھی تھے۔ لڑائی جھگڑے ہیں تو صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک جٹ کر خون پسینہ ایک کر سکتے تھے مگر جنگل چارہ توڑ کر اور بنا سنبھال کر کھانا اپنے بس کا روگ نہ تھا۔ محنت سے بیر تھا۔ چرائی کے لیے آپ کاشتہ رقبوں کا رُخ کرتے، جہاں مال ہی مال پھیلا ہوتا ہے اور محنت کے بغیر سب کچھ ہاتھ آتا ہے۔ ہرے بھرے میٹھے میٹھے شاداب گنّے، دودھ دہی بھرے گیہوں، جو، سوندھے سوندھے چنے، نرم نرم مٹر، خوشبودار دھان، میٹھی میٹھی جوار باجرہ، پھر جہاں کہیں

سب تلک

بھی ہاتھ ڈال دو جھر ابھی بجھا پڑے بھر بھر منہ کھائے چلے جاؤ، نہ توڑنا اکھیڑنا چھپنا صاف کرنا، نہ تلاش کرنا، اس حرام خوری اور چوری کی عادت نے چوڑرا، نیت خراب اور پیٹو بھی بنا دیا تھا۔ کھڑا لقمہ عمر بھر حلق سے اترا ہی نہ تھا، جنگلی چارہ اچھی طرح پہچانتے ہی نہ تھے اور چونکہ تر مال آسانی سے مل جایا کرتا تھا لہٰذا کھایا بھی پیٹ سے اوپر جاتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ اس تر مال اور نرم چارے کے ساتھ جو قیا جنیں لگی ہوئی تھیں وہ آپ کی اضافی غذا تھیں۔ کبھی کبھی راستوں پر ڈھکے ہوئے گڑھے اگر جا پڑو تو زندہ در گور ہو جاؤ۔ اگرچہ یہ محکمۂ جنگلات کے قانون کے خلاف تھا پھر بھی کاشت کار پریشان ہو کر کبھی کبھی کھود دیا کرتے تھے۔ پگڈنڈیوں اور چوراہوں پر تیز نوک والے لوہے کے کانٹے جو اگر تلوے میں چبھ جائیں تو کھڑے کھڑے سوکھ کر رہ جاؤ، پھر آدمیوں کی تاڑیں اور کہیں کہیں سیاخوں کی آوازیں، کتوں کی چیخیں، ڈھول تاشے اور کنستروں کا شور اور تمام ہائے ہائے میں اسے مزا آتا سچ پوچھیے تو جس دن یہ ہائے ہائے اور شور و شغب نہ ہوتا اور کسان غافل ہو جاتے اس دن ڈنر میں بھی آدھا لطف رہ جاتا پھر وہ اس کی کمی پلٹ کر غول میں پوری کرتا اور چھوٹا بڑا کوئی ایک بھی اس کی ایک آدھ جھڑپ سے نہ بچتا اگر کہیں فرصت کا احساس ہوتا تو دو مواقع پر ایک تو جب پورے غول کی عام گوشمالی کر کے کیڑے مکوڑوں کی طرح ایک ایک کو بکھیر دیتا اور اس سے زیادہ جب اپنے پاؤں کی روندی ہوئی فصل پر ذرا مڑ کر نظر کرتا اور چرتے ہوئے وہ اس سلسلے میں مخصوص انداز کے ساتھ ذرا گھسیٹ کر قدم ڈالتا اور ایک لقمہ چبانے کے دوران میں چار گٹھے اکھیڑ کر ادھر ادھر پھینکتا جاتا، پھر بھانپ کر کھیت کے بہتر سے بہتر حصے کی جانب رخ کرتا۔ ریاست رام پور اور ضلع نینی تال کی بین جا بجا جھیلوں میں بسنے والے کسان آپ کے اوصافِ حمیدہ سے اچھی طرح واقف تھے، بچہ بچہ آپ سے غائبانہ متعارف تھا اور بعض کو شرفِ دیدار بھی حاصل ہو چکا تھا۔ ہر شب کبھی نہ کسی کی کشتِ امید پر برقِ خرمن سوز بن کر آں جناب کا ورودِ سعید ہوتا اور بس ایک ہی تشریف آوری میں اس بدنصیب کے گھر میں سال بھر کے لیے قحط ڈال جایا کرتے۔ یہاں تک کہ ایک رات آپ نے پرانی ضرب المثل سچ کر دکھائی یعنی گنا لیتے لیتے واقعی بھیل رے لی۔ ہوا یہ کہ ایک وسیع گنے کے رقبے پر کھاتے کھیلتے، کچلتے، اکھیڑتے پھینکتے بڑھتے بڑھتے آپ کولھو کی جھونپڑی تک پہنچ گئے۔ پیٹ بھرا تھا اور طبیعت یوں بھی جولانی پر تھی۔ پہلے اچھی بھلی جھونپڑی دیکھ کر تنکا تنکا بکھیر دینے کو جی چاہا۔ ایک ڈگ بڑھا کر کچھ ٹھٹک گئے۔ بڑی خاص خوشبو آ رہی تھی ویسے یہ کبھی کبھی کاشت رقبوں کی جانب سے ہوا میں آتی ہوئی سونگھی تو تھی لیکن مزے سے آشنا نہ تھے لیکن اس وقت تو یہ بالکل قریب تھی، اکڑا کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے مگر اتنا ضرور سمجھ گئے کہ ہے کوئی زوردار مال، ذرا اور بڑھے۔ آپ کے منہ میں پانی بھر آیا ایک ڈگ اور ڈالی۔ کیسی اچھی، کتنی پیاری خوشبو ایک دھچکا سا لگا کیسی مست لپیٹ آئی، کیسی شیریں۔ وہ تو بے خود سے ہو گئے اور سونڈ جھونپڑی کے اندر ڈال کر نیچے ہوئے پیال کا جائزہ جو لیا تو نوک فوراً صحیح جگہ پہنچ گئی اور وہ مال پھانس لائی۔ ابھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے قبل کسان گڑ بنا کر گئے تھے۔ وزن زیادہ تھا اور آدمی کم لہٰذا آدھے

بھیلیاں یہیں پیال میں دبا کر چھوڑ گئے تھے۔ اکڑا کی زبان شیرینی سے نو آشنا تھی لیکن زیادہ سے زیادہ گنے کی ایسی ٹھوس بے لاگ نرم اور زود ہضم، جتنی چیزیں آج تک کھائی تھیں سب کا مزا بھول گیا۔ یہ تو حلوہ بے دودھ تھا، ایک ایک کر کے سونڈ میں پکڑ پکڑ کھاتا رہا، پہلے نوالہ اٹھاتے وقت سونڈ کی نوک ہر بھیلی پر چھوتے ہی شامہ کے ذریعے شیرینی کا احساس رگ و پے میں ایک عجیب لپک کے ساتھ لہرا جاتا، پھر نوک دار ہونٹ بڑھ کر استقبال کرتا، نیچے سے چپ کر کے زبان اچھلتی، اوپر سے جیسے تالو بڑھتا اور پیچھے سے حلق غپ سے لپکتا اور داڑھوں بیچاریوں کو تو مشکل چکھنے کی نوبت آتی کہ پوری بھیلی غٹ سے اتر جاتی۔ ایک ایک کر کے آٹھوں لقمے ذرا سی دیر میں اتار گیا۔ ننھی ننھی متلاشی سی آنکھیں جو ہمہ وقت گھومتی رہا کرتی تھیں مچ سی گئیں، تنکا سے کان ٹھہر گئے، مسلسل لہراتی سونڈ لٹک گئی، پاؤں بھاری بھاری سے اٹھنے لگے۔ زبان نے ہونٹ اور سونڈ کی نوک اچھی طرح چاٹ کر صاف کر دی۔ پھر بھی چاشنی رہی بس۔ سیر گر پیٹ میں بھرے اکڑا شاید عمر میں پہلی مرتبہ اچھے موڈ میں چل پڑا۔ آج واپسی میں نہ تو فصل کچلی نہ پیٹ بھر کر جیسا کہ ہمیشہ اس کا طریقہ تھا لڑنے کے لیے غول کی جانب لپکا۔

آج نہ معلوم کون سے کونے کھدرے سے شرافت سی جھلک اٹھی۔ گنے کے رقبے کے اختتام پر میدان تھا اور پھر جنگل کا سلسلہ تھا۔ پورب میں ایک جوہڑ پر غول جمع تھا سب کے سب لمبی لمبی کیسر کی جڑیں اور نرسل کی بوندیاں اکھیڑ اکھیڑ اور دھو دھو کر کھا رہے تھے۔ اکڑا نے ادھر سے گردن موڑ لی پھر شمال کی جانب رخ کر دیا۔ آج اس کے اندر ساتھیوں کی بو اور آوازوں سے بھی لڑنے کی پھریری نہ آئی۔ تازہ گڑ کی ہلکی گرمی آہستہ آہستہ رگ و پے میں اتر رہی تھی اور حرارتِ غریزی ابھار رہی تھی۔ زبان ابھی تک ہونٹ چاٹ رہی تھی۔ پہاڑی ہوا کے رخ پر آٹھ میل چل کر ایک چھوٹے سے گہرے تالاب پر پہنچا۔ خلافِ عادت آدھی رات کے وقت پانی میں گھس پڑا صبح تک تیرتا رہا۔ فوارے اچھالتا رہا اور تمام رات وہ اودھم جو غول میں ساتھیوں کے ساتھ مچاتا تھا تالاب کے پانی کے ساتھ مچاتا رہا۔ دن نکلے خوب نہایا دھویا چمکتا ہوا کنارے پر آیا اور سونڈ میں چکنی دلدل بھر بھر کے سر سے لے کر پاؤں تک دبیز تہہ لپیٹی اور گھنے جنگل کی جانب چل دیا۔ تمام دن گھنے سایہ دار درختوں کے سائے میں نم زمین پر پڑا سوتا رہا۔ غروب

آفتاب سے ذرا قبل اُٹھا، قریب کے جوہڑ سے تازہ کیچڑ اچھی طرح لپیٹی اور مغرب تک وہیں پانی اور کیچڑ سے کھیلتا رہا اور چرائی کے وقت سیدھا رات والی جگہ کی جانب رُخ کر دیا اور فصل کا ایک تنکا بھی چھوئے بغیر سیدھا جھونپڑی پر جا دھمکا۔ کل والی خوشبو ہلکی ہلکی رچی ہوئی تھی۔ کل کی طرح پھر اندر سونڈ گھمائی مگر "ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے" تمام پیال اُلٹ کر پھینک دیا، پھر دونوں چاکوں پر ٹٹولا، یہاں خوشبو بہت نمایاں تھی مگر بس نری خوشبو ہی خوشبو، مال کچھ نہیں تھا۔ بڑی باریکی کے ساتھ چاک پر ٹٹولتے ہوئے کہیں سونڈ کی نوک میں چنے کے برابر ایک دو ٹکڑے گڑ کے پھنسے۔ انھیں منہ میں رکھا تو نہ معلوم کہاں چلے گئے۔ چاکوں سے ہٹا کر کڑھاؤ کا جائزہ لیا، خوشبو اُس کے اندر بھی بھرپور رچی ہوئی تھی مگر ٹھنڈے لوہے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پلٹ کر کولھو کی جانب رجوع ہوا۔ پہلے بیلن ٹٹولا، پھر ناند کے اندر سونڈ گھسیٹ کر خوب پھراتا رہا، خوشبو ہی خوشبو اور کچھ نہیں۔ اب کھسیانا سا ہو گیا اور حرامی طبیعت بروئے کار آ گئی۔ پاؤں بڑھا کر ذرا جو اشارہ دیا تو ڈیڑھ گز گہرا زمین کے اندر گڑا ہوا کولھو اکھڑ کر جا پڑا۔ کڑھائی اُلٹ دی اور بھٹی توڑ دی، دونوں چاک توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیے۔ جھونپڑی کے پھونس کا تنکا تنکا بکھیر دیا، چھپت کی دیوار ڈھا دی اور تھونیاں اکھیڑ اکھیڑ کر دور پھینک دیں۔ پیٹ میں بھوک تھی اور مٹھائی پر ہاتھ خالی جانے کا جھونجل۔ گنے کے رقبے پر کھسیا کر جو پھیلا تو خیر کھایا تو آٹھ دس ہی من مگر ایکڑوں تاراج کر کے پھینک دیا۔ پچھلی رات تک پیٹ بھر کر غول میں جا پہنچا، پہلے سب سے بڑے سردار کو چیلنج کیا۔ وہ غریب اپنی آبرو لے کر اور طرح دے کر ایک جانب ہٹ گیا مگر ہٹتے ہٹتے وقت انداز سربلندی کا رہا۔ بھلا اکڑا اسے برداشت کر سکتا تھا؟ ایک جھڈ مار کر اور ذلیل کر کے ہی چھوڑا۔ پھر دوسرے چودھری کو انتقاماً گرج کر مخاطب کیا۔ وہ بہتیری صلح اور پیار کی آوازیں نکالتا رہا مگر ایک نہ سنی اور بھڑ ہی گیا۔ بوڑھا چودھری کنی کاٹ گیا اور طرح دے کر مقابلہ بچا گیا۔ ایک چھوٹے سے ایک نوجوان منھنی کو ذرا مذاق میں چھوڑ دیا۔ اُس نے ناز کے ساتھ کہیں شوں کر دی اور آپ نے چھوکر کو بڑی تیز ڈانٹ بتائی۔ اُس کی شامتِ اعمال، چودھری اور سردار کی طرح بھاگ جاتا تو کیوں گت بنتی مگر منھنی سے مذاق والی بات تھی اور بنا پھرتا تھا خون اور پھر وہ ایک ادا کے ساتھ پہلو میں بھی چل رہی تھی۔ بات ذرا دوسری ہو گئی اور زیادہ ہمت نہ پڑی۔ سو غیرتِ حمیت میں ذرا غصے میں جھرجھری سی لے کر جہاں کا تہاں اینٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بھلا اکڑا میں اتنی تاب کہاں تھی، بس پھیل پڑا۔

بیچارہ لڑکا ایک جھڈ کی بھی تاب نہ لا سکا۔ ایسے موقعوں پر اپنی عزت اپنے ہاتھ، ہاتھی تو غول میں سے کوئی بیچ بچاؤ کو آتا ہی نہ تھا کیونکہ جو بیچ بچاؤ کو آتا یہ اسے چھوڑ کر اُس سے بھڑ جایا کرتا۔ جب دیکھا کہ لڑکا غریب اب کی جھڈ میں زمین پر جا پڑے گا تو ہتھنیوں نے چیخ چیخ کر دہائی دی: "ہیں ہیں، بچہ ہے، بچہ!" دو ایک بڑی بوڑھیاں درمیان میں آ گئیں تو خدا خدا کر کے جان بچی، دو دو دھکے ان بیچاریوں کو بھی لگ گئے اور سرِ شام کے برگد کی شاخوں پر جھٹے ہوئے غول کا ابھی بمشکل آدھا پیٹ بھر پایا تھا کہ یہ فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کھانے کا خون ہو گیا۔ یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔ پورے غول کا ہر فرد طرح دے کر ہر روز معرکہ آرائی بچایا کرتا تھا اور تقریباً ہر کھانے کے وقت اکڑا رنگ میں بھنگ ڈال دیتا تھا۔

دوسری شام اکڑا کا مقدر بدلنے کی شام تھی اور خود اُس کی اور اُس کی بازی گاہ میں بسنے والے آدمیوں کی تقدیر میں ایک نیا باب کھلا۔ اخیر رات غول میں فساد پھیلا کر اور مار دھاڑ کر کے جب ذرا طبیعت ہلکی ہوئی تو اکڑا صبح نکلتے اُن سب کو چھوڑ کر پانسی کے قطعے میں ایک دلدل پر آ پڑا اور کبھی کنارے اور کبھی ذرا اندر بڑھ کر کیچڑ سے شغل کرتا رہا اور آج شام وہ جلدی اُٹھ کھڑا ہوا۔ سونڈ گھما کر دیکھا تو جدھر رات گیا تھا اُدھر سے ہوا چل رہی تھی لہٰذا اُدھر کی تو کوئی خبر نہ ملی لیکن بدل کر ہوا دوسرے گنے کے رقبے کی جانب سے آ رہی تھی اور بڑی زوردار مست میٹھی خوشبو سے بھری ہوئی تھی اگرچہ نہ چرائی کا وقت ہی ہوا تھا، نہ اکڑا کے پیٹ میں بھوک ہی پوری طرح بیدار ہو پائی تھی لیکن تیز منتشی خوشبو نے ذکی الحس شامہ سے ٹکرا ٹکرا کر پیٹ کے اندر بھوک بھی بھڑکا دی اور منہ میں پانی بھی بھر آیا۔ بُرا ہو اس مٹھائی کی کشش کا، وہ تو خیر حیوانِ مطلق تھا۔ اشرف المخلوق انسان تک اُس کی لاگ پر کبھی کبھی عزت تک بھینٹ چڑھا بیٹھتا ہے اور اتنی مست خوشبو پر پیٹ کے اندر بھوک ہونے اور چرائی کے وقت کا کیا سوال تھا۔ دو میل کا فاصلہ اکڑا جیسے دو ڈگوں میں لپیٹ کر گنے کے چک پر پہنچ گیا۔ محسوس تو شروع ہی سے کر رہا تھا، یہاں پہنچ کر گہرے قسم کی مانس گندھ خوشبو کے ساتھ لگی ہوئی پائی مگر وہ خوشبو کے بے پناہ سحر میں ایسا بے خود تھا کہ پروا نہ کی اور فطرت کے خلاف بڑھتا چلا گیا البتہ رقبے کی حدود میں اُس نے بڑے سبک قدم ڈالے اور کھڑی فصل میں کھٹکا کرتے ہوئے چلنے کے بجائے مینڈھوں اور پگڈنڈیوں پر ہوتا جبلت کے خلاف چور کی طرح خوشبو کی جانب بڑھا۔ رقبے کے بیچوں بیچ کولھو کی جھونپڑی تھی۔ رس پک کر گڑ کے قوام پر آ چکا تھا اور کسان کاٹھی ڈنڈی والے لوہے کے کفچوں کے ذریعے یہ خوشبودار آتشِ سیّال کڑھائی سے بھر بھر کر نالے پر ڈال رہے تھے اور یہ لاوے کی طرح بہہ بہہ کر برابر لگے ہوئے مٹی کے چاکوں پر پھیل رہا تھا۔ دو چاک بھر چکے تھے اور اُن کی سطح پر ہوا لگنے سے پتلی پپڑی جمنا شروع ہو رہی تھی مگر پپڑی کے نیچے وہی پرانی مار کے لاسے جیسا چیپ دار لاوا بھرا ہوا تھا جو تپتی ہوئی کڑھائی سے بجبڑ بجبڑاتا ہوا بہہ کر آیا تھا۔ کسان منتظر تھے کہ ٹھنڈا ہو کر ذرا سختی آنا شروع ہو تو لکڑی کی ڈوئیوں سے متھ کر بھیلیاں باندھ لیں۔ یہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے یوں ہی چاک پر پڑا رہنے کے بعد ٹھنڈا ہو کر گڑ بندھنے کے قابل ہوتا ہے اور کڑھائی سے چل کر اور چاک تک پہنچ کر ٹھنڈا ہونے تک میلوں جنگل مست و شیریں خوشبو سے مہکا دیتا ہے۔ ہاتھی کے چلنے میں یوں بھی چاپ نہیں ہوتی اور پھر اکڑا ذرا احتیاط کے ساتھ دبے پاؤں پگڈنڈی پگڈنڈی آیا، ایک دم جھونپڑی کے سامنے نمودار ہو گیا۔ کسانوں میں بھاگڑ پڑ گئی، مزید اُس نے مانس گندھ کو نفرت کے ساتھ شوں کر کے اپنے شامہ سے جھاڑا۔ ہر کسان اپنی جگہ سے اچھل کر جا پڑا اور اکڑا نے اندھلا کر پگھلے ہوئے سیسے کے درجۂ حرارت والے قوام پر اندھا دھند سونڈ ڈال دی۔ ڈھائی سیر قوام نے سونڈ کی نوک پکڑ ہی تو لی، پھر اندر پھوٹ اٹھی اور

ملتے ہی فطری طور پر سونڈ منہ میں دبالی اور جب وہاں زبان اور ہونٹ کو چینکا لگا تو بڑے زور سے غیر اختیاری طور پر جھٹک کر فوام چھڑانے کیلیے سونڈ کو ایک شدید لہرا دیا۔ ایک شامت زدہ کسان جو ذرا کڈھب بیٹھا ہوا تھا فرار ہونے میں کم بخت پیچھے رہ گیا۔ اُس نے چاکوں کے اُدھر والے سرکے سے جست لگائی ادھر سے لہراتی سونڈ کا مہیب گھونسا تڑپ کے گولے کی طرح دھم سے چھاتی پر پڑا۔ آواز بھی نہ نکل سکی اور ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اکڑا کو ہوش بھی نہ رہا، سونڈ کی نوک، ہونٹ، زبان، تالو بلکہ جبڑے اور حلق تک سب کا سب جھلس کر رہ گیا۔ آنکھیں بند کر کے جدھر منہ تھا ادھر ہی بھنا کر بھاگ پڑا۔ رقبے سے باہر ہو کر نہ کچھ کرنے بن پڑی نہ ہمت ہی کی اٹکل رہی آٹھ دس میل پوٹد ملو ڈرنے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو اسی پانی کی گہری جھیل پر پایا جس پر پہلی مرتبہ گڑ کھا کر تمام رات کھیلتا رہا تھا۔ آگ کے ردِ عمل میں جس لیے پانی پر لے گئی مگر یہ جلے ہوئے کا علاج نہیں بلکہ مضر ہے لیکن اُس نے پہلے تو سونڈ اور پھر جبڑا تک پانی میں ڈال دیا اس سے خیر اور کچھ نہیں تو یہی ہوا کہ وہ فوام جو ابھی تک اپنا کام کر کے زخم اور گہرے بنا رہا تھا، ٹھنڈا ہو کر دھل گیا۔ سونڈ پر گلگلے سے آبلے، زبان، تالو پر ہتھیلی ہتھیلی اور روپے روپے برابر زخم حلق اور مسوڑے ادھڑے ہوئے اکڑا کے لیے پیٹ میں کچھ پہنچانا عذاب ہو گیا۔ پہلے سونڈ کی نوک گویا ہاتھ ہی کام نہ دیتا تھا، خیر اگر مشکل آبلے بچا کر کسی ترکیب سے کوئی نرم چارہ پکڑ بھی لیتا تو کھاتا کون؟ منہ اندر سے بُری طرح گھائل تھا خیر دو دن تو غصے، ہیجان اور تکلیف کے مارے بھوک ہی نہ لگی اور اسی تالاب کے اِرد گِرد مڑتا جھومتا رہا۔ کبھی پانی میں، کبھی کیچڑ میں اور کبھی باہر گھاس پر۔ مکھیوں نے پریشان کیا۔ سونڈ پانی میں ڈبو دی، پانی آبلوں اور زخموں میں لگا تو لوکھلا کر کیچڑ لپیٹ لی۔ مٹی نے کاٹ کیا تو پھر پانی میں دھو کر صاف کر لیا اور اس رستخیز میں سونڈ کے آبلے بھی زخم بن گئے اور اندمال مشکل ہو گیا کیونکہ زخمی سونڈ اور منہ سے تھوڑا بہت نرم کونپلوں کے پیٹ میں پہنچانے کا کام لیا جاتا تھا۔ سب کھانی پی نکل گئی اور ساری بہادری گرد ہو گئی۔ گنے کے رقبوں کا بھی راستہ بھول گیا اور گیہوں چنے جو کے چکوں کا رُخ بھی یاد نہ رہا۔

ہاتھی جتنا حلیم الطبع اور صلح کل ہوتا ہے اُتنا کینہ پرور اور منتقم بھی ہوتا ہے۔ پھر لونڈوں کے بگڑے اور مادر زاد بدمعاش اکڑا تو جلنے کے بعد کہنا ہی کیا تھا۔ آدمی کی بُو اور گڑ کی خوشبو ساتھ ساتھ تھی اور وہیں یہ چرکا لگا۔ یہ چیز دل کے اندر بیٹھ گئی کہ آدمیوں نے گڑ لوٹنے کی پاداش میں مجھے جلایا ہے کیونکہ غول سے نکل کر کاشتہ رقبوں میں جا کر چرنے کا احساسِ جرم ایک مجرم کی طرح پہلے ہی سے شعور میں جاگزیں تھا لہٰذا یہ چیز راسخ ہو گئی اور شرِ طبیعت میں آدمی کی دشمنی بڑی شدت کے ساتھ داخل ہو گئی اور یہاں سے اکڑا کا مقدر پلٹا اور کئی آدمیوں کی قضا آئی۔ اُس وقت دنیا کے ہر قانون کا فتوا اکڑا کے قتل کے حق میں تھا اور اکڑا ہر انسان کا جانی دشمن تھا اور بدلہ لینے میں اپنے پندار میں حق بجانب لیکن یہ تو جانور تھا، انسان کے قانون کا تجربہ اتنا شدید ہے کہ اپنے ہم جنس پر ذرا بھی رحم نہیں کرتا بڑی جلدی خونی قرار دے کر اکڑا کے استیصال کے احکامات محکمہ جنگلات والوں نے

سیانا کہتا ہے

قیصر سلطانہ ملک

★ باز کے پیچھے اُڑنے والی گوریا سمجھتی ہے کہ باز اُس سے ڈر کر بھاگ رہا ہے۔
★ کفایت شعار بیوی تلاش کرنے میں سو جوتے بھی گھس جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔
★ سڑک کے کنارے کا درخت اگر بادام سے لدا ہوا ہے تو بادام کڑوے ہی ہوں گے۔
★ مُرغے کے بجائے مُرغی بانگ دینے لگے تو ڈربے میں امن نہیں رہ سکتا۔
★ سوئی کے چھید سے سارا آسمان نظر نہیں آتا۔
★ سانپ کو بانس کی نلی میں بھی رکھو تو وہ ٹیڑھا ہی چلے گا۔
★ آدمی کے لیے اُس کا نام اور شیر کے لیے اُس کی کھال بیش قیمت ہوتی ہے۔
★ سونا چرانے والے کو جیل کی سزا ملتی ہے اور مُلک چرانے والا تخت و تاج پاتا ہے۔

جاری کر دیے اور جیسا کہ محکموں کی کارروائیوں میں ہوا کرتا ہے ملرنے کے انتظامات بھی ہونے لگے کیونکہ زود یا بدیر اکڑا کو مرنا ہی تھا۔

گرم گڑ والے حادثے کو تیسرا ہفتہ ختم ہو چکا تھا کئی مرتبہ اکڑا کے زخموں کے انگور پھٹ پھٹ کر مائل بہ اندمال ہو چکے تھے اور دو تین روز سے نرم نرم کونپلیں ذرا حلق سے اُترنے لگی تھیں اور شام سے پھول پھول کر صبح تک آدھا تہائی پیٹ بھر ہی جاتا تھا لیکن وہ رنگ نہ رہا تھا اور کوئی نرم فصل کھیتوں میں بھی نہیں تھی ورنہ کیا باز آتا۔ سرِ شام سے برگد اور پیپل پاکھر کے جھنڈوں میں گھس جاتا اور نئی نئی کونپلیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور منہ کے اندر آہستہ آہستہ پھول پھول کر آدھا تہائی پیٹ بھر لیتا۔

صبح ہو چکی تھی، رات کی چرائی میں کونپلیں بھی اچھی ہاتھ آ گئی تھیں اور سونڈ اور منہ نے بھی بہتر کام دیا تھا، آج مدتوں بعد وہ ذرا شکم سیر ہوا تھا۔ پیپل اور برگد کے جھنڈ سے نکل کر وہ جھاڑی دار میدان کے قریب کھڑے ہوئے ایک ہلدو کے درخت کے نیچے لیٹا ہوا گھوما کر رہا تھا۔ کبھی ایک پہلو نکلتے ہوئے سورج کے سامنے کر دیتا اور کبھی دوسرا۔ کبھی بالکل چت ہو کر دم سے لے کر سونڈ کی نوک تک لمبا لمبا پورا پیٹ، سینہ اور اپنے ہونٹ اور زبان جسم کا تمام زیریں حصہ سورج کی کرنوں کے رُخ کر دیتا، کبھی اُلٹ کر جیو نراسی پیٹھ پورب کے رُخ پھیر دیتا۔ دو مینائیں اِدھر سے اُدھر جسم پر پھدک رہی تھیں اور جوئیں اور کلیاں چن رہی تھیں۔ جلنے کے بعد آج پہلی مرتبہ اسے فراغت اور تن درستی کا احساس ہوا تھا۔ جسم میں چستی دوڑانے والی پچھوا ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں میں سونڈ گھما کر اکڑا چونکا۔ گڑ کی گہری خوشبو اور ساتھ ہی ساتھ ہلکی ہلکی مانس گندھ تھی۔ اوّل الذکر تے ضرور اُس کے محسوسات بہائے مگر آدمی کی بُو پر تو وہ غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا اور ایک جھرجھری سی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اگرچہ تکلیف اور فاقوں نے ڈھیلا سا کر دیا تھا مگر اس دو ٹانگ کے مٹھی بھر دشمن کے لیے تو اب بھی بہت تھا اور پھر غصہ اور ہاتھی کا غصہ؟ پہاڑ

اُلٹ دینے کی سوچتا تو بھی کم تھا مگر ساتھ ہی ساتھ مٹھائی کی گہری خوشبو اُس کی آتشِ غیظ و غضب پر بڑا خوش گوار چھینٹا سا مارتی اور وہ مثبت و منفی جذبات میں زیر و زبر، مٹھائی کی خوشبو اور دشمن کی بدبو کے رُخ پر لپکا۔ ایک ڈگ غصّے میں بھرتا، دوسرا قدم اشتیاق میں ڈالتا۔ جب ذرا کان لگائے تو دشمن کی آواز بھی سنائی دی جو ٹھیر ٹھیر کر بلند ہوتی تھی۔

کیسر سنگھ برہمن نے اپنی بیس من گڑ کی بھری گاڑی پہر بھر رات سے جوڑ دی تھی اور منڈی کی طرف لے جا رہا تھا۔ اُس کا بڑا بھائی دن نکلے گھوڑی پر سوار ہو کے پیچھے پیچھے آنے والا تھا اور گھوڑی اور بھینسوں کی رفتار کے مطابق دونوں بھائیوں کا ایک ساتھ منڈی میں پہنچنے کا پروگرام تھا۔ کیسر سنگھ کی گاڑی میں دو بھینسے جُڑے ہوئے تھے اور ایک بیل فاضل آگے جُڑا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر راستے کے اندر کیچڑ تھی۔ پہیا بیٹھ گیا اور کیسر سنگھ کی ہشکاریوں اور ڈانٹوں کے باوجود تینوں جانور ٹس سے مس نہ ہو سکے۔ وزن دار گاڑی پھنس کر رہ گئی اور جب کیسر سنگھ نے ایک مرتبہ منہ اُٹھایا تو اکڑا کو غصّے میں بھر کر اپنے اُوپر بڑھتے دیکھا جس کی خبر تمام علاقے میں تین ہفتوں سے گشت کر رہی تھی۔ دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اکڑا کے تمام زخم پھر سے جل اُٹھے پھر بڑے زور سے جیسے پیٹ کی بھٹی کے اندر پکتے ہوئے گڑ کی کڑھائی بھڑ بھڑا اٹھی۔ گاڑی میں بھرے ہوئے گڑ کی خوشبو اُس کے مقابلے پر محو ہو کر رہ گئی۔ کیسر سنگھ بڑا پھرتیلا، ذہین اور ٹھنڈے مزاج والا نوجوان تھا اور اَن پڑھ دیہاتی ہونے کے باوجود موقع شناس اور مستقل مزاج تھا۔ پہاڑ پیکر ہاتھی کے رُعب میں لپٹنے اُوپر موت کو جھپٹتے دیکھ کر وہ گھبرایا تو بہت مگر اُس نے اوسان برقرار رکھے۔ ایک گہری نگاہ جائے پناہ کی تلاش میں ماحول کے اندر گھمائی اور ایک جانب رُخ کر کے اور جیسے کوئی منزل ذہن میں لے کر بڑی بندھی ہوئی رفتار میں بھاگ پڑا اور اکڑا پیچھا چھڑا نہ جانے والی توپ کی صورت سونڈ سیدھی کیے جرمنی ساخت کے ٹینک کی طرح تعاقب میں چلا۔ شاید پندار میں یہ لیے ہوئے کہ شکار جائے گا کہاں نکل کے؟ اگر درخت پر بھی پناہ لے گا تو ایک اشارے میں نیچے گرا لوں گا اور کیسر سنگھ کو بھی دشمن کی ٹکر کے مقابلے پر ان بڑے بڑے درختوں کے پائے استقامت کا خوب اندازہ تھا لہٰذا وہ چھوٹے بڑے سال اور ہلدو کے درختوں سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ کتنا ہی تیز دوڑنے والا کیوں نہ ہو مگر آدمی کی رفتار اور ہاتھی کے ڈگ کا کیا مقابلہ؟ تین سو گز کے اندر ہی اکڑا نے جا لیا اور جب فاصلہ اور کم ہوتا نظر آیا تو کیسر سنگھ نے دوڑتے دوڑتے ایک بل سا کھا کر لکڑی کی سی ایک دھجّی جوڑ دی تو اکڑا میں اور اس میں بیس گز کا بُعد تو فوراً پڑ گیا اور اگرچہ ہاتھی مڑتے ہوئے لٹّو کی طرح ناچ جاتا ہے پھر بھی کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو، بھاری جسم سنبھال کر جب پھر تعاقب میں سیدھا ہوا تو یہ فاصلہ تقریباً سو گز ہو گیا تھا مگر فراٹے منٹ ہی بھر کے اندر یہ فاصلہ بھی اکڑا کے ڈگوں نے ہڑپ کر لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد کیسر سنگھ کو اپنی پشت پر شُوں شُوں سنائی دی پھر بھی اس نے اوسان نہ کھوئے اور جب غصّے میں سونڈ سے نکلتے ہوئے کف کے چھینٹے کانوں پر پڑے اور جیسے گرم گرم سانس کنپٹیوں پر لگی اور منزلِ مقصود پچاس گز رہ گئی تو کیسر سنگھ نے بھاگتے بھاگتے اپنی پگڑی پر ہاتھ مارا۔ اِدھر پگڑی سر سے اچھل کر گری اور اُدھر جیسے پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے ٹینک میں ایک دم بریک لگا اور اکڑا پگڑی کے ساتھ غٹ پٹ ہو گیا اور شاید ہزاروں سال قبل کسی زبردست طوفان یا مہیب زلزلے کے بہانے کیسر سنگھ کی جان بچانے کے لیے سامنے کی پہاڑیوں سے لوٹ کر یہ کڈھب، ننگی، سخت چٹانیں اس ہرے بھرے جنگل کے درمیان آ پڑی تھیں اور جب سے آج تک کیسر سنگھ کو پناہ دینے کے لیے اپنی سنگین آغوش کھولے منتظر تھیں جنھیں گاڑی سے بھانپ کر کیسر سنگھ دوڑا تھا۔ اطمینان کے ساتھ دشمن کو پگڑی پر بھڑا کر کیسر سنگھ نے چٹانوں کو جا لیا۔ مستعدی کے ساتھ کچھ جھاڑیوں کا سہارا لیا، کچھ نیچے پڑے ہوئے ذرا بڑے بڑے پتھروں پر مضبوطی کے ساتھ پاؤں جمائے، اُوپر ہاتھ بڑھا کر چٹانوں کی نکلی ہوئی نوکیں پکڑیں اور ایک بندر نما جست جو لگائی تو کیسر سنگھ عزرائیل کی زد سے باہر تھا اور دو تین گز اونچائی کی بلندی پر چٹانوں کی نکلی ہوئی چوٹیوں کے درمیان ذرا سے نشیب میں دبک گیا، جہاں سے نہ دکھائی پڑ سکتا تھا اور نہ سنگھائی دے سکتا تھا کیونکہ بلندی پر بھی تھا اور دبکا ہوا بھی تھا۔

پگڑی کی دھجیاں اُڑا دینے اور آدمی کی بو اچھی طرح تہس نہس کرنے کے بعد اکڑا کا دل بھلا نہ ہوا اور جب وہ پگڑی والے کو کچلنے کے لیے بڑھا تو چکّر میں پڑ گیا۔ اس چٹان پر اُس نے اپنی آنکھ سے آدمی کو چڑھتے دیکھا تھا مگر اب نہ آدمی نظر آتا تھا نہ بو سونگھنے میں آتی تھی۔ وہ غیظ میں چٹان کی جانب جھپٹا اور طواف کرنے لگا، اُوپر پہنچنے کا کہیں ڈھب تھا، جب کچھ نہ ملا تو پھر ہوا میں سونڈ گھمائی، آدمی کی بُو تو نہیں، ہاں گاڑی سے مٹھائی کی بھینی بھینی خالص خوشبو آ رہی تھی، بالکل راہِ راست پر آ گیا اور گاڑی کی جانب لپکا۔

بیل نے جو اس طرح مست ہاتھی کو اُوپر بڑھتے دیکھا تو بھڑک کر ایک جست لگائی، جن رسّیوں سے دونوں بھینسوں کے آگے جُڑا ہوا تھا وہ ٹوٹ گئیں اور بیل بھاگ کھڑا ہوا مگر بھینسے غریبوں کی گردنوں پر تو بھاری جوا رکھا ہوا تھا اور مضبوط جوت لگے ہوئے تھے۔ بیچارے ہر چند اینٹھ اینٹھ کر زور لگاتے رہے کہ آزاد ہو کر اپنے بھائی بیل کی طرح ہم بھی فرار ہو جائیں مگر ٹس سے مس نہ ہوئی اور جہاں کے تہاں پھنسے رہے۔ اکڑا نے پہلے مٹھائی کا جائزہ لیا اور جب ٹٹولتی ہوئی سونڈ گاڑی کے اگلے حصّے پر پہنچی تو ایک بھینسے کا خوف جیسے کچھ غصّے میں تبدیل ہو گیا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں، سَر نیچے جھکا اور جیسے گردن اینٹھ کر کچھ مدافعت کا سا انداز بنایا اور ایک شُوں نتھنے پھلا کر نکالی۔ یہ انداز اور شُوں بھلا اکڑا برداشت کر سکتا تھا؟ دانت کی نوک پیٹ پر جما کر ذرا حرکت سی دی تو ساری اوجھڑی اور کل انتڑیاں زمین پر لوٹتی دکھائی دیں۔ بھینسا گرا، گاڑی آگے جھک گئی۔ وزن پڑنے سے دوسرے بھینسے کا جوت ٹوٹ گیا اور گردن جوئے سے آزاد ہو گئی، گاڑی سے علیحدہ ہوتے ہی جیسے اُسے عرب گھوڑے والے پاؤں لگ گئے۔ وہ گھر کا رُخ کر کے سیدھا بھاگا چلا

گیا۔ راستے پر یوں بھی دھوپ اور گرمی تھی پھر یہ آلائش اور خون پھیلا ہوا تھا اور بھینسے کی سسکتی ہوئی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ہاتھی کو ان چیزوں سے کراہت آتی ہے۔ ہاتھی بہت اطمینان کے ساتھ کھانے کا عادی ہوتا ہے حالانکہ اکڑا اس اعتبار سے مستثنیات میں سے تھا لیکن ابھی تو راہ بر بیشتر کی بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ نے اسے بھی مکدر کر دیا تھا۔ ہر لحاظ سے یہ ماحول کھانے کے لیے ناسازگار بھی تھا لہٰذا اکڑا نے سونڈ میں گاڑی کا اگلا حصہ جس میں جوا بندھا ہوتا ہے پکڑ کر ایک ہلکی سی حرکت دی اس اشارے میں دونوں پہیے دلدل سے باہر نکل آئے، وہ راستے سے گاڑی کھینچ کر ایک جانب لے گیا اور ہوا کا رخ بچا کر جہاں خون کی بو نہ پہنچے، ہلدو کے ایک چھتری دار درخت کے سائے میں تنے سے لگا کر ٹیک دی اور لگا بھیلیوں پر بھیلیاں غٹاغٹ اتارنے مگر یہ تو گڑ تھا، ٹھوس گڑ، نہ تو برگد پیپل کی شاخیں تھیں، جو ہڑ کی لڑسی کنول کسیرو اور نارہی کی جڑیں اور لونمے اور نہ بیر بھرے ٹھنڈے میٹھے گنے تھے کہ پیٹ بھرے پر جی نہ بھرے، منوں کھاتے چلے جاؤ اور ایک ڈکار میں سب پچے۔ روپے سیر والی ڈھائی ڈھائی سیر کی پندرہ سولہ بھیلیاں کھانے کے بعد اکڑا ابول گیا۔ خیر تیرہ مٹکیں کے لڈو کھانے والے متھرا کے چوبوں کی طرح دو اور نگلیں پھر اٹھارویں بھیلی پر منہ بھر گیا۔ جوں توں ایک اور اٹھائی، وہ سونڈ سے ہونٹ تک تو پہنچ گئی مگر زبان اور تالو نے قبول نہ کی، حلق رندھ گیا، نیچے گر پڑی بے دلی کے ساتھ گاڑی کے اوپر سونڈ پھرا کر دیکھا تو خیرات کی کور بھی نہ کھسکی تھی، گاڑی جوں کی توں لبالب تھی۔ ادھر صبح ہی صبح جو یہ دعوت شیراز اڑتے دیکھی تو فضا سے چند کوے بھی اتر کر شریک ہو گئے اور ادھر ادھر کے درختوں سے چند سنجیدہ و فلسفی صورت بندروں کو اترنا پڑا اور لپک جھپٹ کی ایک ایک بھیلی سنبھال کر اپنی جگہ واپس چلے گئے اور اطمینان کے ساتھ اوپر پہنچ کر کھانے لگے۔ غرض حلوائی کی دکان نانا جی کی فاتحہ کا پورا سماں بندھ گیا اور چٹانوں سے پنڈت کیسر سنگھ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم سب کچھ دیکھتے رہے۔

کیسر سنگھ کا بڑا بھائی گھر سے روانہ ہونے ہی والا تھا اور گھوڑی کسی کھڑی تھی کہ پہلے تو بیل ٹوٹی ہوئی رسیاں گھسیٹتا ہوا گھر پہنچا تو اس نے بیل کو گالیاں دیں کہ نمک حرام تھانے سے رسی تڑا کر بھاگ آیا لیکن جب ذرا دیر بعد بھینسا پہنچا اور خون میں لت پت مگر کہیں زخم نہیں تو سب لوگ گھبرا گئے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا اور معاً یہ اندیشہ گزرا کہ کیسر سنگھ کو یا تو شیر نے مار دیا یا ڈاکوؤں نے قتل کر دیا۔ ہاتھی کی جانب خیال نہ گیا لیکن جب پلٹے ہوئے بیل اور بھینسے کی رفتار اور وقت کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ جو کچھ بھی گزری ہے دن نکلے گزری ہے اور ڈکیتی رہزنی کا وقت نہیں تھا لہٰذا یہ وسوسہ راسخ تر ہو گیا کہ شیر نے مار دیا اور بھینسے پر جو خون لگا ہوا ہے وہ کیسر سنگھ ہی کا ہے لہٰذا بستی سے "مدد" کی ایک آواز پر سب کے سب مرد نکل پڑے اور دو ڈھائی سو جوان جمع ہو گئے اور ڈھول نگاڑے، تاشے، کنستر اور برچھے کلہاڑے ہاتھوں میں لیے راستے راستے گاڑی کے پہیوں کے نشان پر چل پڑے۔ بیل اور بھینسے کے پہنچنے سے انھوں نے واقعے کے وقت کا بھی اندازہ لگا لیا تھا اور جائے وقوعہ کا بھی یوں تو اس غول بیابانی نے اپنی بستی سے نکلتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا مگر جب جائے وقوعہ قریب آئی تو تمام جنگل سر پر اٹھا لیا۔ دیکھنے تک نوبت ہی نہ پہنچی آدمیوں کے اتنے بڑے ہجوم غفیر کی بو اور یہ شور ابھی جلوس دو میل ہی کے فاصلے پر تھا کہ اکڑا بھاگ گیا۔ جائے وقوعہ پر پہنچ کر انھوں نے ہر چیز سمجھ لی اور ان چٹانوں کی جانب کھوجیں پڑھ ہی رہے تھے کہ دور سے کیسر سنگھ نے دیکھ کر سمجھ لیا کہ کمک آ گئی اور خطرہ نہیں ہے، وہ چھلانگ لگا کر چٹان سے اترا اور ان میں آ کر مل گیا۔ سب نے شکر ادا کیا کہ ایک بھینسے اور تھوڑے گڑ پر ہی بیتی۔ تھانے اور محکمۂ جنگلات میں رپورٹ ہوئی، اکڑا کا دوسرا فائل چلا۔ رینجر نے موقع پر آ کر واردات کا نقشہ تیار کیا، کھوجوں کے فوٹو لیے اور چونکہ جس منڈی کو گڑ لے کر کیسر سنگھ جا رہا تھا، وہ ریاست رام پور میں تھی لہٰذا ریاست کے محکمۂ جنگلات اور پولیس کو بھی رپورٹ بھیج دی۔

ہم لوگ خاں صاحب کے کیمپ سے روزانہ فورڈ اور جہاں فورڈ نہ پہنچ سکتی تھی وہاں بیل تانگوں یا گھوڑوں پر سوار ہو کر افواہوں سے اصلیت چھانٹتے کیسر سنگھ والے واقعے کی خاص جگہ پہنچے، ہاتھی کے کھوج نم زمین پر مہینوں نہیں مٹا کرتے۔ کہیں کہیں کھوج بھی دیکھے، گاڑی والی جگہ دیکھی، خود کیسر سنگھ کو کیمپ پر طلب کر کے اس کے ساتھ جا کر تمام حال موقع پر پہنچ کر سمجھا۔ اکڑا نے تیسرا خون پھر گڑ کی لاگ پر ایک کسان کا کیا تھا جس کے کھیت جنگل کے کنارے تھے۔ دو بھائی صبح سے دوپہر تک کام کرتے رہے، دوپہر کے وقت کام بڑھا کر بیل کی چھاؤں میں جو جنگل کے کنارے تھی اور جس کے تلے ایک کنواں تھا کھانا کھانے کے لیے پہنچے، گڑ، چنے اور ستو ایک چادر میں بندھے تھے۔ ایک بھائی نے جگت پر چڑھ کر پانی نکالنے کے لیے ڈولچی ڈالی، دوسرے نے چادر پھیلا کر گڑ، چنے اور ستو کھولے کہ ایک دم اکڑا سر پر تھا۔ جو بھائی پانی نکال رہا تھا وہ تو ویسے ہی جگت کے اوپر جھکے جھکے کنوئیں میں جست لگا گیا اور بس کنوئیں کے اندر پہنچ کر ایک چیخ اپنے بدنصیب بھائی کی سن سکا اور اس کے بعد لمبے چنگھاڑنے کی آوازیں اور ہاتھی کی مخصوص خونی گرج کنوئیں کے اندر گونجتی رہی پھر سناٹا ہو گیا۔ اس شامت زدہ کے منہ سے بمشکل گھٹے گھٹے کی آواز نکل پائی تھی کہ اکڑا نے گردن پکڑ کر بڑے زور سے بیل کے تنے پر دے مارا، اور پھر مارا، اور پھر اور پھر اور تین چار پٹخنیوں کے بعد بھی سونڈ اور ہونٹ جلانے کا انتقام پورا نہ ہوا تو سونڈ میں سے زمین پر پٹخا اور اگلا پاؤں بڑھا کر آہستہ آہستہ کچلتا رہا یہاں تک کہ حلوہ بنا کر چھوڑ دیا۔ پلٹ کر چادر سے دونوں کے حصے کا گڑ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا، چادر اٹھا کر ہوا میں لہرائی، چنے اور ستو بکھیر کر اور منہ بنا کر کے چل دیا۔ جنگل سے ملحقہ کاشت زمین کا سلسلہ منقطع سا ہوا کرتا ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے پر یہی دو آدمی تھے، جب تیسرے پہر گھر نہ پہنچے تو متوفی کی عورت خبر لینے آئی۔ کنوئیں کے قریب پہنچی تو شوہر کی لاش کا حلوہ دیکھا اور واویلا مچایا تو اندر کنوئیں سے دیور نے آواز دی، مارے پیچھے پکار ہوئی، گاؤں کے چوکیدار پٹواری نے تھانے اور محکمۂ جنگلات میں رپورٹیں دیں۔

اکڑا کے چوتھے چھاپے کے حالات بڑے ہول ناک ہیں اور ہم نے بہت چھان بین کی اس المیے کے ساتھ کہیں گڑ یا مٹھائی کی موجودگی کا بھی کوئی سراغ

نہیں۔ پہاڑ سنگھ جاٹ موضع ضلع نینی تال کا ایک چھوٹا سا زمیں دار تھا اور بڑا خوش حال اور محنتی کاشت کار تھا۔ اپنی زمیں داری کے تقریباً کل رقبے پر اپنے ہاتھ سے کاشت کرتا تھا۔ دو گاڑیوں میں بیس بیس من چاول بھر کے ریاست کی حدود میں اچھا نرخ ہونے کے سبب فروخت کرنے کے لیے لا رہا تھا اور چونکہ کسٹم وغیرہ کا چکر تھا لہٰذا ایسے وقت چلا کہ جھٹپٹے کے وقت ریاست کی حدود میں داخل ہوا اور رات کو موضع میں جو ریاست کا سرحدی گاؤں ہے قیام کر کے وہیں سے بیوپاریوں کو دے دے یا دوسرے دن صبح آگے کسی گاؤں میں بڑھ جائے۔ ریاست کی سرحد ابھی گھنٹے بھر کے راستے پر تھی کہ سورج غروب ہو گیا۔ ویسے تو یہ راستہ جس پر یہ چل رہے تھے میدان ہی میدان گیا تھا مگر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے قطعے چھدرے جنگل کے بھی آجاتے تھے۔ دونوں گاڑیاں دن میں تو آگے پیچھے چلتی رہیں اور پچھلی گاڑی پر پہاڑ سنگھ رضائی میں لپٹا، اپنی اٹھارویں صدی والی قرابین نسل کی بھرتو بندوق پکڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سوبھا نامی ایک نوجوان چوکیدار جو قوم کا بھنگی تھا، برچھا لیے گاڑیوں کے دائیں بائیں چل رہا تھا۔ دو چمار گاڑیاں ہانک رہے تھے۔ چونکہ پہاڑ سنگھ مستقل طور پر ریاست اور انگریزی علاقے کے درمیان بغیر محصول و اجازت کے جنس کی الٹ پلٹ کرنے کا کاروبار کیا کرتا تھا لہٰذا اندھیرے اجالے گاڑیاں بھر کر چلا کرتا تھا اور یہ راستہ تو اسے سمجھا ہوا تھا۔ گاڑیاں ایک چھوٹے سے جنگل کے ٹکڑے میں داخل ہوئیں۔ درختوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے یہاں ایک ہی راستے کے کئی کئی راستے بن گئے تھے اور آگے پیچھے چلتی ہوئی دونوں گاڑیاں جنگل کے اندر داخل ہونے کے بعد اتفاق سے دو متوازی راستوں پر چلنے لگیں جن کے درمیان کا فاصلہ کہیں دس بارہ اور کہیں پندرہ بیس گز تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا، کچھ درختوں کا سایہ بھی تھا۔ نسبتاً یہ ٹکڑا زیادہ گھنا تھا، دونوں گاڑیوں کے درمیانی فاصلے میں جگہ جگہ اونچی جھاڑیاں حائل ہو جاتی تھیں اور ایک جگہ ایسی ہی جھاڑیوں میں اکڑا اتنا ساکت کھڑا تھا کہ انھوں نے جب دیکھا جب اس نے وہ ہیبت ناک چیخ نکالی جو حملے کے وقت کی مخصوص خونی آواز ہوتی ہے۔

دونوں گاڑی بان تو جست لگا کر فرار ہو گئے اور سوبھا چوکیدار کے منہ سے شاید بہ تقاضائے چوکیداری ایک ڈانٹ نکلی اور ہاتھ میں برچھا سیدھا ہو گیا۔ اکڑا کا رخ تو ادھر ہی تھا اک ذرا ہمک کر سوبھا کو سونڈ میں پکڑ کر اٹھا لیا۔ پہاڑ سنگھ جاٹ یہ دیکھ کر ان کا جان نثار و بہادر چوکیدار ہوا میں معلق ہے ٹھنڈے بیوپاری ہونے کے باوجود اپنی اصل پر پلٹ پڑے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اکڑا کے رنگ سیاہ کی چٹان جیسے چوتڑوں پر دھڑ سے بندوق دے بجائی جس میں چار پانچ ڈرام دیسی بارود آدھی چھٹانک اپنی دانہ دلنے کی چکی میں ڈال کر چھکنایا ہوا خانہ ساز گراپ تین گھٹیا کوڑیاں اور ایک مدد شاہی کچا پیسہ بھرا تھا۔ دھماکے کے ساتھ بھڑک کر اکڑا نے چوکیدار کو وہیں اوپر ہی اوپر اچھال کر جو پھینکا تو پچاس گز دور جا گرا اور چوٹ سے بلبلا کر جو پلٹا تو پہاڑ سنگھ کو جو بندوق داغتے ہی گاڑی پر شاید دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے کہ ہاتھی مرا یا نہیں، کمر سے گرفت میں لے لیا اور ان کی پونے تین من کی سوا چھ فٹ لمبی لاش زمین پر پٹخ کر ایک پنڈلی اگلے پاؤں سے دبالی اور دوسری پنڈلی سونڈ میں پکڑ کر اک ذرا اتنا زور جو دیا تو چودھری پہاڑ سنگھ ایک کے دو ہو گئے اور بیچ سے یوں آدھے آدھے ہو گئے جیسے آرے سے کوروں کا لٹھا۔ یہ سب کام جیسے بگولے کی رفتار سے پلک مارتے میں شروع ہو کر ختم ہو گیا۔

بیکنٹھ باشی پہاڑ سنگھ جاٹ نے اپنے گاڑی بانوں کے ساتھ ایک جست لگانے کے بجائے بندوق چھوڑی۔ بہادری کے تقاضے کے مطابق، یا چوکیدار کی جان بچانے کی خاطر، یا شاید قصاص لینے کے لیے یہ دل کا معاملہ تھا کہ سوچیں گے پیچھے پہلے کر گزریں مگر اس میں شک نہیں کہ جو ہوا سو ہوا، چار ڈرام بارود، دو دوا لیس سیسہ، تین گھٹیا کوڑیوں اور ایک تولا کچے تانبے کے مرکب نے دونوں چوتڑوں کے اوپر اردو اتنی اچھی لکھ دی کہ سنگِ مزار کا کتبہ بن کر رہ گئے۔

اتنے بڑے دھماکے کے بعد اکڑا ہی جیسے خونی اور بے جگر ہاتھی کا کام تھا کہ اس نے پلٹ کر پہاڑ سنگھ پر حملہ کر دیا مگر جیسے ہی چیر پھاڑ کر علیحدہ ہوا تو جیسے اس مہیب دھماکے کی صدائے بازگشت اس کے اندر گونج اٹھی اور وہ جنگل کو فرار ہو گیا۔ سورگ باش چودھری پہاڑ سنگھ کی بندوق کا تمام بھرت پندرہ گز کے فاصلے سے پڑنے کے باوجود بھی اکڑا کے چوتڑوں کی کھال میں دھرا رہ گیا تھا۔ رات میں تو اسے اچھی طرح چوٹ کا احساس بھی نہ ہوا مگر صبح جب مکھیوں نے احساس دلایا تو کچھ کانٹے سے بھی چبھتے محسوس ہوئے اور مکھیوں کی دوا کیچڑ تھی اور سونڈ چلنے والی معذوری تو تھی نہیں، دو چار روز کچھ سوزش رہی پھر پتہ بھی نہ چلا کہ پہاڑ سنگھ کی بندوق کا سب سامان کب کھال اور پٹھوں کے درمیان ہضم ہو گیا لیکن بندوق کی چوٹ کا ردِ عمل ہو یا دھماکے کا کہ اس واقعے کے بعد وہ بہت زیادہ خوف ناک اور آدم کش ہو گیا۔ میلوں دور سے آدمی کی بو پر پہنچنا شروع کر دیا اور آدمیوں کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر دیا اور ہلکی سی بو پر غصے کے مارے آپے سے باہر ہو جاتا، چنانچہ پہاڑ سنگھ اور سوبھا کے خون کے بعد محکمہ جنگلات کے ریکارڈ میں چھ وقوعے اور درج تھے۔ بعض باتیں افواہوں میں اتنی سنسنی خیز تھیں کہ اگرچہ ان کے ساتھ کسی خون کی رپورٹ نہ تھی لیکن اکڑا کی شر پر اور خونی سرشت پر روشنی پڑتی تھی اور ایسے واقعات کا فائل محکمہ جنگلات میں مرتب ہونا لازم تھا۔

دوسرے روز ہم فارسٹ رینجر کے ساتھ ایک اور موقع دیکھنے جا رہے تھے جس میں اکڑا نے ایک عورت اور اس کا ڈیڑھ سال کا بچہ مارا تھا۔ اگرچہ ہم اس حادثے کی جائے وقوعہ پر نہ پہنچ سکے مگر کیمپ پر رینجر اور اس کے ساتھ آئے ہوئے دو ایک اور آدمیوں نے بتایا کہ ویسے تو جنگل میں آزادانہ آمد و رفت بند ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑے اہتمام کے ساتھ آنا جانا پڑتا ہے پھر بھی آدمی گھروں میں تو بند نہ تھے۔ یہ عورت جس کا نام پاربتی تھا، یہ بھی اپنے ڈیڑھ سال کے بچے کو جو بیمار تھا، اپنے گاؤں سے چل کر دوسرے گاؤں میں ایک دیہاتی معالج کو دکھانے لے گئی۔ واپسی میں اکڑا نے اس پر حملہ کر دیا۔ ہاتھی کو اپنے اوپر بڑھتے دیکھ کر عورت نے بچہ پیٹ کے نیچے دبا لیا اور اس کے اوپر گٹھری بن کر اوندھے منہ پڑ

گئی۔ کچھوے کی طرح گول گول گٹھڑی سی پڑی ہوئی عورت کو یوں ہی گٹھڑی بنی بنائی ہاتھی نے اپنی سونڈ میں بھر لیا۔ جب عورت نے گرفت کا احساس کیا تو بچے کو اور بھی مضبوطی کے ساتھ چمٹا لیا اور جب ہاتھی اس گٹھڑی کو پٹخنے کے لیے اوپر اٹھا رہا تھا تو اُس ماتا کی ماری نے مرتے مرتے اپنا بچہ قریب ہی پڑے ہوئے گھاس کے ایک بڑے ڈھیر پر پھینک دیا لیکن اکڑا کو رحم نہ آیا۔ عورت کو پٹخنے اور کچلنے کے بعد آگے بڑھ کر گھاس کے اُوپر سے بچہ اتار لیا۔ اور اُسے بھی پٹخ کر مار ڈالا۔ ہم لوگ اس حادثے کی جگہ پہنچ کر ذرا معائنہ کرنا چاہتے تھے اور چلنے کے لیے بالکل تیار تھے کہ ریاست سے ایک سوار پرچہ لے کر آیا جو فیل خانے کے ... کی تھی۔ اسے پڑھ کر ہم سب اچھل پڑے اور خاں صاحب ناچنے لگے۔ تحریر یہ تھا:-

عالی جاہا! تسلیم! مدعا بکار سرکار یہ ہے کہ اطلاعاً تحریر کرتا ہوں رات تین اور چار بجے شب کے درمیان نزاکت نے فیل خانے کا شمالی پھاٹک کھٹکھٹایا۔ دربان کے کھولنے پر اندر داخل ہو گئی۔ بحمداللہ صحیح و سالم ہے اگرچہ کئی روز کی بھوکی پیاسی تھکی ماندی ہے۔ چنگی کے ناکے دار کا بیان ہے کہ اُس نے رات ڈھلے ایک ہاتھی کو نزاکت کے ساتھ دیکھا جو نہایت شدت کے ساتھ اسے شہر کے اندر بڑھنے سے روک رہا تھا۔ میں نے ناکے دار کے بیان کی تصدیق کے لیے علی الصباح جا کر دیکھا تو نزاکت کے کھوجوں کے ساتھ ایک بہت بڑے ہاتھی کے کھوجوں کے نشانات بھی موجود تھے جو الٹے پاؤں جنگل واپس گیا ہے۔ غلام نے کھوجوں پر پہرہ لگا دیا ہے اور پولیس کے ذریعے ادھر آمد و رفت بند کر دی ہے تاکہ آں جناب خود آ کر ہر چیز کا معائنہ فرمالیں۔ حامل اِنذا نے بھی یہ کھوج دیکھے ہیں اور ناکے دار کے بیان کے وقت بھی موجود رہا ہے۔ فقط۔

پروگرام کی پہلی اور دوسری شقیں تو بڑی حد تک پوری ہو چکی تھیں اُس خونی ہاتھی کی مخصوص طبع کا ہمیں کما حقہٗ اندازہ ہو چکا تھا اور اُس کے اکثر و بیشتر حادثات کی جائے وقوعہ دیکھ کر اور چشم دید شہادتوں کی بنا پر ہم اپنی تحقیقات مکمل سی کر چکے تھے اور جو حادثات باقی رہ گئے تھے اُن کی تحقیقات کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ بس ہمیں اب اپنے جاسوسوں کی واپسی کا انتظار تھا جن سے ہمیں فی الحال اکڑا کی بازی گاہ اور جہاں وہ عیش کوشیوں میں مصروف ہے، اُس نزاع کا علم ہو ساتھ ہی اُس کے تازہ ترین کھوج ملیں اور ہم تعاقب کریں لیجیے وہ یوں آپوں آپ حل ہو گیا۔ موٹی سی بات تھی۔ شہر پناہ کے نیچے سے کھوج اٹھا کر چل دیں۔ نزاکت گھر پہنچ ہی گئی یہ مسئلہ یوں حل ہو گیا ورنہ خیال یہ تھا کہ اکڑا کو شکار کرنے کے بعد نزاکت کو سانٹھ ماروں کے ذریعے قابو میں لایا جائے گا مگر واہ ری شائستہ طبیعت وہ آپوں آپ پہنچ گئی اور خاں صاحب تو اُس بچے کی طرح جس کا کھویا ہوا کھلونا مل جائے بار بار کلکاریاں سی مارتے تھے رُخ پلٹ گیا۔ خاں صاحب نے کیمپ کو

نئی ہدایات کے انتظار میں رہنے کا حکم دے کر وہیں چھوڑا اور ہم سب ایک دم اسپورٹس کار فورڈ پر لد کر شہر روانہ ہو گئے۔ سر دست یہ اسکیم دماغوں میں لیے ہوئے کہ وہیں سے اکڑا کے پلٹتے ہوئے کھوجوں یہ تعاقب کریں گے۔

♥

نزاکت تڑاتے کر توڑ کر فرار ہو گئیں سوا انچ موٹی کڑیوں والی زنجیر لیکن دراصل جس زنجیر سے وہ بندھی تھیں وہ ایسی نہ تھی جسے آج تک کوئی ذی روح توڑ کر چلا گیا ہو اور پھر نزاکت کھیدے کی پکڑی ہوئی منتھنی بھی نہ تھی اور اس کی زندگی میں کہیں وحشی اور جنگلی پس منظر کا نام و نشان نہ تھا اور کھیدے کے پکڑے ہوئے بندھے بندھے ہاتھی بھی کبھی جنگلی زندگی کو پلٹتے نہیں سنے گئے پھر یہاں تو معاملہ ہی اور ہوا۔ ڈیلے ڈھالے بھاؤ کی پڑی کہ چھٹی کا دودھ بھی یاد آ گیا اور حافظ شیرازی کا قول بھی کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا۔ اکڑا کم بخت تو ٹھیک سے نرا جنگلی بھی نہ تھا بلکہ جنگل کھڑ پا تھا جس کے دام میں پھنس کر آپ کھنچی چلی گئیں مگر پہلا وصل ہونے کے باوجود ہیں دن بھی حادِ عشق نہ دینے پائیں جو ہاتھی کے ہنی مون کی کم سے کم مدت ہے، اور پھر پائیں ہنی مون کے ابتدائی دنوں ہی میں آ نہیں قرأت کے ساتھ قل ہو اللہ پڑھنے لگیں کیونکہ کھانا تو درکنار بجز شربتِ وصل کے اور کوئی چیز ٹھیک سے پینے کو بھی نہ ملی تھی اور بھوک تو عشق میں بھی لگتی ہے جیسے جیسے ابال اترتا گیا، جھاگ سند ھاتے گئے، خون میں ٹھنڈ پڑتی گئی، پیٹ کی آگ بھڑکتی گئی اور وائے بدنصیبی اکڑا کو ان دنوں کہیں گڑ بھی ہاتھ نہ آیا۔ ویسے یہ بات نہیں کہ بیچارے نے خاطر تواضع میں کمی کی ہو۔ ورنہ اسے گیہوں کے کھیتوں اور گنے کے چکوں میں لے گیا لیکن گیہوں نزاکت کے حلق سے اترتا بھی تھا تو بڑے موٹے موٹے روٹ کی شکل میں خوب اچھی طرح پسے ہوئے آٹے کے روٹ انگاروں پر اچھی طرح سکے ہوئے، نمکین نمکین سلونے سوندھے گھی چپڑے روٹ ایسے خوشبودار مزے دار کہ ایک ٹکڑا فیل بان اور ایک ٹکڑا چرکیا کھائے بغیر نہ رہ سکتے، تھے درویش برجانِ درویش بیچاری نے اکڑا کی طرح سونڈ میں بھر کر ایک گٹھا اکھیڑا اور جس طرح اکڑا جھٹکے دے دے کر اور جھاڑ جھاڑ کر کھا رہا تھا اس نے بھی جھاڑ کر منہ میں رکھ لیا۔ توبہ! کرِ کرا، خیر نگلنے کو تو نگل گئیں، منہ کے اندر پہنچا لقمہ مگر دھلا نہ اٹھا سکیں، ہونٹ سے لے کر حلق تک مٹی ہی مٹی ہو گئی اور اکڑا بیگیوں کا ستھراؤ کرتا چلا گیا اور نزاکت تعجب کے ساتھ اس کی بلانوشی کا تماشا دیکھتی رہی جب پیٹ بھر کر نزاکت کی جانب متوجہ ہوا اور تواضع کا انداز بتایا گویا پوچھا: اجی آپ تکلف فرما رہی ہیں! تو نزاکت نے ایسی ڈانٹ بتائی کہ ڈر کے مارے کانپ گیا اور ساری بہادری اور پہلوانی بھول گیا اور جنگلی ہاتھیوں کو مار مار کر اور ڈانٹ ڈانٹ کر مرعوب کر لینے والے بہادر سا اکڑا کو نزاکت کے ساتھ پہلے ہی روز پتہ چل گیا تھا کہ ڈر، خوف، رعب اور نیازمندی کیا چیز ہوا کرتی ہے اور جیسے جیسے وقت گزرا یہ احساس راسخ تر ہوتا گیا اور اب تو یہ عالم تھا کہ اس کی ٹیڑھی نگاہ دیکھ کر اعصاب کا توازن کھو بیٹھتا اور ذرا سی تنوں پر تو بول و براز خارج ہو جاتا اور شاید اسی لیے یہ چند دن نبھ بھی گئی اور

اب تو شاید اسے بڑی شرمندگی اس چیز کی تھی کہ ایسے رومانٹک ڈھنگ کی دعوت تو درکنار اپنی نئی نویلی دلھن کا ایک مرتبہ پیٹ بھی نہ بھر سکا۔ وہ اسے بڑی امید لگا کر گنے کے رقبے پر لے گیا۔ بلا شبہ گنا اس کے فیل خانے کا مخصوص چارہ تھا مگر ایسی بھدی شکل میں گنا کا ہے کو کبھی سامنے آیا ہوگا! اکڑا نے شاید یہ احساس کر کے اپنی صلاحیت کے مطابق جڑیں اور اگولا وغیرہ توڑ کر اور بعض بعض موٹا گنا چیر کر پیش کیا، ایک دو لقمے کھائے مگر اچھی غذا بنانے سے اچھی ہوا کرتی ہے اگر ایسے ہی ہاتھی کھیتوں میں کھڑے گنوں اور جوار سے پیٹ بھر لیا کرتے تو مالکوں کو چیر کر ٹکڑے رکھنے کی کیا ضرورت تھی جو چارے کی رگ رگ اور ہاتھی کا مزاج پہچانتے ہیں اور جن کا کام ہی چارہ کاٹنا اور صاف کر کے بنانا ہوتا ہے اور جب اکڑا نے پھر خوشامد کے ساتھ تواضع کے انداز میں ایک بڑا موٹا گنا حتی الوسع بڑی اچھی طرح صاف کر کے اور چیر کے پیش کیا تو نزاکت نے ایسی سنگین ڈانٹ دی کہ وہ غریب اچھل کر جا پڑا۔ نزاکت کا پچھلے ہی دو لقموں نے منہ چھیل دیا تھا۔

دھوپ کے وقت اکڑا نے بڑی خوشامد کر کے اسے ایک ایسی جگہ لے چلنے کی کوشش کی جہاں غسل اور لنچ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ تھیں۔ پہلے تو جس راستے سے لے کر گیا اس پر نزاکت کو بڑی تکلیف ہوئی۔ جگہ جگہ کانٹے تھے اور تلوے کا ہر ہاتھی بہت کچا ہوتا ہے اور پھر نزاکت جس نے ڈامر اور سیمنٹ کی سڑکوں پر پھسلیاں بھری تھیں اور جس کے قدم سال میں دو چار مرتبہ مخمل و بانات روندا کرتے تھے اور اطلس اور ریشم کے مسہری گھیرا کرتے تھے، بڑی مشکل سے جھنکاڑوں اور جنگلی کانٹوں کی نوکوں کے چرکے اٹھاتی بہت دیکھ بھال کر اور بچا بچا کر قدم دھرتی بہ ہزار خرابیٔ بسیار وہاں تک پہنچی۔

پتھر کے حوضوں اور پکے نالالیوں پر جھاموں سے رگڑ رگڑ کر نہلائی جانے والی نزاکت کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے اس جوہڑ میں گھس کر غسل کرے۔ اِدھر اُدھر اونچی گھاس تھی، اس کے بعد کچھ دور تک دلدل اور چھپ چھپے پانی کا سلسلہ تھا لیکن درمیان میں نرمل پانی جھلملا رہا تھا اور پانی میں محرد رالمزاج جانور کو بڑی دلکشی محسوس ہوتی ہے لیکن اچھے صاف پانی تک پہنچنے سے قبل دلدل سے گزرنا تھا۔ جس میں جونکیں بے شمار ہی تھیں اور سڑی گلی گھاس، نہ معلوم کیا کیا وبال بھرا پڑا تھا اور بدبو بھی تھی مگر کئی روز سے غسل نصیب نہ ہوا تھا، پانی کی کشش میں اس دلدل اور کیچڑ سے کراہت کے ساتھ گزر گئی۔ اندر پانی خاصا تھا، کافی دیر دونوں ہم غسل کا لطف اٹھاتے رہے ایک دوسرے پر فوارے اچھال اچھال کر کھیلتے رہے۔ تھوڑا سا وقت ذرا اچھا کٹ گیا لیکن جب غسل کے بعد اکڑا نے لنچ پر دعوت دی تو وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ خیر گیہوں گنے کے رقبے پر تو ایک ایک دو دو نوالے جیسے تیسے حلق سے اتارے بھی تھے، یہاں تو سرے سے دسترخوان پر ہاتھ ہی بڑھانے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ بڑے تعجب اور حقارت کے ساتھ اکڑا کو دیکھتی رہی جو سونڈ میں پکڑ پکڑ کر لوسی اور کیسو کے گٹھے اکھیڑتا تھا اور ان کی دلدل اور کیچڑ میں لپٹی ہوئی کثیف جڑیں ذرا پانی میں ڈبو کر دھوتا تھا اور غپ سے مٹی

میں لت پت یہ کرخت نوالا منہ میں رکھ لیتا تھا اور پھر ایک نہ تشدد و تشدد! جب دونوں نہا دھو کر باہر نکلنے لگے تو نزاکت کیچڑ اور دلدل میں بہت سنبھال کر پاؤں دھرتی ہوئی نکلی کہ لت پت نہ ہو جائیں لیکن جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو پانی سے بڑھ کر اور دلدل میں پہنچ کر اکڑ لا نے ایک لوٹ لگائی اور پھر کھڑے ہو کر کیچڑ کے لوندے سونڈ میں بھر بھر کر مزید تمام جسم کے اوپر چھ چھ انچ آٹھ آٹھ انچ موٹی غلیظ مٹی کی تہہ چڑھائی۔ جاڑوں میں روزانہ دوپہر کے دو پہر اور گرمیوں میں صبح و شام دونوں وقت بلا ناغہ پتھر اور ربڑ کے جھاموں اور برشوں سے رگڑ رگڑ کر نہلائی جانے والی نزاکت کو جو غسل کے بعد ایسی نظر آیا کرتی کہ جیسے سنگِ موسیٰ کا مجسمہ ہے اپنے شوہر نامدار کی اس غلیظ حرکت پر سخت تنفر ہوا جو گویا غسل کے بعد کا میک اپ تھا اور فیل خانے میں بھی غسل کے بعد ہر ہاتھی کا بڑے اہتمام کے ساتھ میک اپ ہوتا اور وہ دیکھ کر بوڑھے بڑھے داوا نانا قسم کے کھوسٹ ہاتھیوں کا بڑا اتراتا مانگ پیچھے تو بتا دانتوں پر سونے چاندی کے خول چڑھائے جاتے۔ نورسی آنکھوں میں سرمہ لگتا اور نزاکت کے بناؤ سنگھار پر تو خاص توجہ دی جاتی کیونکہ وہ خان صاحب محمود خاں کی منظورِ نظر تھی۔ تھی آنکھیں دنبالے اور ممیرے کا سرمہ لگا کر چشمِ آہو بنائی جاتیں۔ پیشانی سونڈ کے بالائی حصے، رخساروں اور کنپٹیوں پر تو میک اپ پینٹنگ کی صورت اختیار کر جاتا۔ ایسی ایسی ہفت رنگ گل کاریاں کی جاتیں اور وہ نقش و نگار بنائے جاتے کہ کسی قیمتی ڈریس میں پرفارمنس کرنے والی کوئی مغربی حسینہ بیچاری کیا کر پاتی ہو گی اور پھر لباس ایسا فاخرہ ہوتا کہ قرونِ وسطیٰ کی مغربی شہزادیوں کے سوا دنیا میں اور کسی کو تو نصیب ہوا ہو گا۔ ہیرے، چاندی کے سنہرے روپہلے تاروں سے کارچوب کی جھلیں جھول پہن کر اور کانوں میں گنگا جمنی آویزے لٹکائے اوپر چاندی کی عماری سجائے اور دائیں بائیں گھنٹے لٹکائے جس وقت کسی جلوس کے ساتھ جھومتی اٹھلاتی نکلتی تو سچ مچ شہزادی معلوم ہوتی۔ تماش بینوں کی نگاہیں چندھیا جاتیں، سر جھکتے چلے جاتے اور ہاتھی تو وہ جانور ہے جو لگام اور باگ کے بغیر صرف آدمی کی زبان سے حکم سن کر ایک فرماں بردار غلام کی طرح تعمیل کرتا ہے چنانچہ وہ نطق سے تو ضرور محروم ہے لیکن ایسی دقیق اور تیز جبلت لے کر آیا ہے اور قوتِ تمیز میں اتنا ذکی الحس ہے کہ اپنے جملہ متعلقین کو درجہ بدرجہ پہچانتا ہے۔ وہ اپنے فیل بان، چرکٹے اور مالک کے درمیان ہر ایک کے درجے اور اہمیت کے مطابق بالکل صحیح تمیز کرتا ہے۔ جلوس، شادی، جنگ، بار برداری جس کام پر لگایا جائے اس کی نوعیت کا علم ہو جاتا ہے اور اپنے غسل، آرائش، لباس کا اتنا ہی شعور رکھتا ہے جتنا اپنی غذا کا۔ تیاری کے وقت تیاری کی نوعیت سے سمجھ جاتا ہے کہ کہاں لے جایا جانے والا ہوں، شکار، جلوس، جنگ یا بار برداری اور پھر اپنی خاصیت کے مطابق اپنی مخصوص حرکات سے خوشی، شوق یا بیزاری کا مظاہرہ تیاری ہی کے وقت شروع کر دیتا ہے۔

یہ ٹھاٹ کے سامان ریاست کے فیل خانے میں ہر ہاتھی کے لیے تقریباً یکساں تھے نیز مختلف ہاتھی مختلف کاموں کے لیے موزوں تھے اور انھیں اسی موقع پر نکالا جاتا تھا۔ نزاکت تو فیل خانے کی شہزادی تھی۔ یوں بھی قدرت نے اُسے تمام تر خارجی حسن و رعنائی اور چال ڈھال کے علاوہ ہاتھی کی اعلیٰ ترین خصوصیات سے سرفراز کیا تھا اور بڑی تربیت پذیر طبیعت عطا کی تھی اور شائستہ فطرت بنایا تھا۔ مالک اور محافظوں کی گہری توجہ اور حسنِ تربیت کے اہتمام نے اسے خارجی و داخلی ہر پہلو سے ایک مثالی ہتھنی بنا دیا تھا۔ وہ ہر اعتبار سے بادشاہوں اور سرداروں کے شایانِ شان کھلونا تھی۔

تقدیر کے کھیل زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت! ذرا آپ کی لقائے مبارک ملاحظہ کیجیے۔ مادر زاد پنج عیب شرعی لے کر دنیا میں آئے تھے۔ کھنڈے ایک دانت، وہ بھی بدنما لمبے ڈول، موٹا بھدا لٹکا نکلا ہوا دوسرے کی جگہ بدنما گومڑی سی اٹھی ہوئی، ایک آنکھ چھوٹی ایک بڑی حالانکہ چھوٹی آنکھ بڑی سے تیز تھی لیکن بظاہر گچی سی معلوم ہوتی تھی اور آپ کانے دکھائی پڑتے تھے۔ ڈیل ڈول سخت نامتناسب ٹانگیں عجیب انداز میں پھری ہوئی، معلوم ہوتا تھا کہ جس گھڑی جنینِ مادر کے اندر وارد سعید ہوا ہے اس وقت سورج گرہن پڑ رہا تھا۔ تیوروں میں غنڈا پن جو شروع میں شرارت کا انداز لیے ہوئے تھا اور بعد میں تو اس نے شکل اختیار کر گیا تھا۔ سونڈ کی نوک پر جلے ہوئے کا برص جیسا سفید داغ، محکمہ جنگلات کی اصطلاح میں رنج کے سرکاری خطاب سے سرفراز، دیہاتیوں میں خرفی لقب اور بھائی بند شاید اپنی زبان میں شلیطان کہتے ہوں گے دیہاتی محکمے والے اور ہم جنس سب کی نیندیں آپ کے وجود سے حرام اور ہر ایک آپ کے خیال سے گریزاں و لرزاں اور آپ ہر طرح چاہتے ہیں خوب رلیوں کو آمد۔

نزاکت جیسی پری پیکر اور شائستہ و مہذب ہستی کے شوہر اور نہ صرف شوہر بلکہ عاشق بھی! اور شاید نزاکت کی جانب سے بھی کچھ اپنے متعلق حسنِ ظن میں گرفتار تھے۔ کیا بھتی؟ جو کچھ اُس وقت جذبات کی رو میں ہو گیا ہو گیا اور جو دن ساتھ کٹ گیا، گرم جن میں کٹ گیا وہ بھی تعجبات میں تھا۔ نزاکت جنگل کی زندگی سے بیزار تھی، شوہر نامدار کی شکل سے متنفر اور کیے پر نادم۔ کنواری ارمان بیاہی پشیمان، اب گھر کی رنگا رنگ یادیں اپنے متعلقین کے تصور، اپنی ماں کی نرم نرم گود اور پیاری باتیں اور سب سے زیادہ باپ کی طرح دستِ شفقت پھیرنے والے محمود خاں کی یاد اور نہ معلوم کون کون سی رسیاں جو اس کے گلے میں پڑی تھیں، طوفان اتر جانے کے بعد اب اسے کھینچتی تھیں۔

وہ زنجیر جو نزاکت توڑ کر آئی تھی اس کی کڑیاں آپوں آپ جڑنے لگیں اور جب ایک مرتبہ کشش نے زور مارا تو صبح کے دھندلکے میں گھر کی جانب منہ کر کے اندھا دھند چل پڑی اور دیوانہ وار چلتی ہی رہی بچکولے ہوئے بگلے کی طرح اکڑا بیچارے کان ڈالے قدم بہ قدم پیچھے پیچھے اڑے چلے جا رہے تھے۔ ایک دو جگہ ٹھہر کر مرضی پوچھنا چاہی تو اس نے چلتے چلتے وہ ڈانٹ بتائی کہ قریب پانچ قدم پیچھے جا پڑے۔ تمام دن اور آدھی رات ایک رفتار سے چلنے کے بعد جب اکڑا کی ناک میں بڑی گہری اور غلیظ مانس گندھ پہنچی اور مانس گندھ کے ساتھ ساتھ اور نہ معلوم کتنی اور مانوس اور معطر رسان بوئیں پہنچیں تو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ رام پور شہر کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ نزاکت نے شہر پناہ کے قریب پہنچ کر اطمینان کی سانس لی۔ ذرا دیر بھی

پڑی اور جب اُس نے پُرانی بانسی کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچ کر ڈگ بڑھانا چاہا، مانس گندھ کی ایسی گمبھیر اور گھٹی ہوئی جگہ میں اکرلا نے بڑھنے سے رکا اور دیوار کی طرح حائل ہو گیا لیکن پچھلی رات کی ہلکی ہلکی خنک نم ناک ہوا کے دامن پر جو فیل خانے کے اُوپر ہو کر آ رہی تھی اُس کے تھان اُس کی پیاری ماں اور اُس کے بھائیوں اور باپ چچاؤں خالہ پھوپھیوں اور خاندان والوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی جو اسے دلاسا بنائے دے رہی تھی۔ وہ کترا کر نکلنے لگی تو اکرلا نے بڑے پیار کے ساتھ اُس کی نیلی سڈول نرم نرم نازک سونڈ میں چھلا ڈال دیا اور قائیں قائیں قوں قوں چیڑ، توں توں نا، نا ہیں اپنی مخصوص باز رکھنے والی آواز میں کہا۔ "نہیں نہیں نزاکت پیاری نہ جاؤ نہ جاؤ۔" اور سونڈ کے اس مخصوص انداز کے ساتھ لپٹنے میں جیسے جذبات کا رُخ بدلا اور کچھ اختلاط والی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اکرلا کے اندر تو پیار اور محبت کا ٹھیرا ہوا سمندر دریا ٹھاٹھیں مار اُٹھا اور دو ہفتے کی عیش کوشیوں اور وصل کا تمام پس منظر اُبھر آیا لیکن نزاکت فقط اتنی متاثر ہو سکی کہ جھٹکے کے ساتھ علیحدہ ہونے کے بجائے ذرا جھوم کر رُخ بدلا، ترچھی سی ہوئی اور اپنی سونڈ سیدھی کر کے چھلّے سے نہایت نرمی کے ساتھ سونت لی اور وصل جو ہونے کے سلسلے میں ہوا تھا، جذبات کے تحت ایک طویل الوداعی بوسہ بن کر اس طرح ختم ہو گیا۔ نزاکت منہ موڑ کر بڑھنے لگی اور اکرلا نے بے قرار ہو کر جبلّی خوف، رعبِ حسن اور نیازمندی سب کچھ پسِ پشت ڈال کر اُس کا پچھلا پاؤں مضبوط گرفت میں لے لیا۔ نزاکت نے اندازہ کیا کہ اُس کی پکڑ اندھیری رات والی زنجیر سے کہیں زیادہ سخت ہے اور پکڑے پکڑے بڑی دردناک آواز حلق سے نکلتی رہی۔ درد بھری رقت ہوئی سی کراہٹ بڑے کرب ناک زیروبم کے ساتھ جیسے حلق سے بڑھ کر کہیں اور سے نکل رہی ہو کہیں اندرسے سینے کی گہرائیوں سے بھی زیادہ گہرائی سے دل کے پردوں اور روح کے اعماق سے آ رہی تھی اور صاف سنائی دے رہا تھا۔ وہ جیسے پاؤں پکڑ کر اور رو رو کر منت سماجت کر رہا ہے۔ "رحم رحم پیاری نزاکت! مت جا! مت جا اپنے عاشقِ نامراد پر رحم کر، رحم! کشتۂ عشق کو آتشِ ہجر میں مت چھوڑ۔" لیکن فیل خانے کے اُوپر سے نشیلی غم ناک چاندنی میں نہائی ہوئی سسکتی نسیم سحر اب تو بادلوں کی رسیّوں کے تناؤ کے ساتھ خوشبوؤں کی لپٹیں بھی لا رہی تھی اور اُس کے سبب تصوّر کی فسوں کاری فیل خانے کی چہار دیواری کے اندر کا سب سماں سینما کے اسکرین کی طرح پیش کر رہی تھی۔ ادھر پچھلے عیش کی بازگشت اکرلا کے اندر شیریں نغمے کی آواز کے بجائے قیامت کا شور بن کر گونج رہی تھی لیکن پچھلا عیش اور جنگل کی زندگی کے چند روز نزاکت کے لیے تو ایک پھیکا پھیکا بھولا خواب تھا۔ جب دیکھا کہ کم بخت پکڑ ہی گیا ہے اور کسی صورت پاؤں نہیں چھوڑتا تو ذرا ترچھی ہو کر نہایت کج ادائی کے ساتھ ایک شوں جو کی تو بیچارہ ڈر کے مارے دھتکارے ہوئے کتے کی طرح سکڑ کر جا پڑا اور گرفت سے آزاد ہو کر چلتے ہوئے ایک دوسری شوں میں جیسے "دُور موئے تیرا کالا منہ" کہتی سب کچھ توڑ تاڑ کے آگے لپک گئی۔

برہا کا مارا بدنصیب اکرلا حادثۂ ہجر کی اس ڈرامائی ستم ظریفی پر بدحواس سا ہو گیا۔ بے قراری میں دو تین مرتبہ زمین پر سونڈ پٹخی، بڑی گہری گہری مرتعش سانسوں کا زیروبم ہوا، پھر تھر کی گہری گھٹی گھٹی بدبودار اور چند ہیائی فضا کی جانب سونڈ اُٹھا اُٹھا کر آہستہ آہستہ کرب ناک سی آواز نکالتا رہا۔ "آہ! آہ! آہ! چائیں چائیں چاں توں توں توتہ" جیسے کہہ رہا ہے "بے وفائی ہے نام عورت کا، بے وفائی ہے نام عورت کا!" پھر چند ساعت چٹان کی طرح ساکت اُدھر منہ کیے کھڑا پھر آہستہ آہستہ سونڈ اُٹھا کر بار بار پیشانی تک لے گیا جیسے محبوبہ کو آخری سلام کر رہا ہو پھر ایک مرتبہ گھونسا سا بنا کر پیشانی پر مارا۔ شاید تقدیر ٹھونکی اور اللہ کا مارا جورو کا ٹھاڑا اُنھی قدموں پلٹ پڑا۔

جب ہم پہنچے تو نزاکت نرالی کے پہلو میں جو تھی بھوری دُلھن کی طرح ٹھنڈی سہاگن بنی بیٹھی تھی اور نرالی بڑی سُریلی پیار بھری آواز نکال رہی تھی جیسے زچہ گیر ماں گا رہی ہو جو بعد میں کھلا تو سچا گیت ثابت ہوا کیونکہ نزاکت اُمید سے پلٹی تھی۔

نزاکت کے عشق میں اکرلا کے ساتوں کرباکرم ہو گئے۔ ذرا سی لونڈیا کے آگے ساری بہادری بھی گرد ہوئی اور ڈانٹیں جھڑکیاں بھی سہیں اور دھکے بھی کھائے، خوشامدیں اور منتیں بھی کیں عشق کی رسی میں بندھ کر شہر تک گھسٹے بھی غرض عشق اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی۔ اور وہ بھی گئی۔ ستم یہ کہ جاتے جاتے دُم میں دھاگا بھی باندھ گئی کیونکہ شکاری پارٹی نے یہیں سے کھوج اُٹھا کر تعاقب شروع کر دیا۔

اکرلا کے رُخ، رفتار اور دوسرے قرائن سے اندازہ لگا کر ہم نے جنگل میں کیمپ لگانے کے بجائے محکمہ جنگلات کا ایک ڈاک بنگلا اپنے قیام کے لیے تجویز کیا اور وہاں فوری انتظامات کے احکام دے کر ہماری پارٹی اکرلا کے پلٹے ہوئے کھوجوں پر روانہ ہو گئی اور ہم جیسے جیسے بڑھے اکرلا کے راستے پر پلٹنے کی نشانیاں دیکھ کر اور جگہ جگہ خبروں سے اندازہ ہوا کہ دو ہفتے کے وصل اور ہم کناری کے بعد ایک دم جدائی و کج ادائی اور بے وفائی کے سنگین المیے سے دوچار ہو کر اکرلا نے شدید ہزیمت اور سخت چوٹ محسوس کی۔ اگر آج کوئی روسیاہ رقیب سامنے ہوتا اور اسے پیس کر سُرمہ کر دیتا تو شاید کچھ دل ہلکا ہو جاتا۔ اس کے واپسی کے کھوج بڑی شدید قسم کی تندگامی اور غیظ کے آئینہ دار تھے۔ جہاں پاؤں پڑا تھا زمین شق ہوتی چلی گئی تھی جو چیز زد میں آئی تھی زیروزبر ہو کر پناہ سی مانگتی دکھائی دیتی تھی۔ درخت جھاڑی ایسا دیسا پتھر، دیمک کے ٹیلے جو چیز سامنے پڑی تھی درہم وبرہم ہوتی چلی گئی تھی جیسے ناکامی شکست اور ہجر کے غم میں وہ تیل ڈوزر کی طرح الٹتا پلٹتا چیرتا پھاڑتا گزرا تھا۔ میلوں کا فاصلہ دوپہر تک طے کر گیا اور اپنی ہانٹ میں پہنچ کر سب سے پہلے ناک کی بے تاری تار برقی پر معلوم کر کے سیدھا اپنے ساتھیوں میں جا پڑا اور بادل کی طرح گرجنے لگا، بڑا رن پڑا اور سب غول منتشر ہو گیا۔ بیسیوں چھوٹے بڑے درخت تنکے کی طرح اکھاڑ پھینکے، نہ کھایا نہ پیا، رقیب کے رقبے ہری بھری فصلوں کے پٹ کر دیے کسی کھیت پر کوئی جھونپڑی یا ٹاٹر باقی نہ چھوڑا۔ جنگل میں رستخیز کا سماں بپا کر دیا۔

جیسے جیسے ہم بڑھتے گئے اُس کے بے پایاں غیظ کا اندازہ ہوتا گیا ہمارے آدمی

ٹریویرا

شوخیٔ لباس
فیشن کی تلاش

دنیا بھر میں بدلتے ہوئے فیشن کے انداز سے ہم آہنگ
کم سے کم وقت میں صاف. کریز سے بے نیاز. سکڑنے کی
فکر سے آزاد. کاٹن پولی ایسٹر کا مناسب ترین امتزاج
بس دھوئیے اور پہنیے، آپکی طرز شخصیت کے عین مطابق۔

ہر موسم کے لیے جدید ترین پولی ایسٹر

کوہ نور کی جانب سے

KIL (T) 2 75

SCAA

جو ہم نے نیچے لور کیمپ سے چھوڑے تھے، ہمیں جگہ جگہ ملے اور اُن کے ذریعے ہمیں مجملاً حالات کا علم ہوتا گیا۔ ہم تسکرادا کرتے جا رہے تھے کہ کہیں سے کسی آدمی کے مارے جانے کی خبر نہیں ملی تھی اور دیہات میں خیریت رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے سے یوں بھی جو کتنے تھے، پھر نزاکت کے اغوا کے بعد ہمارے آدمیوں نے جو تگ و دو کی تھی، اُس سے دیہاتی بہت ہوشیار ہو گئے تھے حالانکہ ابھی تک ہمیں بہت تھوڑی واقفیت بہم پہنچ سکی تھی۔ مستی میں جب ہاتھی اور ہتھنی جمع ہوتے ہیں تو بڑی گہری خلوت چاہتے ہیں۔ جولاں گاہ بھی بڑی محدود ہو جایا کرتی ہے۔ اب جو دس پندرہ روز غائب رہ کر ایک دم اکرڑا اپنی طویل و عریض جولاں گاہ میں نمودار ہوا اور یہ قہر و غضب کی نشانیاں جگہ جگہ جنگل میں نظر آئیں تو دیہات میں سخت ہراس پھیل گیا اور عام طور پر یہ افواہ پھیل گئی کہ اکرڑا کو سرکار نے ریاست کے فیل خانے میں قید کرا لیا تھا اور وہ قید خانے کا پھاٹک توڑ کر بھاگ آیا ہے اور غصے کے مارے بولا گیا ہے۔ شاید قید ہو آنے والی افواہ شہر کے قریب تک پہنچنے والی بات کی مسخ شدہ اور بڑھی چڑھی شکل تھی لیکن درحقیقت قید خانے میں رہ بھی کیا گیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہتھنی مون کے شروع ہوتے ہی تین چار روز کے اندر نزاکت پر حبِ وطن کا جوش غالب آ جاتا اور وہ گھر بھاگ کھڑی ہوتی تو کیسا ڈرا اور کہاں کی وحشت ہوتی، مانس گندھا اور شہر کی گھما گھمی۔ مجنوں کو اپنی لیلا کے سوا اور کچھ نہ دکھائی پڑتا اور اسیرِ محبت و شہیدِ ناز اکرڑا غارت گرِ ہوش و آگہی نزاکت کے ساتھ اسی طرح حالِ دل بیان کرتے ہوئے کششِ عشق میں پیچھے پیچھے ایک رفتار کھنچے چلے آتے اور دیوانہ وار فیل خانے کے اندر دکھائی پڑتے اور حالِ دل ختم نہ ہو پاتا۔ کئی مثالیں بڑے وحشی قسم کے جنگلی جانوروں کی ہمارے تجربے میں تھیں جو کیفیتِ شبِ ہجراں بیان کرتے ہوئے اور تفسیرِ قلبِ محزوں کرتے ہوئے تدبیرِ وصل میں مجنوں کی طرح سرزمین لیلا جانے والے ناقہ سوار کے ناقے کی دم پکڑے پکڑے سچ مچ پیاری لیلا کے دیس میں پہنچ گئے اور پہنچ کر بھی حالِ دلِ زار ہی بیان کرتے رہے اور داستانِ ہجر اور کششِ عشق ختم نہ ہوئی، خود ختم ہو گئے۔

اگرچہ جما میاں شتوں کے استاد قسم کے شکاری تھے، کوئی جانور ایسا نہ تھا جو انھوں نے بے شمار کی حد تک شکار نہ کیا ہو اور شیر کے شکار میں تو انھیں یدِ طولا حاصل تھا۔ ایک بڑے اسپورٹس مین کی طرح وہ ہر قسم کے شکار کے متعلق اپنا ایک مخصوص نظریہ اور اصول رکھتے تھے، ہاتھی کا شکار اُن کے نزدیک بڑے اسپورٹ کی تعریف ہی میں نہ آتا تھا اور نہ اس کا انھیں کوئی عملی تجربہ تھا، اور اس سلسلے میں کچھ مخصوص دلائل و براہین تھے جو ایک حد تک منطق پر پورے اُترتے تھے۔ بقول اُن کے کہ بجز اس کے ہاتھی کا شکار بہت وزنی ہڈی والا شکار ہے بقیہ اور شکاروں کے جتنے لطف ہیں، وہ اس میں مفقود ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ اُس کے دیو ایسے جسم پر کسی جگہ بھی گولی لگانا کوئی کمال نہیں ہے لہٰذا نشانہ بازی کے فن کا لطف تو لیں گیا۔ جنگل میں چلتا ہے تو یہاں تک اِرد گِرد کی گھاس، شاخیں، بیلیں ٹوٹتی چلی جاتی ہیں اپنے پیچھے جو کھوج چھوڑتا ہے وہ بالعموم اچھی خاصی پگڈنڈی کی شکل میں ہوتا ہے، تلاش اور تعاقب کا مزا لیں گیا۔ پھر آنکھوں سے تقریباً معذور سا ہے بس ناک اور کان سے کام لیتا ہے، ہوا کے رخ اور پاؤں کی چاپ کی احتیاط رکھو۔ پچاس گز کے اندر آپ کی موجودگی کا اسے احساس نہ ہو گا، وہ گھبر گھار دالا لطف بھی نہیں ہے۔ تقریباً بے ضرر مخلوق ہے۔ عام طور پر نہ جانوروں کو گزند پہنچاتا ہے نہ آدمیوں کو بالعموم جنگلی گھاسوں اور پتیوں سے پیٹ بھرتا ہے مستی کے زمانے میں جب زیادہ جوش پر ہوتا ہے تو کبھی کبھی بے قصور بھی خونی مشہور ہو جایا کرتا ہے اور بے موت مارا جاتا ہے، اکثر خونی ہاتھی کے دھوکے میں جنگل کے اندر بعض بے گناہ شکار ہو جاتے ہیں اور پھر محکمے کی جانب سے جواب طلبیاں ہوتی ہیں اور جب خونی ہاتھی کے شکار کو نکلو اور یہ پابندیاں اور اندیشے لگے ہوں تو پھر شکار کا لطف تو کرکرا ہو جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے باوجود وہ ہمارے پُرجوش رکن تھے اور اپنے خالص فوجی کردار کے تقاضے کے مطابق پوری اسپورٹس مین اسپرٹ کے ساتھ اکرڑا کے استیصال میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یوں بھی ریاست کے میرِ شکار ہونے کی حیثیت سے ایک طرح یہ اُن کے منصبی فرائض میں تھا اور ریاست اور ضلع نینی تال دونوں جگہ کے محکمہ جنگلات کے عمال کی آنکھیں انھی کی جانب لگی ہوئی تھیں اور وہ سمجھتے تھے کہ اس بلا سے صرف جما میاں ہی نجات دلا کر انھیں رو براہ کرا سکتے ہیں۔

جانئے استاد خالی ست، جیسا کہ بیان کیا، اگرچہ جما میاں کو ہاتھی کے شکار کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر وہ ہاتھی تو در کنار جنگل کے کیڑے مکوڑوں تک کے مزاج اور اطوار سے محرم تھے لیکن انھوں نے یہیں سے اکرڑا کے راستے کی وہ پیشین گوئی کی تھی جیسے راہِ فرار میں وہ اُس کی پیٹھ پر سوار تھے اور اسی بنا پر انھوں نے یہ رائے دی تھی کہ قیام کا انتظام تھیل بلاس پور کے جنگل کے اندر جو بڑا دو منزلہ ڈاک بنگلا ہے اُس میں ہو کیونکہ انھیں یقین تھا کہ یہ شہر نیاہ کا بھاگا ہوا اسی نواح میں پہنچے گا لہٰذا نہایت وثوق کے ساتھ ایک ٹرک پر اسباب لدوا کر یہاں اس ڈاک بنگلے میں پہنچا دیا گیا۔ پھر نہایت فن کارانہ انداز میں خاں صاحب محمود خاں کے مشورے سے یہ انتظام کیا کہ اسپورٹنگ فورڈ سروس روڈ پر رہی اور ہم لوگ اکرڑا کے کھوجوں پر چلے جو کبھی عین سروس روڈ پر جاتے تھے اور کبھی سروس روڈ سے دس دس پانچ پانچ میل اِدھر اُدھر جا پڑتے تھے اور کبھی دو دو تین تین میل کے قریب متوازی چلتے تھے۔ چند گھنٹے چلنے کے بعد ماہرِ جبلت جما میاں نے اندازے لگانا شروع کیے۔ کئی کئی میل انھوں نے سروس روڈ پر ہم سب کو کار میں بٹھا بٹھا لیا اور کھوجوں کا رُخ جانچ کر پانچ پانچ سات سات میل سروس روڈ پر چل کر آگے سے پھر کھوج پکڑ پکڑ لیے اور اس طرح میلوں کا دھاوا مار لیا اور تیسرے پہر کے وقت جما میاں نے جیسے ایک ماہر نجومی کی طرح قطعی حاکمہ کر دیا کہ نخاد اکرڑا کے روندے ہوئے راستے پر باقاعدہ کھوج لیتے ہوئے چلو یا براہِ راست سروس روڈ پر فورڈ پر سوار ہو کر پہنچو، یہ کھوج اسی ڈاک بنگلے کے نواح میں پہنچیں گے جہاں ہمارا قیام ہے، اگرچہ ابھی ڈاک بنگلا سیدھے راستے سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر تھا لیکن ہم نے تھوڑی سی بحث کے بعد اُن کی ہدایت قبول کر لی، یوں بھی شام آ رہی تھی۔ ہاتھی کی رفتار سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوش میں بھرا چلا ہی

جا رہا ہے اور ابھی میلوں تک یوں ہی جائے گا اور خاصی دیر بعد مائل بہ سکون ہوگا۔ دن لوٹ چکا تھا۔ کھوجوں کھوجوں نہ معلوم کتنے میل طے کرنا پڑتے، کھوجوں پر تعاقب کرنے کا وقت نہ تھا، ہم لوگ سوار ہوگئے اور تقریباً سوا گھنٹے میں ڈاک بنگلے پہنچ گئے۔

یہاں بستر لگے ہوئے تھے اور چولہا گرم تھا۔ جس جس کو غسل کرنا تھا، غسل کیا اور جب ہم سب کپڑے بدل کر اور ایک سو ہوکر بڑے کمرے میں چائے کی میز کے گرد جمع ہوئے، چائے اور کافی کے گرم گرم گھونٹوں کے درمیان ہماری مجلسِ شوریٰ گرم ہوئی تو کسی نوکر نے بتایا کہ چوکیدار کہتے تھے کہ رات اکرا یہیں کہیں ڈاک بنگلے کے قریب تھا اور ہم سب اچھل پڑے اور سب کی نیاز مندانہ نظریں ایک دم استاد جگا میاں کی جانب اٹھ گئیں جو بالکل مطمئن اور خاموش بیٹھے تھے۔ انداز سے معلوم ہو رہا تھا جیسے کہہ رہے ہیں کہ یہ تو خیر یقینی بات تھی۔ انھوں نے آہستہ سے کہا کہ چوکیدار کو بلاؤ اور بڑے استاد انہ اور خود اعتمادانہ انداز میں چائے پیتے رہے۔ چوکیدار نے بیان کیا، پچھم کی جانب تقریباً میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک جوہڑ ہے، رات اس پر ہاتھیوں کا بڑا غول جمع تھا۔ ایک دم آدھی رات کو جیسے قیامت سی مچ گئی، بادل گرجنے لگے۔ خوف کے مارے ہم لوگوں نے اپنے کوارٹر چھوڑ دیے اور بنگلے کی چھت پر چڑھ گئے۔ یہاں آوازیں اور بھی واضح ہوگئیں۔ ہاتھیوں کی گرج، ہتھنیوں کی چیخیں پوری فضا سر پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ درختوں پر بسیرا لیتی ہوئی چڑیاں چہچہا پڑیں، دُور دُور تک مرغیاں کڑکڑا پڑیں، مور کڑک اٹھے۔ اگر اندھیری رات ہوتی تو بہت ہراس پھیل جاتا، پھر بھی دو تین گھنٹے یہ عالم رہا کہ زمین ہلتی سی رہی، معلوم ہوتا تھا کہ کئی ہاتھی مل کر ایک ہاتھی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جگا میاں "ہوں! ہوں!" کرکے غور سے سنتے رہے۔ ایک آدھ سوال کیا جس سے بعض چیزوں کی اور بھی وضاحت ہوگئی۔

میرے دل میں خیال آیا کہ خیر کھوجوں پر تعاقب تو صبح سے شروع کریں گے لیکن چونکہ جگہ زیادہ دُور نہیں ہے لہٰذا کیوں نہ ابھی جا کر دیکھا جائے۔ میں نے کلائی پر نظر کی پھر میری نگاہ باہر دھوپ کی طرف اٹھی، ابھی ڈیڑھ گھنٹہ دن باقی تھا۔ جگا میاں میری جانب دیکھ کر بولے: "کیوں؟ کیا مطلب ہے؟"

"میاں! میری رائے یہ ہے کہ ابھی اتنا وقت ہے کہ ہم لوگ کل کے لیے تھوڑا بہت میدان دیکھ لیں پھر رات میں مشورہ کرکے طے کرلیں کہ صبح تڑکے سے ہمیں کس سمت چلنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوں! یہی میں کہنے والا ہوں۔ کم سے کم کچھ اندازہ تو ہو جائے گا۔"

اور ہم چند شوقین چل پڑے۔ جوہڑ کے کنارے پر مہابھارت کا سماں تھا۔ ایک ہاتھی نے تین ہاتھیوں سے تو آخری جنگ لڑی تھی۔ پہلے تو اس نے پورے غول سے مقابلہ کیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ جب سب کو شکست دے دی تو تین من چلے پلٹ پڑے اور انھوں نے بڑے دل گردے کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن میدان اسی کے ہاتھ رہا تھا اور تینوں شکستِ فاش کھا کر بھاگے تھے اور ایسے بدحواس کہ سمت کا تعین بھی نہ کرسکے تھے اور نہ راستے کا شعور رہا تھا جو ہاتھی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور نہ ایک کو دوسرے کی سُدھ بُدھ رہی تھی اور بُری طرح زخمی ہوئے تھے۔ زیادہ وقت تو نہ تھا مگر جتنا بھی ہم کھوجوں پر چل سکے، اس سے اندازہ ہوا کہ لڑائی تو خیر میدان میں ہوئی تھی لیکن ہزیمت خوردہ جس جس راستے پر گئے تھے، بل ڈوزر کی طرح جھاڑیوں اور گھاس کا ستھراؤ کرتے چلے گئے تھے اور خون کے بڑے بڑے ٹپکے کھوجوں کے ساتھ ان کے شدید زخمی ہونے کے گواہ تھے۔ بس اونچی نیچی گھاس میں چھوٹی بڑی جھاڑیوں میں پیچ در پیچ بیلوں میں موٹے پتلے درختوں کے درمیان ان کا راستہ اپنے آپ بنتا چلا گیا تھا۔ تمام گھاس پر اور جھاڑیوں پر رات کا جما ہوا خون لگا ہوا تھا۔

ہزیمت خوردہ اور فاتح دونوں فریقوں کے راستے پر خون بہا ہوا تھا۔ سب کے کھوج ایک جیسے تھے۔ محکمۂ جنگلات نے جو پیمائش اکرا کے کھوجوں کی بھیجی تھی، وہ ناپ تقریباً ہر نوجوان ہاتھی کے کھوجوں کا ہوتا ہے۔ دونوں ہی کے کھوج تند گامی کے مظہر تھے لیکن ایک کھوج ایسے تھے جن سے خیر تند گامی کا تو اندازہ ہوتا تھا لیکن بدحواسی نہیں تھی بلکہ نسبتاً پُر اطمینان اور جھومتی ہوئی چال معلوم ہوتی تھی۔ یہی کھوج فاتح کے تھے۔ میرے خیال میں یہی اکرا تھا حالانکہ بعض ساتھیوں نے اختلاف کیا اور اکرا کے کھوج دوسرے سمجھے۔

رات گئے تک ہم لوگ بحث کرتے رہے۔ کل صبح کے لیے پروگرام پر مختلف رائیں رہیں۔ ان آدمیوں میں سے چند لوگ جو ہم نے بجے پور کیمپ سے جاسوسی اور اکرا کی نقل و حرکت پر مامور کیے تھے، ہمارے یہاں پہنچنے کی خبر پا کر آگئے تھے۔

ایشیا کے عظیم جاسوسی ناول نگار

ابنِ صفی بی اے کے شوخ و شنگ قلم سے نکلا ہوا حسین مرقع

ڈپلومیٹ مُرغ

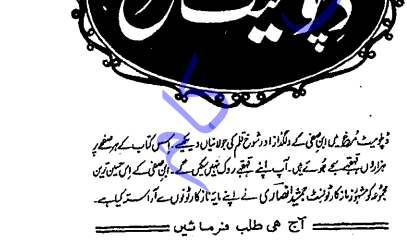

ڈپلومیٹ مُرغ میں ابنِ صفی کے دلگداز اور شوخ قلم کی جولانیاں دیکھیے۔ اس کتاب کے ہر صفحے پر ہزاروں قہقہے بجھے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے قہقہے روک نہیں سکیں گے۔ ابنِ صفی کے اس حسین ترین مجموعہ کو مشہورِ زمانہ کارٹونسٹ جمشید انصاری نے اپنے مایۂ ناز کارٹونوں سے آراستہ کیا ہے۔

آج ہی طلب فرمائیں

قیمت : ۱۳/۵۰ روپے

*

احبابِ ادب ۲/۸ اے ۵ ناظم آباد کراچی

ان میں سے دو ایک ایسے شاطر تھے کہ نزاکت کا اغوا ہونے کے بعد دوسرے تیسرے روز سے ہوا کا رُخ اور چاپ بچا کر بڑی چابک دستی سے سر ہتھیلی پر رکھے سائے کی طرح ساتھ لگے رہے تھے۔ یہ لوگ تقریباً پیشہ ور شکاری تھے۔ رُخ کا صحیح اندازہ لگانے، فن کارانہ انداز میں تعاقب کرنے، دبے پاؤں چلنے اور موقع پڑ جانے پر پتھر کی طرح جہاں کے تہاں جم کر رہ جانے میں بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے ہمیں گھڑی گھڑی کی تفاصیل سنائیں، جن جن جگہوں پر اکڑا نے ہنی مون منایا تھا اور جہاں جہاں نزاکت نے دادِ عیش دی تھی، تمام حالات چشم دید بیان کیے۔ اُن میں سے ایک کی ذہانت اور مستعدی اور دم خم سے میں بہت متاثر ہوا۔ اُس کا نام روما تھا۔ وہ سال بھر پہلے بھی ایک مرتبہ میرے ساتھ شکار میں رہا تھا۔ نیم خانہ بدوش اور جنگلی ہونے کے باوجود اُس نے بڑے مزے لے لے کر ڈرامائی انداز میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ اکڑا کے وصل کے بعض سین بیان کیے اور خاص طور پر مطیع ہونے اور نزاکت سے ڈرنے کا حال تو بڑے ہی مزاحیہ انداز میں بیان کیا جس کے دوران میں بعض باتوں سے میں نے اندازہ کیا کہ پہلے درجے کا بے باک اور شوقین شکاری ہے۔ دن میں تو نزاکت اور اکڑا ہر گھڑی اُس کے سامنے رہے ہی تھے لیکن اُس نے صبح اُن کے کھوج دیکھ دیکھ کر اور قرائن کی صحیح جولیں بھڑا بھڑا کر تقریباً ہر گھڑی ان کی ہر رات کی نگہ و دو پر نظر رکھی تھی۔ بعض مواقع پر وہ اُن سے اس قدر نزدیک پہنچ پہنچ گیا تھا کہ صرف ہوا کے سہارے بچا رہا ورنہ مارا جاتا۔ پھر ایک دم اس نواح سے اکڑا اور نزاکت دونوں کے غائب ہو جانے پر

انھیں جو خلفشار پیدا ہوا اور دو دن وہ سب بھٹکتے پھرے، وہ تمام حالات بیان کیے۔ غرض جنگلی پارٹیوں کی کارگزاریوں سے ہم لوگ بہت متاثر ہوئے اور خاص طور پر میں نے روما کی کارگزاریوں کو بہت سراہا اور اس ٹرپ میں اسے بالکل اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کر لیا۔

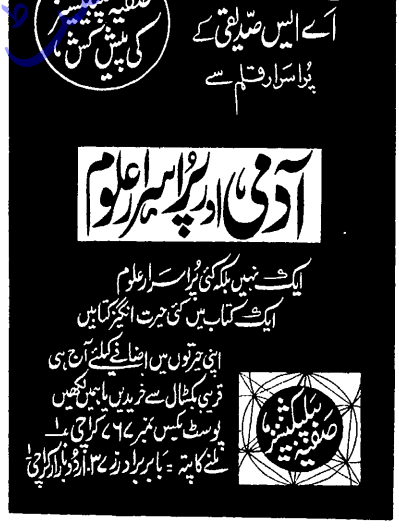

رات گئے تک ہماری مجلسِ شوریٰ چلتی رہی جو کھانے کی میز سے شروع ہوئی تھی۔ اگرچہ چچا میاں یہ طریقہ اچھا خیال نہ کرتے تھے مگر اس کے سوا اور کوئی صورت بتا بھی نہ سکتے تھے کہ کھوج لے کر زمین سے شکار ہوگا۔ ایسا شکار بڑی بے باکی کا کام تھا۔ اپنے نشانے اور ہتھیاروں کی ضرب کے علاوہ بہت کچھ اپنی قسمت پر بھروسا کر کے شکار کرنا پڑتا تھا۔ ہرچہ بادا باد، جو کچھ خطرہ اور رجحان جوکھم تھا سب کے سامنے تھا لیکن شاید اسی میں شکار کا پورا لطف بھی مضمر تھا۔ بھاری گولی والے دونالی رائفلوں کے دو سیٹ ساتھ تھے۔ ۴۰۰/۴۵۰ بور کی چار جوڑیاں اور دو جوڑیاں ۵۷۷ بور کی۔ اوّل الذکر ہمیں زیادہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ خود چچا میاں ۵۷۷ بور پسند کرتے تھے۔ یہ اوّل الذکر سے زیادہ طاقت ور اور شدید ضرب والا تھا لیکن ساتھ ہی بہت وزنی تھا اور دھکا بھی شدید دیتا تھا۔ پھر یہ ایک متروک قسم کا انیسویں صدی کے اواخر کا ہتھیار تھا۔ اگرچہ ہاتھی کے شکار میں مہلک ترین ثابت ہوتا لیکن لاد کر چلنا اور استعمال کرنا مشکل تھا۔ ۴۰۰/۴۵۰ بور نسبتہً اس کے بعد کی ایجاد تھا اور ہر پہلو سے مناسب تھا۔ ہم سب نے اسی کو پسند کیا۔

ہماری مجلسِ شوریٰ گیارہ بجے رات کو ختم ہوئی۔ دو فاریسٹ گارڈوں اور ایک رینجر کی ڈیوٹی نینی تال کے محکمۂ جنگلات کی جانب سے ہمارے ساتھ لگی تھی۔ یہ لوگ بے چارے اس کے سوا کہ مشورے کے وقت چپ چاپ بیٹھے رہیں اور کسی قابل نہ تھے۔ حتیٰ کہ رینجر تو نکل کر جنگل میں دو چار میل ساتھ چل بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ کے لیے روما کو منتخب کیا، دوسرا آدمی بندوق بردار تھا اور تھیلا وغیرہ لٹکا کر چلتا تھا، وہ سیدھا سادا دیہاتی تھا۔

رات کے اخیر حصے میں جیسے کسی غیر معمولی موسمی تبدیلی کے سبب میری آنکھ کھلی تو میں نے اندازہ کیا کہ پہاڑی ہوا کے مخصوص جھونکے بہم چل رہے ہیں۔ ویسے تو ہم ہمالیہ کے دامن اور ترائی بھابھر کے بسنے والے لوگ اس پہاڑی ہوا سے خوب آشنا ہیں حتیٰ کہ تمام دن ہمارا میدان تپتا ہے، لُو ہوتی ہے اور شام ہوتے ہی بڑی سبک رفتاری سے شمالی ہوا چلنے لگتی ہے اور بڑی پیاری خنکی ہو جاتی ہے لیکن اس مخصوص موسم میں اور اس رفتار کے ساتھ جب یہ ہوا چلتی ہے تو ہلکی پھلکی بارش کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور مجھے جو اندیشہ تھا، وہ پورا ہو کر رہا۔ صبح ہوتے ہوا ٹھہری اور ایک ہلکا سا چھینٹا پڑ گیا اور کل کے پروگرام کی سب سے بڑی قباحت سامنے آگئی یعنی کھوج تو باقی رہ گئے لیکن رات کے کھوجوں پر بوندوں نے پہلے اور بعد کے یہاں تک کہ شروع شب کے اور آخری رات کے نشانات کی تخصیص مٹا دی اور اس صورت میں گویا وقت کا اندازہ بالکل ختم ہو گیا۔ صرف قرائن پر بھروسا کر کے چلنا رہ گیا۔ صبح جب ہم بیدار ہوئے تو یہ قباحت ہر ایک ذہن میں تھی کہیں۔ صبح

صفیہ پبلیکیشنز کی پیش کش
٢
اے ایس صدیقی کے
پُراسرار قلم سے
آدمی اور پُراسرار علوم
ایک نہیں بلکہ کئی پُراسرار علوم
ایک کتاب میں کئی حیرت انگیز کتابیں
اپنی حیرتوں میں اضافے کیلئے آج ہی
قریبی بکسٹال سے خریدیں یا ہمیں لکھیں
پوسٹ بکس نمبر ۷٦۷ کراچی ۱
ملنے کا پتہ = بابر برادرز ۳۷- اُردو بازار کراچی ۱
صفیہ پبلیکیشنز

کھوج ملنا بڑا مشکل ہے لیکن مجھ سے روما نے آہستہ سے کہا کہ میں آپ کو بالکل صحیح کھوجوں پر لے چلوں گا۔

جب ہم جنگل میں پہنچے تو کل اور پرسوں کی درمیانی رات والی طوائف الملوکی، جنگ اور بھاگ دوڑ سے تمام جنگل درہم و برہم تھا۔ جگہ جگہ گھاس، جھاڑی، درخت کوئی شے اپنی جگہ نہ رہی تھی۔ جیسے جدھر جس کا منہ اٹھا تھا، اندھا دھند بھاگتا چلا گیا تھا اور پھر ستم یہ کہ بارش نے نئے اور پرانے سب نشان یکساں کر دیے تھے۔ البتہ ابھی خون نہیں دُھلا تھا۔ چار کھوجوں پر خون تھا۔ ہماری چار پارٹیاں انھی پر چل پڑیں۔ روما مجھے اُن کھوجوں پر لے کر چلا جن کے متعلق میں نے کل شام اندازہ کیا تھا کہ باوجودیکہ خون کے نشان ساتھ ہیں لیکن یہ ہاتھی نسبتہً اطمینان اور فطری چال کے ساتھ گیا ہے اور جس کے متعلق مجھے گمان ہوا تھا کہ یہ اکڑا کے کھوج ہیں اگرچہ پارٹی کے بعض ساتھیوں اور خود جمامیاں کی رائے یہ تھی کہ یہ پٹا ہوا ہاتھی ہے اور کمزوری اور چوٹ کے سبب آہستہ آہستہ گیا ہے۔ بہرحال سب کے اختلاف کے باوجود میں نے اپنی اور پھر روما کی رائے ایک اور ایک گیارہ خیال کی اور بسم اللہ کر کے ان کھوجوں پر چل پڑا۔ روما کے ہاتھ میں ایک برچھا تھا۔ ایک اور آدمی بھی ساتھ تھا جو میرا دوسرا رائفل اٹھائے ہوئے تھا۔ کھوج لینے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ جما ہوا سیاہ خون رات کی بوندوں سے بہہ بہہ کر اور بھی زیادہ واضح ہو گیا تھا۔ یوں بھی ہاتھی کے کھوج بہت واضح ہوتے ہیں اور جب ہاتھی غصے میں گیا ہو تو پھر ایک ہی مرتبہ میں پگڈنڈی چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی اور ہم دونوں نے بوندوں کے مسخ سا کر دینے کے باوجود انھی کھوجوں پر جگہ جگہ ہاتھی کے ٹھیرنے سے اندازہ لگایا کہ وہ یہاں اس وقت تھا۔ یہاں تک کہ وقت اور رفتار کا اندازہ کرتے ہوئے ہم نے تمام دن طے کیا۔ پھر اپنے خیال میں اُس کا تمام رات کا راستہ طے کیا پھر آج صبح کا اور اب ہم اپنی دانست میں صحیح راستے پر وقت کے عین مطابق چل رہے تھے کہ ایک دم ہم دونوں کے قدم ٹھیر گئے۔ ہمارے سیدھے ہاتھ کی جانب سے ایک اور ہاتھی کے کھوج آئے تھے اور جن کھوجوں پر ہم چلے جا رہے تھے انھیں کاٹتے ہوئے ہمارے بائیں ہاتھ کو نکلے چلے گئے تھے۔ یہاں ہم دونوں کے لیے ایک لمحۂ فکر پیدا ہوا۔ پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں بات ہوئی۔ پھر بہت آہستہ آہستہ بولنا پڑا۔ بارش کی وجہ سے پہلے اور بعد کے کھوجوں کی تو پہچان مٹ ہی چکی تھی۔ اب یہاں دو تین سوال سامنے آئے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ یہ کون سے ہاتھی کے کھوج ہیں؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ یہ جس ہاتھی کے بھی کھوج ہیں اور جس سمت کو بھی گئے ہیں، اس کی جانب ہوا ہم پر سے گزر کر جا رہی ہے اور وہ ہماری بُو لے سکتا ہے لیکن جن کھوجوں پر ہم چلے آ رہے تھے، اُن پر خون کے نشان تھے اور ان نئے کھوجوں پر خون نہیں تھا۔ بس یہی ایک نشانی ہمیں ملی جس سے ہم نے یہ فرض کیا کہ یہ کسی اور ہاتھی کے کھوج ہیں جو یہ ضرر ہے اور یہیں کہیں چار چھ میل کے اندر جنگل میں آرام کر رہا ہو گا کیونکہ بالعموم ہاتھی دن کے وقت چلتے پھرتے نہیں ہیں جب تک کہ کوئی خاص وجہ نہ ہو۔ یہاں پہنچ کر میں نے ذرا گہری توجہ سے اپنے جغرافیائی ماحول کا جائزہ لیا تو میرے بائیں ہاتھ پر شمال مغرب کی جانب پہلے گھنا جنگل، جگہ جگہ میدان پھر نیچی نیچی پہاڑیاں اور پھر پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ جنوب مشرق میں لامتناہی جنگل چلا گیا تھا اور غیظ میں دیوانے ہاتھی کے جن پُرپیچ و خم راستوں پر میں چل رہا تھا وہ مجھے سامنے دریائے کوسی کے کنارے لے جاتے معلوم ہوتے تھے۔ کچھ اشاروں اشاروں میں بات ہوئی۔ میں نے پوری طرح رضا بھی نہیں دی اور روما مجھ سے علیحدہ ہو کر اُن نئے کھوجوں پر چل پڑا۔ میں سمجھا کہ کچھ دُور جا کر پلٹ آئے گا۔ صرف کھوجوں کا اندازہ لگانے کے لیے چند قدم جا رہا ہے مگر اُس نے مجھے بدستور انھی کھوجوں پر جن پر ہم چلے آ رہے تھے، بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اشارے ہی سے یہ بھی یقین دلایا کہ میں بہت جلد آپ سے آ کر مل لوں گا اور وہ چل پڑا اور شاید وہ بڑی عجیب گھڑی تھی جس میں اُس کے دل کے اندر مجھ سے علیحدہ ہو کر اُن کھوجوں پر جانے کا خیال پیدا ہوا۔ میرے دل میں آیا کہ میں اسے ادھر یوں بے قاعدہ جانے سے روک دوں لیکن میں مجبور ہو گیا۔ وہ جانے کا خود ہی ارادہ کر کے اور خود ہی میری اجازت لے کر چل پڑا تھا یا چند قدم بڑھا کر اُس نے جانے کا ارادہ کیا ہو گا۔ اب میری جانب اُس کی پشت تھی۔ آواز دینے کا موقع نہیں تھا حتیٰ کہ منہ سے سیٹی بجا کر بھی اپنی جانب مخاطب کرنا خلاف احتیاط تھا۔ میں دو تین منٹ اُدھر منہ کیے کھڑا رہا کہ اگر مڑ کر دیکھے تو اشارے سے بلا لوں اور جانے سے باز رکھوں لیکن اُس نے مڑ کر

نہیں دیکھا اور ہمہ تن توجہ بنا کھوجوں پر بڑھتا رہا اور جیسے جیسے وہ مجھ سے دور ہوتا گیا میرے اندر اسے واپس بلانے کی خواہش تیز ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا تو جیسے میرے دل کے اندر اسے واپس بلانے کی خواہش ہوک سی بن کر اٹھی مگر کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا' خیر ڈھونڈنے سے مل تو جاتا ہے۔ میں نے اپنے کھوجوں پر بڑھنا شروع کر دیا بمشکل دو میل چل پایا ہوں گا کہ میں نے غور کیا دریائے کوسی بہت قریب ہے۔ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں یہ ہاتھی دریا پار نہ اتر گیا ہو تو پھر تعاقب میں یہاں سے دوسرا نقشہ ہو جائے گا۔ اب تجسس بڑھا۔ یہاں تک کہ میں بالکل دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر کچھ کچوریاں سموسے کھانے کا ارادہ کیا اور دو گھونٹ پانی پینے کا خیال آیا کہ میں ایک دم اچھل پڑا اور کھانا پینا سب بھول گیا جیسے میری چھٹی حس بڑے زور سے برسرِ کار آگئی۔ خطرہ، کوئی عظیم خطرہ! میں شکاری ہوتے ہوئے بھی نیک و بد شگون اور چھٹی حس قسم کی چیزوں کا قائل نہیں ہوں۔ اس تحریک کی بنا بھی کچھ نہ کچھ مادّی وجوہ اور سامان ہوتے ہیں۔ دوسری ہی نگاہ میں میں نے دیکھ لیا کہ ہاتھی دریا کے کنارے پہنچ کر پانی میں گھسا ہے اور پانی سے نکل کر غالباً بارشں کے عین وقت کنارے پر رتیلی اور کنکریلی کیچڑ میں لوٹتا رہا ہے اور وہاں سے اٹھ کر دریا کے کنارے کنارے داہنی جانب مڑ گیا ہے۔ جب میں ان کھوجوں پر مڑا تو جیسے خطرے کی ایک لہر سی میرے سینے میں اٹھی کیونکہ یہاں سے اب جو کھوج بڑھے تھے' ان پر خون نہیں تھا کیچڑ میں لوٹنے کے سبب خون بند ہو گیا تھا۔ میرا بندوق بردار جو میرا جھولا اور تھوڑا سا سامان لٹکائے ہوئے تھا کہیں کچھ کھانے پینے کے بجائے ان کھوجوں پر پڑ لیا، دل کچھ مکدر رہا ہو گا اور اسے شاید یہ سوجھ رہی ہو گی کہ کچھ پیٹ میں پڑ جاتا مگر مجھے بہت دور کی سوجھنے لگی۔ تقریباً میل بھر ان کھوجوں پر چلنے کے بعد چھٹی حس نے پھر بڑے خطرے کا الارم دیا میں سنبھلا اور بڑھا اور ایک دو فرلانگ بڑھنے کے بعد دیکھا کہ کھوج دریا کے کنارے کنارے چلتے چلتے پھر سیدھی جانب مڑے ہیں۔ میرے سینے میں کھٹ کھٹ ہونے لگی۔ قدم تیز ہو گئے۔ تقریباً میل بھر دریا کی کترّی میں چلنے کے بعد ہاتھی پھر سیدھے ہاتھ مڑ لیا تھا۔ اب میرا کلیجا دھک دھک کرنے لگا۔ یہ ایک ہی ہاتھی کے کھوج ہیں۔ یہ وہی کھوج ہیں' اُسی ہاتھی کے اور اسی نے اوپر تین چار میل کے فاصلے پر اپنے ہی کھوجوں کو کراس کیا ہے اور کیچڑ کی وجہ سے خون بند ہو گیا۔ لہٰذا ہم تمیز نہ کر سکے اور اُن کھوجوں پر رَدما خواہ مخواہ بے سان گمان چل پڑا۔ اللہ خیر کرے مگر ردما جنگل کا کیڑا ہے۔ بہرحال اُس کے ہاتھ میں ایک برچھے کے سوا کوئی ہتھیار نہیں ہے جیسے بھی ہو مجھے پہنچنا چاہیے مگر اب وہ مجھے نہیں مل سکتا۔ میرے اور اس کے درمیان کم از کم آٹھ دس میل کا فاصلہ پڑ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تو ہم متضاد سمتوں میں چلتے رہے اور اب یہ فاصلہ پورا کرنا؟ میری ہمت بھی جواب دے گئی اور پاؤں بھی۔ سہ پہر ہو چکی تھی۔ تاہم مجھے اپنی جائے قیام پر پہنچنے کے لیے بڑی حد تک اسی سمت چلنا تھا۔ لہٰذا قدم بر داشتہ چلتا رہا اور میل بھر چلنے کے بعد میں نے اندازہ کیا کہ میرے قدم جیسے کسی اندرونی اور غیر مرئی قوت سے اتنی تیز اٹھ رہے ہیں کہ میرے ساتھی کو میرے دوش بدوش چلنا دشوار ہو گیا ہے۔ اب تو دل کے سمجھانے کی بھی گنجائش نہیں رہی یہ کھوج مجھے براہِ راست اسی سمت لیے جا رہے تھے جہاں کراس ہوا تھا اور جب میں گھوم گھما کر پرکار کی طرح پھر اُسی نقطے پر پہنچ گیا جہاں سے ردما علیحدہ ہوا تھا تو ہاتھی کے کھوجوں کے ساتھ ردما کے کھوج بھی ملنے لگے اور میری ریڑھ کی ہڈی میں کوندا سا ہو گیا۔ تقریباً تین چار گھنٹے ہو چکے تھے' نہ ردما پلٹا تھا اور نہ کوئی سیٹی وغیرہ سنائی دی تھی۔ میں جیسے آگے آگے لے خودی اور پیچھے پیچھے ہوش، رونگٹے رونگٹے پر ایک کان اور ایک آنکھ لگائے دو میل اور پہاڑ کی جانب پلٹ گیا اور ایک دم جو چند جھاڑیوں کی آڑ سے نکلا تو ردما کے چیتھڑوں پر کھڑا تھا۔ الامان والحفیظ! پہاڑ سنگھ کا حال تو خیر گارڈ کی زبانی سنا تھا مگر اپنے ساتھی کے چیتھڑے اپنی آنکھ سے دیکھ لیے' چند منٹ ہم دونوں مبہوت کھڑے رہے۔ پھر ذرا سنبھل کر جائزہ لیا تو اندازہ کیا کہ ہاتھی انھی جھاڑیوں میں سو رہا تھا اور اُس نے ایک دم حملہ کر دیا۔ لاش بشرطیکہ اُس کی ظاہری ہیئت سے اسے اس نام سے پکارا جا سکے تو دو بڑے حصوں میں تھی اور کھوپڑی شاید ایک ہی پنج میں کٹورے کی طرح یوں ہی سالم اتر کر دور جا پڑی تھی۔ جن کے ساتھ بھیجے کی پھٹکیں اور انتڑیاں ادھر ادھر منتشر تھیں اور جب زیادہ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ٹانگیں چیر کر ایک حصہ سونڈ میں پکڑ کر درخت کے تنے پر پٹختا رہا ہے اور دوسرا حصہ اگلے پاؤں سے روندتا کچلتا رہا ہے۔ میں نے کئی سال پیشتر ریل سے کٹی ہوئی ایک لاش دیکھی تھی لیکن اُس کی بھی یہ گت نہیں تھی۔ کپڑے کی طرح جھر سے پھاڑنا اور پھر پٹخنا اور کچلنا، مجھے جھرجھری آگئی۔ ابھی دو گھنٹے پیشتر اینڈتا جھومتا مجھ سے علیحدہ ہوا ہے اور ذرا سی دیر میں یہ درگت بن گئی۔

حالانکہ میں صبح کا ناشتہ کیے ہوئے تھا لیکن بنگلے پر پہنچ کر بمشکل ایک پیالی کافی حلق سے اتار سکا۔ رات کا کھانا بھی کیمپ میں کچھ یوں ہی سا کھایا گیا۔ ردما کے اپنے لوگوں میں تو بڑا گہرا ماتم تھا۔ اطلاع پاتے ہی جمع ہو کر وہاں پہنچ گئے اور کریا کرم کیا۔

رات کو جب ذرا سہولت ہوئی اور ہم لوگ اپنی طبیعتیں یک سو کر کے جمع ہوئے تو سب خاموش تھے۔ جمامیاں کے چہرے پر گہرے غم اور فکر کے آثار تھے اور بشرے سے وہ کیفیت ظاہر تھی جو کسی بڑے فوجی سردار کے چہرے پر اپنی فوج کے شکست کھا جانے پر ہوتی ہے۔ اُن کے ڈرائنگ روم میں اب بھی پانچ آدم خور شیروں کی پوستینیں بچھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے شاید ہمارے

چہروں سے ہراس کا اندازہ کر کے اپنا موڈ قصداً بدلا اور مخصوص استادانہ تیور بنا کر مہرِ سکوت توڑ ہی دی "بھئی لڑکو! اس کا وقت آگیا تھا۔ تم نے بتایا نا کہ خواہ مخواہ کترا کر اُن کھوجوں پر پڑ گیا۔ اگر قاعدے میں چلتا تو دو گھنٹے بعد سہی، مقابلہ تو ہوتا لیکن کم از کم دو رائفل تو ہوتے۔"

میں نے کہا "ہاں استاد دو رائفل ہوتے مگر کون جانے کیا نتیجہ ہوتا؟"

"اماں کیا بکتے ہو، اتنا چھوٹا دل کرتے ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ تمھارے رائفلوں کی چار گولیاں اُسے پیوست ہو جاتیں اور ہاتھی ڈھا دیا ہوتا۔"

کسی نے کہا "استاد یہ بہت ہراساں ہیں۔ ان کے ساتھ سے وہ شامت زدہ خواہ مخواہ کٹ کر ان کھوجوں پر پڑ لیا اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے اُس کے چیتھڑے دیکھ لیے۔"

"وہ تو میں نے کہا نا بھئی اس کا وقت آگیا تھا اور اسی بہانے آگیا تھا لیکن ایک بات تم سب لوگ یہ بھی سمجھ لو کہ یہ ذرا سنگین موقع ہے۔ وہ آدم خور شیر والی بات نہیں ہے۔ تم میں سے بعض تو آدم خور شیر کے شکار میں میرے ساتھ بھی رہے ہو اور بھئی صاف بات یہ ہے کہ پہلی خونی ہاتھی تو دور کا کسی سیدھے سادے ہاتھی کے شکار کا بھی تجربہ نہیں ہے اور ہمارے جنگل میں تو پہلی مرتبہ ہاتھی خونی ہوا ہے ورنہ زیادہ سے زیادہ شکایتیں فصلیں اجاڑنے کی کان میں آیا کرتی تھیں۔ اس نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔ لہٰذا میدان چھوڑ کر جانے کا سوال نہیں ہے۔ بھئی ہم کھوج لے کر اور تعاقب کر کے زمین سے آدم خور شیر کو تو مارنا آسان اور محفوظ سمجھتے ہیں لیکن ہاتھی پر یوں چلنا برابر کا معاملہ ہے اور سر ہتھیلی پر رکھ کر شکار کرنا ہے۔"

"کیوں استاد؟" ایک نوجوان جوشیلے ساتھی نے کہا۔

"سنو میاں! یوں کہ آپ کے ساتھ یہ ۵۰۴ اور ۷۔۵ بور کے بھاری رائفل نہیں بلکہ چھ انچ کے دہانے کی توپ ہی کیوں نہ ہو لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتے ایک وار میں ہاتھی ڈھیر ہو جائے گا۔ معمولی ہاتھی آپ کے رائفل کی کاری گولی کھا کر بالعموم بھاگ کر گرے گا اور خونی آپ پر حملہ کرے گا۔ رہا شیر تو کیسا ہی پھرتیلا اور طاقت ور کیوں نہ ہو، یہ رائفل تو بڑی چیز ہے، ۳۲ بور کی ایک گولی میں خواہ کہیں کیوں نہ پڑے، ایک اچھی پٹخ تو کھا ہی جاتا ہے مگر ہاتھی تو ایک بڑی چٹان ہے۔ گرتے گرتے بھی آپ کو سمیٹ لینا معمولی بات ہے۔"

"تو پھر کیا کریں استاد! یہ تو گرم دودھ بن گیا ہے، نہ اگلنے کا نہ نگلنے کا۔ کیا میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں؟"

"لاحول ولا قوۃ! میں یہ کہتا ہوں، میاں میرا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں بچا لیے۔"

"تو پھر آپ ہی کوئی صورت نکالیے آخر خونی ہاتھی کس طرح مارا جاتا ہے؟"

"بھئی وہ جیسے بھی مارا جاتا ہو، ہم نے دیکھا نہیں بس سنا ہی سنا ہے اور جو کچھ سنا ہے اُس کے ہم قائل نہیں ہیں۔ میرے چالیس سالہ تجربے میں

مولوی عبدالغنی ڈار امرتسری

گاندھی جی سے ملنے کے لیے پہنچے۔ گاندھی جی کی سیکرٹری مس سوشیلا نے انھیں دروازے پر روک کے کہا "اُن کی طبیعت اچھی نہیں ہے اگر آپ اُن کے درشن کرنے آئے ہیں تو صرف پاس سے گزر جایئے گا۔ اُن سے بات نہ کیجیے گا۔"

مولوی صاحب نے کہا "تم نے درشن کی خوب کہی۔ اُن کے کان لمبے لمبے اور بدنما ہیں، گال پچکے ہوئے ہیں، چہرہ کالا ہے۔ یہ چیزیں بھلا درشن کرنے کی ہیں؟ میں تو اُن سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

مولوی صاحب بلند آواز میں بول رہے تھے۔ گاندھی جی اُن کی آواز سن کر بولے "آنے دو۔ آنے دو! مولوی ٹھیک کہتا ہے! ہمارا شکل ہی ایسا ہے۔"

آج پہلی مرتبہ خونی ہاتھی سے واسطہ پڑا ہے۔ ریاست میسور اور آسام وغیرہ کے دوستوں سے کچھ واقعات سنے ہیں جن پر عمل کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ آج حماقت ہو گئی ہے کہ تم سب کو کھوجوں پر ایسے چلا کر دیا جیسے سانبھر کا پیچھا کر رہے ہیں، دلیے بغیر گوشت اسی پے جا رہے پر بیتی۔"

"کچھ تو کرنا ہی پڑے گا، یہ تو اب سر پڑ گیا" رینجر نے ذرا ہمت کر کے کہا۔

"بابو جی آپ پریشان نہ ہوں، ہمیں سبھی کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ تو ایک ذرا سا ہاتھی ہے، یہاں تو پہاڑ ہی ڈھا کر پھینک دیں اور سرکشی اور آدم کشی کی پاداش میں تو بڑی بڑی سلطنتیں وقت کے پر اکھیڑ کر پھینک دی جاتی ہیں۔" جمامیاں نے کہا۔

رینجر گھگھیا سا پڑا اور بڑے خوشامدانہ لہجے میں بولا "ہاں میاں! میری روزی پر بات آ بنی ہے، آپ تو خدا کے فضل سے رئیس ہیں، کھیلنے چلے آئے ہیں اور میں آپ ہی سے لو لگائے بیٹھا ہوں۔ اگر آپ لوگ ہٹ گئے تو پھر کوئی نظر نہیں آتا۔"

"ارے مرد آدمی! تم بھی کیا بات کرتے ہو، تمھاری روزی کا معاملہ ہے اور ہمارا فرض ہے۔" خاں صاحب محمود خاں نے کہا۔ پھر استاد جمامیاں کی جانب دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں تھے۔

ذرا سکوت رہا۔ پھر جما میاں بولے "دیکھو بھئی لڑکو! تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم شیر کے شکاری ہیں۔ ہم یہ ہاتھی بھی اسی طریقے سے ماریں گے جیسے شیر مارتے ہیں۔"

سب لوگ ذرا تحیر کے ساتھ اُن کی جانب دیکھنے لگے اور شاید سب کے ذہنوں میں شیر کے شکار کے چلتے طریقے ہی سب گھوم گئے مگر بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بھلا شیر کے شکار کا کون سا طریقہ خونی ہاتھی مارنے میں اختیار کریں گے اور تو کوئی نہیں بولا، محمود خاں اُن سے ذرا آزاد تھے، بولے "میاں کیا لکا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"مچان پر بیٹھ کر اور کل باندھ کر۔" جمّا میاں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ سب مسکرا پڑے۔ خاں صاحب محمود خاں نے کہا۔ "ہاں تو پھر یہ ٹھیک ہے۔"

"ہاں محمود خاں مچان پر بیٹھ کر اور کل باندھ کر ماریں گے انشاء اللہ، اور شیر کی موت نہیں، کتّے کی موت ماریں گے۔"

سب اُن کی جانب جیسے کوئی عجوبہ بات سننے کے منتظر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ایک پان اٹھا کر چبایا۔ دو کش حُقّے کے لگائے۔ یہ کوئی بڑی زوردار اسکیم ظاہر کرنے سے پیشتر اُن کا مخصوص انداز ہوا کرتا تھا۔ پھر ایک گھونٹ سا لیا اور نہایت خود اعتمادانہ تیور بنا کر بولے۔ "انشاء اللہ اگر وہ اُن چٹانوں میں مارا جائے گا۔ جہاں گڑ کی گاڑھی والا لونڈا بھاگ کر چھپا تھا اور وہیں کل کے طور پر نزاکت باندھی جائے گی۔"

محمود خاں چونک پڑے۔ "ایں نزاکت؟ نزاکت کیا کرے گی؟"

"میں نے کہا۔ "جو کچھ کرے گی، وہ آپ دیکھ ہی لیں گے۔ کل علی الصّباح رقعہ بھیج کر بلوا لیجیے۔"

تیسرے ہی روز نزاکت ڈاک بنگلے پر موجود تھی۔ جمّا میاں نے اس دوران میں جاسوسی بہت تیز کرا دی تھی اور کئی بار چٹانوں کا معائنہ کیا تھا اور پتھروں میں بیٹھنے کے لیے نشستیں تک الاٹ کر دی تھیں۔ اکڑا اسی نواح میں تھا اور اُس کی دیوانگی بدستور تھی۔ شروع رات کے حصّے اندھیرے ہوتے تھے، نصف شب سے قبل چاندنی نکل آتی تھی۔

چار نہایت موٹی ہاتھی کی طاقت سے باہر زنجیریں نزاکت کے چاروں پیروں میں ڈال دی گئیں۔ اگلے پیروں والی دونوں قریب کے دو درختوں کے ساتھ اور پچھلی چٹانوں کی نکلی ہوئی دو نوکوں میں اٹکا دی گئیں۔ اس طرح نزاکت تقریباً اچھی طرح کس دی گئی۔ ہم لوگ ایسی راتوں کا مخصوص ہلکا پھلکا کھانا کھا کر سرِشام وہاں پہنچ گئے۔ ان چٹانوں کا ہر حصّہ کئی مرتبہ جا کر معائنہ کر چکے تھے اور ان کے مدود اربعہ رُخ اور ہاتھی کی جولاں گاہ ہر چیز پر غور و بحث کر کے ہر ایک کی نشست پہلے سے طے تھی۔ ان چٹانوں کے چاروں طرف اونچا نیچا جنگل تھا۔ تین سمت یہ جنگل لامتناہی میدان پر تھا اور شمال کی جانب دس بارہ میل تک پتھریلے کنکریلے اونچے نیچے میدان کی شکل میں تھا جس میں جگہ جگہ ہمیشہ پانی سے لبریز رہنے والے جوہڑ اور ٹھہرے ہوئے چشمے اور چوئے تھے۔ بڑا گھنا جنگل تھا۔ اس کے بعد عظیم پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہم لوگ ان چٹانوں میں پروگرام کے مطابق اپنی اپنی متعینہ جگہوں پر جا کر دبک گئے۔ یہ چٹانیں تقریباً تین چار یا پانچ سو مربع گز پر ایک اونچے نیچے سلسلے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کہیں ارد گرد کی زمین سے دس بارہ گز اور کہیں پانچ چھ گز بلند تھیں اور شمال کی جانب آہستہ آہستہ ڈھلوان کی شکل میں اترتی ہوئی پتھریلے میدان سے مل گئی تھیں۔ ہم نے اچھی طرح پڑتال کیا تھا کہ ان کا ہر حصّہ بلندی کے اعتبار سے ہاتھی کی سونڈ کے حملے یا شارخ کی رسائی سے باہر ہے۔ جو حصّہ ڈھلوان کی شکل میں میدان سے ملا ہوا ہے۔ اُس جانب سے بھی اگر ہاتھی چڑھنے کی کوشش کرے گا تو چند گز چل کر بڑھنے سے معذور ہو گا۔ کہیں دس گیارہ بجے کے درمیان چاند نمودار ہوا۔ کٹا ہوا، اداس اداس تیسرے ہفتے کا بے نور بیمار سا چاند اپنی کمزور کرنیں مہیب جنگل پر پھینکنے لگا اور جیسے ہر چیز منوّر کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اداس چاندنی نے پسارا لیا اور جگہ جگہ چیزیں واضح سی ہونے لگیں۔ ہم نے زیادہ قاعدے اور احتیاط سے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔

یوں تو ہمارے تمام شکاری جاسوس جو سائے کی طرح اکڑا کے ساتھ لگے رہتے تھے، سہ پہر ہی سے ہوا کا رُخ، قرائن اور اکڑا کا رجحان بھانپ کر اندازہ کر لیتے تھے کہ آج رات کی چرائی کے لیے کدھر جائے گا؟ کون سے راستے سے جائے گا اور کس راستے سے پلٹے گا؟ یہ تقریباً صد فی صد صحیح ثابت ہوتا تھا لیکن آج خلافِ معمول سرِشام سے ہوا پلٹ گئی۔ ہمارے آدمیوں کا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ اکڑا کسی دوسری جانب فصلوں کی خوشبو لے کر چل دیا۔ پھر وہ نزاکت کی خوشبو نہیں لے سکا۔ ورنہ ہمیں امید تھی کہ شروعِ شب ہی میں کھانے کے لیے جانے کے بجائے ادھر آئے گا۔

جنگل کی رات جھنجھناتی رہی، مخصوص چڑیا بولتی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہیں کہیں گیدڑ ہوکتے رہے، آدھی رات گئے ایک کاکڑ بھونکا۔ اس کے بعد چند چیتل ایک دم چلا پڑے۔ شیر مار قسم کے شکاری جمّا میاں کے کان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اشارے سے بتایا۔ پھر ایک راستے پر سانبھر اور چیتل اور کاکڑ کی آواز پر اشارے کرتے رہے اور بتایا کہ شیر پاگل دار حرکت میں ہے اور پھر آوازوں کے ساتھ ساتھ جیسے اُس کے راستے پر اُس کی سمت انگلی سے اشارہ کر کے اُس کی سمت اور رُخ کا تعیّن کرتے ہوئے ہم سب کو بتاتے رہے۔ پھر سنّاٹا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد ہماری چٹانوں سے قریب ہی ایک گوند یعنی بارہ سنگھا ہوکا۔ اُس کی مہیب آواز بڑی دیر تک ہمارے سینے دہلاتی رہی۔ ہم ایک خوف یا بیزاری جیسے مبہم احساس سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کی جانب بار بار دیکھ لیتے۔ یہاں تک کہ رات بیت گئی۔ زوالِ ماہ کی تاریخوں کا چاند اپنی رہی سہی کمزور روح کھونے لگا۔ نیچے نزاکت تمام رات سونڈ لہرا لہرا کر نہ معلوم کیا کیا خوشبوئیں اور بوئیں لیتی رہی اور جنگل کی ہوا سے کھیلتی رہی۔ اوپر ہم لوگ بیٹھے جھک مارتے رہے۔ چٹانیں یخ ہو گئیں۔ صبح کی مخصوص خنکی نے فضا پر مسلط ہو کر کچھ ہمارے محسوسات بھی بدل دیے اور ہمیں ہلکی ہلکی سردی سی لگی۔ اتنے میں قریب کے

درختوں سے کسی مرغے نے بانگ دے دی۔ اس کے بعد دوسرے نے اور پھر تو شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک ہر مرغا بول پڑا۔ اُن کی قریب دور کی آوازوں کا سلسلہ ہمارے ذہنوں میں جنگل کے مختلف حصّوں کا جغرافیہ ملا ملا کر نقشہ سا کھینچنے لگا اور پھر تیز چیخ اٹھی کہیں کہیں سے کوّوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں سپیدۂ صبح نمودار ہوا اور ایک دم شمالی ہوا ٹھہر گئی۔ پھر آہستہ آہستہ پچھیاؤ چلنے لگا۔ جیسے ہماری رگ رگ چائے مانگنے لگی۔ سب نے اپنے اپنے تھرماس کھول کر جلدی جلدی ایک ایک پیالی چائے انڈیلی۔ چلئے صبح کی روشنی، ہوا کی تبدیلی، چڑیوں کی آوازیں اور بھبھو کی کسلمندی سہی لیکن چہروں کے واضح نظر آنے نے ہم سب کے محسوسات بدل دیے اور جیسے نئے وقت کے ساتھ نئی امّید سی بندھ گئی۔ حالانکہ ساتھ ساتھ یہ بھی احساس تھا کہ یہ بدلے ہوئے ماحول کا اثر ہے، ورنہ گیارہ گھنٹے انتظار کے بعد بھلا اب کیا امّید ہو سکتی تھی کہ ان چند ساعتوں میں آ جائے گا، مگر میں نے جمّا میاں کے تیوروں میں سچی خود اعتمادی اور بڑے اطمینان کی نشانیاں دیکھیں۔ وہ اُس وقت لطف لے لے کر پان چبا رہے تھے اور انھوں نے ایک مرتبہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بڑی خاص امّید بندھائی تو ہم سنبھل گئے۔

ہمارے ساتھ چار جوڑے ۴۵۰/۴۰۰ بور کے دونالے ڈبلی ریجرڈ کے کارخانے کے بنے ہوئے رائفلوں کے تھے اور ایک جوڑا پرانے ۵۷۷ بور کے رائفلوں کا تھا۔ تین سائڈیں جن پر کافی غور و خوض کے بعد ہم لوگوں نے رائے قائم کی تھی کہ انھی میں سے کسی پر اکڑا آئے گا، جمّا میاں نے ہم تین شکاریوں کو دے دی تھیں اور وہ خود اس وقت شکار کرنا تو درکنار، بندوق پکڑنے کے موڈ میں بھی نہیں تھے۔ حالانکہ بڑا ۵۷۷ بور تھامے ہوئے تھے اور ایک درمیانی جگہ سے جیسے ہم سب کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی جو ۴۵۰/۴۰۰ دبائے ہوئے تھے خود خاں صاحب محمود خاں تھے، شکاری بہت کم اور نشانے باز بہت بڑے، میں نے غور کیا کہ ایسے اچھّے موقع پر ہوتے ہوئے بھی اور پھر اکڑا سے رقابت قسم کی دشمنی ہونے کے باوجود اُن کے اندر شکاری والی گدگدی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ لہٰذا وہ بے چارے خود ہی ایک ایسی جگہ بیٹھے تھے، جہاں ہاتھی کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بقیہ دو اور ساتھی جو مناسب پوزیشن لیے ہوئے تھے اور ۴۵۰/۴۰۰ بور کے رائفلوں کی جوڑیاں لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک تو مسٹر رائٹ انگریز انجینیئر تھے جو حال ہی ریاست کے اندر بھاری مشاہرے پر گورنمنٹ آف انڈیا سے منگوا لیے گئے تھے۔ ان کے متعلّق معلوم ہوا تھا کہ وہ آسام اور برما کے جنگلوں کے کھیلے ہوئے ہیں اور کئی ہاتھی بھی شکار کر چکے ہیں لیکن پہلے تو انگریز ہونے کے سبب پھر گورنمنٹ آف انڈیا کے بھیجے ہوئے آدمی ہونے کی وجہ سے ہماری نگاہوں میں اُن کی پوزیشن یوں بھی مشتبہ اور نامانوس سی تھی۔ پھر کچھ کم آمیز اور کم سخن بھی واقع ہوئے تھے جو غالباً اپنے دور میں اُن کا نسلی اور سیاسی تقاضا رہا ہوگا۔ لہٰذا یہ شکاری پہلو بھی مشتبہ ہی سا تھا اور وہ ہمیں جچ نہیں رہے تھے۔ تیسرے ہمارے پرانے ساتھی اور بڑے ھُنڈے اور اونچے شکاری سنگھ بابو تھے۔ یہ رام پور کی سرحد پر ضلع بدایوں کے ایک خوش حال زمیں دار تھے لیکن حضرت ہاتھی کے شکار کو پہلی مرتبہ آئے تھے، جمّا میاں نے اشارے سے ہماری پوزیشنیں از سرِ نو ترتیب دیں اور ایک دم تمام جنگل بقعۂ نور بن گیا۔ مشرق سے قرمزی تابناکیوں کا طوفان پھٹ پڑا۔ جس کے انعکاس سے مغرب میں کچھ آوارہ بادلوں میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ شمال میں سر بہ فلک برف کی چوٹیاں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔ پتّے پتّے پر اوس کے قطرے خون کی بوندوں کی طرح معلوم ہونے لگے اور ہلکی ہلکی نرم رَو ہوا کے ساتھ جیسے پتّا پتّا، بوٹا بوٹا خون کے آنسو رونے لگا اور اوپر سے نیچے تک تمام ماحول ایسے دمک اٹھا جیسے خون کی بارش ہو چکی ہے۔ ہم لوگ نگاہیں دور تک تو پھینک ہی نہ سکتے تھے۔ جھاڑیوں اور درختوں کے ایک قلعے میں محصور تھے اور اس محدود ماحول میں قطری طور پر آوارہ نگاہیں ٹکرا ٹکرا کر واپس آ جاتی تھیں۔ جمّا میاں بڑی غائر نگاہ سے نزاکت کے رونگٹے رونگٹے کا جائزہ لے رہے تھے، جیسے ایک ماہر نفسیات و قیافہ شناس کسی کے خد و خال و جذبات پڑھ رہا ہو۔ میں نے غور کیا کہ آہستہ آہستہ جمّا میاں پر کچھ بدلتی ہوئی اضطراری کیفیات طاری ہو رہی ہیں۔ ایک دو مرتبہ انھوں نے اشارے سے ہماری توجّہ نزاکت کی جانب دلائی تو ہم کچھ نہیں سمجھے۔ اس کے سوا کہ کچھ غیر معمولی بے چینی سی ہے، جسے ہم یہ سمجھے تھے کہ یہ صبح نکل آنے کے سبب ہے۔ شاید بھوکی ہے یا ٹھکانے پہنچ کر آرام کی خواہش مند ہے لیکن چند منٹ بعد وہ سرک کر میرے پہلو میں آ بیٹھے اور بالکل نزاکت ہی پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ پھر اُس کی حرکات و سکنات سے انھوں نے اندازہ کر کے ایک مخصوص سمت بار بار نگاہ اٹھائی اور مجھے ابرو کے اشارے سے کچھ بتلانے کی کوشش کی جسے میں قطعاً نہیں سمجھا لیکن اور زیادہ سنجیدہ ہو کر سنبھل گیا۔

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی تابناک پیشانی نمودار ہوئی اور چند ساعت میں گول گول دمکتا ہوا دائرہ میرے داہنے ہاتھ پر ابھر آیا۔ آفتاب نکلا اور چاروں طرف زندگی، زندگی ہی زندگی ناچنے لگی، زندگی کے اس رقص میں ہم سب چونک پڑے۔ میرے بائیں ہاتھ پر بڑی دور سے کچھ آوازیں سی بلند ہوئیں اور چند ہی ساعت میں یہ آواز واضح ہو گئی، شناخوں، جھاڑیوں کے اندر اور سوکھی پتیوں کے اوپر ہاتھی کے چلنے کی مخصوص آواز۔ ہاتھی حرکت میں ہے۔ ہم سب بھرپور بن گئے اور دم بخود ہو کر ایسے جامد ہو گئے جیسے انھی چٹانوں میں کے پتھر ہیں۔ نزاکت اور زیادہ بے چین ہو گئی وہ آہستہ آہستہ سریلی آواز نکالنے لگی۔

آواز کے ساتھ سمت کا تعیّن تو کر لیا لیکن قطعی طور پر یہ سمجھ میں نہیں

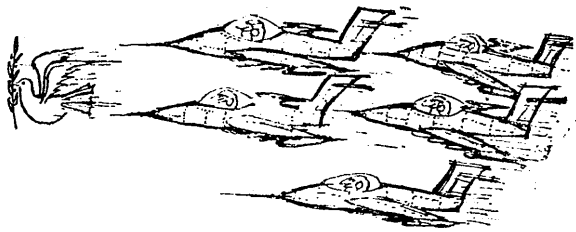

سکتا تھا کہ کس سے ہاتھ پر نمودار ہوگا۔ اس لیے کہ آواز ہر چند قدم کے بعد تھوڑا تھوڑا رُخ بدل رہی تھی اور ہر شکاری کے سامنے اُس کی سائڈ پر نمودار ہونے کا امکان تھا۔ اب تک تو جمّا میاں کے سامنے نزاکت جیسے ہوائی جہاز کا رڈار بنی ہوئی تھی اور وہ اس کی حرکات سے طوفان کی سمت کا تعیّن کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب نگاہیں آواز کی سمت لگی ہوئی تھیں اور بڑی دقیقہ رسی کے ساتھ اس مخصوص پوائنٹ کا تعیّن کرنے کی کوشش کر رہی تھی، جہاں ہاتھی کے سامنے آنے کا یقینی امکان ہو سکتا تھا۔ ہمارے اس قلعے کی شاداب چار دیواری کہیں سے بھی سو گز سے زیادہ تھی اور کہیں کہیں ہم سے تیس چالیس ہی گز کا فاصلہ تھا۔ آوازیں زیادہ واضح ہو گئیں۔ ہاتھی بالکل قریب آگیا لیکن اب بھی چال کا رُخ قطعی طور پر متعیّن نہ ہو سکا۔ جمّا میاں نے مجھے ہشیار ہونے کا خاص طور پر اشارہ دیا اور کھسک کر بالکل میرے پہلو میں آ بیٹھے۔

جنگل منوّر ہو چکا تھا تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر بانس کی دو جھاڑیوں پر چڑھی ہوئی بن توری کی بیل درہم برہم ہوئی۔ ٹہنیاں بڑے زور سے چرچرائیں اور نیچے پڑے ہوئے سوکھے بانس پٹاخوں کی طرح چیخ اُٹھے اور بیلوں اور جھکی ہوئی شاخوں کے درمیان پہلے کالی کالی جھلک سی نظر آئی اور اکڑا سامنے بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ میری بڑی اچھی سائڈ پر تھا۔ وہ جیسے نشے میں جھومتا ہوا بڑے والہانہ انداز میں بڑھا۔ بچھڑی ہوئی محبوبہ سے نگاہیں چار ہوتے ہی اُس نے مخصوص پیار بھری آواز نکالی جس کا بڑے ناز کے ساتھ حلق سے قرنا سی بجا کر نزاکت نے جواب دیا۔ دونوں جانب پچھلی بے پایاں عیش کوشیوں اور عشق و محبّت کی بے حد و حساب فردوسیں محفل آرائیوں کی رنگین ابدی یادیں تڑپ اٹھیں۔ دونوں ہمہ تن شوق، دونوں مجسّم خوش آمدید بن گئے۔ جبر و شکیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نگاہیں ملیں، سانسیں ملیں اور دو بچھڑے ہوئے ایک دوسرے سے ملنے کے لیے دیوانہ وار بڑھے یہ تو ٹھٹھک کر رہ گئی اور وہ مصافحہ کے لیے سونڈ اٹھا کر لپکا۔ لبّیک اور خوش آمدید اور خوش آمدید و لبّیک کی پیار بھری آوازوں کے تبادلے سے جیسے جنگل میں ارغنوں بج اٹھے۔ وہ بڑھا، اُس نے آغوشِ محبّت وا کر دی۔ نشہ تند تر ہو گیا۔ نزاکت بندھے ہی بندھے جھومتے جھومتے رقص سا کرنے لگی اور اکڑا کی تند ہوائی چال جو میلوں سے محبوبہ کی زلفِ عنبریں کی خوشبو پر مست شرابی کی طرح چلا آرہا تھا بالکل ہی بہک گئی اور وہ اپنی حجلۂ عروسی کی بچھڑی ہوئی دلھن کو دیکھ کر دیوانہ سا ہو گیا۔ اُس نے بڑے پیار کے ساتھ پوری اونچائی تک سونڈ اٹھائی۔ ادھر سے نزاکت نے بڑے ناز کے انداز میں ایک اسٹائل کے ساتھ اپنی سونڈ بلند کی اور ابھی پانچ گز کے فاصلے سے اوپر ہی اوپر فضا میں پہلا مصافحہ ہونے والا تھا کہ اکڑا کے تقریباً پورے کھلے ہوئے منہ کے اندر پندرہ گز کے رینج سے میں نے ۴۰۰/۴۵۰ کی گولی غیب سے گھسیڑ دی دھماکے کے ساتھ نقشہ ایک دم پلٹا۔ عشق و رومان بہ یک ثانیہ قہر و غضب میں تبدیل ہو گیا۔ اکڑا ایسی نازک جگہ پر شدید چوٹ کھا کر توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اور جیسے منہ کے بل گرتے گرتے سنبھلا۔ کچھ اگلے پاؤں جھکے اور اس کے ساتھ سر اور کوتاہ گردن ذرا جھکی اور یہیں میں نے بڑا عجیب سا پوائنٹ پا کر عین سر اور گردن کے اتّصال پر دوسری گولی تقریباً اُس مقام پر جڑ دی، جہاں فیل بان بیٹھتا ہے۔ پھر بھی وہ کچھ سنبھل کر جہاں کا تہاں مڑ گیا لیکن مڑتے مڑتے ادھر جمّا میاں نے کہا۔ "واہ بیٹا! بہت اچھے، ایک لور اور اُن کے ہاتھ کا ،، ۵۔ بور کمشینی انداز سے میری گرفت میں آگیا۔ ہاتھی کے شکار کا بہترین پوائنٹ زد پر تھا۔ تیسری شست میں نے کان کے پیچھے جوف میں گردن اور بالائی جبڑے کے جوڑ پر لے کر لبلبی دبا دی۔ خیر وہ گھوم تو گیا لیکن گھوم کر اسی چکر میں اڑا اڑا دھڑام پہاڑ کا پہاڑ ڈھے کر جا پڑا۔ گرتے گرتے میں نے بائیں نال والی گولی بھی چپکا دی اور ایک آن میں عشق و رومان کی یہ داستان ختم ہو گئی۔